نمبر ۱۸۹۲
رجسٹرڈ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۲۰
بابت ماہ جنوری ۱۹۳۴ع
نمبر ۱
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
A.H.Faruqi
1927.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۲۰	بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

عقیدۂ اعجاز قرآن کی تاریخ

۱۔ دعوے کی ابتدا | قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ہذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضہم لبعض ظہیراً (۱۷۔ ۹۰)

اس آیت میں صاف صاف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن کا مثیل کلام جن و انس کے بس سے باہر ہے۔ ہمارا مقصد بیان یہ دکھانا ہے کہ یہ دعویٰ کن حالات کے ماتحت کیا گیا اور کس طرح یہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ بن گیا۔ اس بحث کو شروع کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہم اس ماحول کا مطالعہ کریں جس میں قرآن نازل ہوا، ان ادبی اسالیب کو دریافت کریں جو اس وقت رائج تھے اور جہاں تک ممکن ہو یہ تحقیق کریں کہ قرآن کا استقبال شروع شروع میں کس طرح کیا گیا۔

زمانۂ قبل اسلام کے عربی ادب کا مطالعہ کرنے والے کی نظر سب سے پہلے اس امر پر پڑتی ہے کہ عرب میں فن کتابت تقریباً معدوم تھا[1]۔ اس حقیقت کا اثر ان کے اسالیب بیان پر بہت گہرا پڑا۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ کسی جماعت کے ادبی خصائص کی بنیاد بڑی حد تک اظہار خیال کے اس طریقے پر ہوتی ہے جو ایک خاص زمانے میں اس جماعت کو میسر آتا ہے۔ عرب لکھنا نہ جانتے تھے اس لئے ان کے خیالات کو لامحالہ زبانی الفاظ کا جامہ پہننا پڑا۔ اس کا اثر خود زبان کی ساخت اور ارتقا پر بھی بہت زیادہ ہوا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عربی زبان ظہور اسلام سے قبل سادہ اور پرزور تھی، مرادفات اور ترہیب و ترغیب کے الفاظ سے مالامال تھی۔ جذبات انسانی کے اظہار کی صلاحیت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی لیکن ایک مسلسل و مربوط خیال کی ترجمانی اس کے لئے دشوار بلکہ تقریباً ناممکن سی تھی۔ کبھی کبھی منتشر، بے ربط اور پریشان بھی ہو جاتی تھی لیکن تزک و احتشام اور دل آویزی میں کمی نہ ہوئی

---

[1] گولڈ سیہر نے اپنی کتاب Muhammedanische Studien (جلد اول صفحہ ۱۱۰) میں اس مسئلے سے بحث کی ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس ریگستانی ہوا کے مانند جس میں اس نے پرورش پائی تھی وہ بھی صاف اور خالص رہی۔ عربی زبان کے ارتقائی منازل کی تعیین اس وقت ہمارا مقصد نہیں ہے بلکہ ہمیں تو صرف ان اسالیب بیان سے بحث ہے جو ظہور قرآن کے زمانے میں رائج تھے۔

بلاشبہ سب سے اہم اسلوب شعر تھا جو اس زمانے میں بہت ترقی پر تھا اور یہ اسی سے ظاہر ہے کہ عصر جدید میں بھی زمانہ قبل اسلام کو عربی شاعری کا زریں عہد کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں شاعر کی ہر جگہ عزت کی جاتی تھی اور اس کی خوشنودی کی اتنی ہی کوشش کی جاتی تھی جتنا اس کی ناراضی کا خوف ہوتا تھا۔ کسی فرد یا قبیلے کے لئے یہ انتہائی فخر کا باعث ہوتا تھا کہ ایک مشہور شاعر اس کی مدح کرے اور اسی طرح ایک نامی شاعر کی ہجو کسی کو ہمیشہ کے لئے بدنام کر دینے کو کافی ہوتی تھی۔ ہر قبیلے کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کا اپنا شاعر ہو اور جس روز کسی قبیلے میں شاعر پیدا ہوتا تھا وہ اس کے لئے عید کا دن ہوتا تھا۔ عام طور پر اس زمانے میں شاعری قصیدے کے لباس میں جلوہ افروز ہوتی تھی۔ قصائد طول میں تو ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہوتے تھے لیکن مضامین کے لحاظ سے ان میں بہت کم تنوع ہوتا تھا۔ دس مشہور ترین قصائد ہم تک کم و بیش اپنی اصلی حالت میں پہنچے ہیں[۱]۔

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:۔

۱۔ ابوالفرج الاصفہانی: کتاب الأغانی۔ بولاق ۱۲۸۵ھ

۲۔ ابن قتیبہ: کتاب الشعر والشعراء۔ لائڈن ۱۹۰۲ء و مصر ۱۹۱۴ء

۳۔ عبدالقاہر البغدادی: خزانۃ الادب: بولاق ۱۲۹۹ھ

۴۔ C. J. Lyall, Translations of ancient Arabian Poetry (Introduction) London 1885, 2nd Edition 1930.

۵۔ , Introduction to the Mufaddaliyat, Oxford 1918.

۶۔ , A commentary of ten ancient Arabian

ظہورِ قرآن سے قبل عرب میں نثر کا وجود گویا تھا ہی نہیں۔ اس کی توجیہہ دشوار نہیں نثر فنِ کتابت کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں نثر کی جگہ جس اسلوب نے لی تھی وہ خُطَب تھے۔ عربوں کی عادت تھی کہ ذرا ذرا سی بات پر خطبے دینے لگتے تھے۔ ان خطبوں کی زبان مسجع ہوتی تھی۔ شعر اور سجع کی سرحدیں ملتی ہیں اور صورت میں صرف یہی بڑا فرق ہے کہ سجع میں بحر اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی اور قافیے کی پابندی میں اتنا تشدد نہیں ہوتا جتنا شعر میں۔ زمانۂ قبل اسلام کے بہت کم خطبے ہم تک پہنچے ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ ان کے مضامین اور ان کی صورت کے اندازے کے لئے کافی ہیں[۱]۔

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ)

poems, calcutta 1894.

۷۔ Th. Noeldeke – Beiträge zur Kenntnis der Poesie der alten Araber, Hannover 1864.

۸۔ R.A. Nicholson – A literary history of the Arabs (Introduction and chapter III) 3rd Edition London 1930.

۹۔ Rescher – Abriss der arabischen Literaturgeschichte Bd. I S. 12-95, Stuttgart, 1925.

۱۰۔ C. Brockelmann – Gesch. d. arab. Literatur Bd. I S. 12-32, Weimar 1898.

[۱] ۱۔ الجاحظ: البیان والتبیین۔ مصر ۱۳۱۳ھ

۲۔ المبرد۔ الکامل۔ لائپزگ ۱۸۶۴ء و مصر ۱۳۰۸ھ

۳۔ ابن عبد ربہ۔ العقد الفرید۔ مصر ۱۳۱۳ھ

۴۔ Goldziher – Der chatib bei den Arabern W.Z.K.M. VI 92-102

ایک دوسرا اسلوب جس میں سجع کا اصلی رنگ نمایاں ہوتا ہے کاہنوں کے اقوال ہیں۔ کاہن اپنی فطرت اور اپنے مقصد سے مجبور تھا کہ مبہم زبان استعمال کرے۔ سجع اس کا موزوں ترین آلہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گٹھے ہوئے جملے جو پڑھنے یا سننے میں شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتے ہیں لیکن یا تو مہمل ہیں یا ایک سے زیادہ مطالب کے حامل۔ یہ ہے ان تھوڑے سے اقوال کی کیفیت جو کاہنوں کے نام سے ہم تک پہنچے ہیں[1]۔

یہی گویا وہ اسالیب بیان تھے جن میں قبل اسلام عربوں کی ادبی کاوشیں محدود تھیں۔ عربوں کی کوئی مستقل قیام گاہ نہ تھی۔ وہ اپنے مویشی کے لئے چارے اور اہل و عیال کے لئے غنیمت کی تلاش میں خانہ بدوش پھرا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادب کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ صرف چند جماعتیں مقیم تھیں جن میں سے سب سے زیادہ اہم وہ جماعت تھی جو عرب کے مقدس شہر مکہ کے ارد گرد آباد تھی۔ مکہ کاروانوں کی اس شاہراہ پر واقع ہے جو جنوب و مشرق کو شمال و مغرب سے ملاتی ہے۔ یہاں ہر سال عربوں کا اجتماع ہوتا تھا جو ایک تو حج کے لئے آتے تھے اور دوسرے تجارت کے لئے۔ مکے سے متصل عکاظ میں ایک میلا لگتا تھا جہاں ملک کے ہر حصے سے شعرا اور خطیب جمع ہوتے تھے اور ہزاروں آدمیوں کے مجمعے میں اپنے اشعار سناتے یا خطبے دیتے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ادبی معیار قائم ہوتا تھا اور جہاں وہ نوجوان جنھیں نام و نمود کی خواہش ہوتی تھی مقابلے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہیں قرآن بھی نازل ہوا۔

قرآن ایک بالکل نئی چیز تھی۔ ظاہری صورت میں کہیں تو یہ خطبوں سے مشابہ تھا اور کہیں کاہنوں کے اقوال سے۔ یہ اکثر مسجع بھی تھا اور مقفیٰ بھی لیکن بایں ہمہ تمام موجودہ ادب سے کلیتاً مختلف تھا۔ یہ اس کیفیت کا اظہار تھا جو محمدؐ پر طاری ہوئی تھی۔ اہل مکہ نے اس کو سنا اور حیران رہ گئے۔ ان کے سامنے ایک انسان تھا جو ان کی روایات قدیمہ کی مخالفت کرتا تھا، ان کے دیوتاؤں اور دیویوں کو برا بھلا کہتا تھا۔ جو کہتا تھا کہ ان کی موجودہ زندگی معاصی کی زندگی ہے۔ جس کا دعویٰ تھا کہ خدا صرف ایک ہے اور خود وہ جو کسی طرح ان سے مختلف نہ تھا اس خدا کا رسول ہے۔ انھوں نے اس کے کلام کو جانچنے کی کوشش کی۔ کیا یہ شعر ہے؟ ہاں ممکن تو ہے لیکن یقینیا

---

[1] ملاحظہ ہو Encyclopadea of Islam (article Kahin)

نہیں۔ کیا یہ شخص کاہن ہے؟ بہت ممکن ہے مگر انوکھا کاہن ہے کہ بجائے مبہم الفاظ کے صاف اور صریح زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ ان کی حیرت بجائے کم ہونے کے بڑھتی ہی گئی۔ بھلا وہ ان الفاظ کو جو ان تک ایک معمولی انسان کی زبان سے ادا ہوکر پہنچتے تھے خدا کا کلام آسانی سے کیوں کر مان لیتے۔ گھبراہٹ میں انھوں نے کبھی تو جھوٹ اور فریب[1] کا الزام رکھا۔ کبھی کہا یہ شخص مجنون شاعر[2] ہے، کبھی اسے قصہ گو[3] بتلایا اور کبھی جادوگر[4] جو ان سے ان کے دیوتاؤں کو چھین لینا چاہتا ہے[5]۔ بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ خود بھی ایسا کلام پیش کرسکتے ہیں[6]۔

رسول نے یہ سب سنا۔ یہ تھا استقبال خدا کے اس کلام کا جو ان کو وحی ہوا تھا۔ اب اس آواز نے جو انھیں سنائی دیتی تھی یا اس فرشتے نے جو ان کے پاس خدا کا پیغام لاتا تھا حسب ذیل الفاظ کہے جن کو انھوں نے کھلے بند سنایا: " ام یقولون تقولہ، بل لا یومنون۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ ان کانوا صادقین[7]" (کہتے ہیں اس نے خود بنالیا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں رکھتے، اگر یہ سچے ہیں تو ایسا کلام پیش تو کریں) اس کے بعد" ام یقولون افتراہ قل فأتوا بعشر سور مثلہ مفتریٰت وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین[8]" (کہتے ہیں کہ اس نے بنالیا ہے، کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنالاؤ اور خدا کے سوا جس کو بلاسکتے ہو بلا بھی لو)۔ اس کے بعد" ام یقولون افتراہ قل فأتوا بسورۃ مثلہ وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین[9]" (کہتے ہیں اس نے بنالیا ہے، کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی ایک سورۃ بنالاؤ اور خدا کے سوا جس کو بلاسکتے ہو بلا بھی لو)۔ پھر وہ آواز ان لوگوں کو نبی کے ذریعے سے مخاطب کرکے کہتی ہے" وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔ وان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ، اعدت للکافرین[10]" (اور اگر تم کو اس میں جو ہم نے اپنے بندے

قرآن [1] ۸-۲۸-۶ [2] ۳۷-۳۵ [3] ۸-۳۱ [4] ۴۷-۲۴ [5] ۴-۳۴-۲۴ [6] ۸-۳۱ [7] ۲ ۵۲-۳۴
[8] ۱۱-۱۶ [9] ۱۰-۳۹ [10] ۲-۲۱ و ۲۲۔

پرنازل کیا ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورۃ تم بھی پیش کرو اور خدا کے سوا جو تمھارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو۔ لیکن اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہیں کرسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔)

یہ تھی مقابلے کی دعوت ان لوگوں کو جو شک کرتے تھے یا سمجھتے تھے کہ قرآن انسان کا کلام ہے۔ یا تو انھوں نے کوشش کی اور ناکام رہے یا سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔ بہرحال وہ کوئی چیز مقابلے کی پیش نہ کرسکے اور کر بھی کیسے سکتے تھے جبتک ان پر بھی وہی کیفیت نہ طاری ہوتی جو محمدؐ پر طاری تھی۔ اب اس آواز نے پکار کر کہا: "قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا"[۵] (کہہ دو کہ اگر انس وجن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لاسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ کریں)۔ یہ کھلا ہوا دعویٰ ہے اور اس سے زیادہ صاف دعویٰ ہو بھی نہیں سکتا۔[۶]

قرآن میں اس کا کوئی کھلا ثبوت تو نہیں ملتا کہ کسی نے یہ دعوت قبول کرکے مقابلے میں کوئی چیز پیش کی یا نہیں لیکن اس حقیقت سے کہ دعوت مقابلہ کا لہجہ آہستہ آہستہ تیز ہوتا گیا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ کوئی قابل اعتنا کوشش نہیں ہوئی۔ ابتدا میں تو دعوت عام تھی یعنی یہ کہ ایسا کلام پیش کرو (بحدیث مثلہ) پھر دس سورتوں پر اکتفا کی گئی اور آخر میں تو بات ایک سورۃ پر آپڑی۔ پھر آخری دعوت کے ساتھ ساتھ یہ تیقن بھی ہے کہ یہ بالکل ناممکن ہے (ولن تفعلوا)۔ اگر واقعی کوئی اہم کوشش کی گئی ہوتی تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ تمام اعتراضات کی طرح اس کا ذکر بھی قرآن میں ضرور ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ بعض آدمیوں نے کوشش کی اور ناکام رہے اور چونکہ انھوں نے کھلے بند مقابلہ نہیں کیا اس لئے قرآن میں بھی اس کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ کسی نے مقابلے کی جرأت ہی نہیں کی

---

[۵] قرآن ۱۷-۹۰

[۶] ان آیات کی ترتیب نزول کسی سند کی بنا پر نہیں ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے یہ ترتیب قائم کی گئی ہے۔

اور جیسا آئندہ صفحات میں معلوم ہوگا یہی ایک دلیل قرآن کے معجز ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہت سی روایتیں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مشہور کفار اور مشرکین نے جب قرآن کو سنا تو ان پر جادو کا سا اثر ہوا۔[۵]

۲۔ عقیدے کی نشو و نما | ایک معمولی خیال کو عقیدہ بننے تک ایک خاصی طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ خیال کی اس بالیدگی کے مراتب کی تحقیق اور ان اثرات کی تلاش جنھوں نے کسی عقیدے کو ایک خاص رنگ دیدیا ہو بہت دلچسپ کام ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت مشکل بھی ہے۔ یہ نمو اکثر غیر محسوس ہوتا ہے اور چونکہ خود معاصرین کو اس کا شعور نہیں ہوتا اس لئے بعد کے لوگوں کو قیاس آرائی کرنی پڑتی ہے۔ صرف ایک ہی صورت ممکن ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس زمانے کی تاریخ کا اس خاص مسئلے کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ کچھ ابھرے ہوئے خطوط نظر آتے ہیں یا نہیں۔

رسولؐ کے انتقال کے بعد فوراً ہی قرآن کی جمع و ترتیب کا کام شروع ہوگیا اور ایک مجموعہ تیار بھی ہوگیا تھا لیکن یہ کام خلیفہ ثالث عثمان کے عہد میں جا کر کہیں مکمل ہو سکا۔ اسی زمانے میں وہ بدامنی اور خانہ جنگی بھی شروع ہوگئی جس کا سلسلہ۔ چند وقفوں سے قطع نظر۔ ۷۳ھ تک جاری رہا یعنی اس وقت تک جبکہ عبدالملک بن مروان نے تمام مخالفتوں کو دبا کر اپنے بیٹے ولید کے لئے راستہ صاف نہ کر دیا۔ اس خانہ جنگی سے ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ لوگوں کو مسائل پر غور و خوض کی ضرورت محسوس ہوئی۔ علی اور معاویہ کی باہمی کشمکش۔ خوارج کا خروج۔ کربلا کا واقعہ۔ عبدالملک بن مروان اور عبداللہ بن زبیر کی لڑائیاں یہ سب محض نام و نمود یا حکومت اور غلبہ حاصل کرنے کی کوششیں نہیں تھیں بلکہ کم از کم ایک جانب سے تو یہ خلوص نیت اور ضمیر کی آواز کا نتیجہ تھیں۔ سوچنے اور سمجھنے والے لوگ اس فتنے میں بار بار قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے اور اسی کو دلیل راہ اور مشعل ہدایت بنا کر اپنے لئے راہ عمل تلاش کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کا مطالعہ جو یوں بھی دینداروں کا عام

---

[۵] ملاحظہ ہو: ابو نعیم۔ دلائل النبوۃ ص ۷۴۔۸۰۔ حیدرآباد ۱۳۲۰ھ

مشغلہ تھا اور زیادہ بڑھا لیکن ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ باقاعدہ تفاسیر کی تالیف شروع ہوتی یا قرآن کے اعتقادی مسائل کی تحقیق و ترتیب کی جاتی۔

ٹھیک اسی زمانے میں اسلام کا سابقہ ایک طرف تو مشرقی عیسائی کلیسا کے ان پیچ در پیچ عقائد سے پڑا جو مرکز خلافت یعنی دمشق و شام میں رائج تھے اور دوسری طرف کوفہ اور بصرہ کی نوآبادیوں میں زرتشتی اور مانوی خیالات سے مسلموں اور غیر مسلموں میں مبادلہ خیال شروع ہوا اور مذہبی بحثوں نے رواج پکڑا۔ غیر مسلموں نے اسلام کی بنیاد یعنی محمدؐ کی رسالت سے انکار کیا۔ اب مسلموں کو اپنے عقائد کے ثبوت میں دلیلیں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے علاوہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں فلسفے اور علوم طبیعی کی کتابوں کے تراجم یونانی، سریانی اور پہلوی سے عربی میں ہونے لگے۔ ان حالات کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ آزاد خیالی کی ایک رو عالم اسلامی میں دوڑ گئی اور ابن المقفع، بشار بن برد، صالح بن عبد القدوس اور عبد الحمید کاتب جیسے لوگ پیدا ہو کر زندیق کہلائے[1]۔ راسخ العقیدہ لوگوں کو نہ صرف غیر مسلموں سے مقابلہ کرنا پڑا بلکہ آزاد خیالوں سے بھی۔ یہ صورت حال قرآن کے مطالعے کی زبردست محرک ہوئی اس لئے کہ مسلمان قرآن ہی کو سرچشمۂ دین و دنیا سمجھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اموی حکومت ختم ہوئی اور عباسی راج شروع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ مرکز خلافت بھی شام سے عراق کو منتقل ہو گیا۔

اب وہ وقت آگیا تھا کہ عقائد کی باقاعدہ ترتیب شروع ہوتی اور مختلف مذاہب کلامی اور فقہی کی داغ بیل پڑتی۔ چنانچہ معتزلہ کا ظہور ہوتا ہے اور انھیں کے سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے مسئلہ اعجاز قرآن کا ذکر ملتا ہے۔ اس مسئلے سے غالباً پہلے پہل دوسری صدی ہجری کے وسط میں مرتب طور پر بحث کی گئی ہوگی۔

---

[1] لفظ زندیق کیلئے ملاحظہ ہو: 1. H. H. Schaeder, Iranische Beiträge I pp. 274 ff (1930)

2. A. Siddiqi, The letter ق and its importance in persian loan words in Arabic.

Proceedings of the 4th Indian Oriental Conference pp. 228-231.

قیاس یہ ہے کہ کم از کم تین راستوں سے لوگ اس مسئلے تک پہنچے ہونگے۔ ایک تو تفسیر کا سیدھا راستہ۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ دعویٰ صاف صاف اور کئی جگہ موجود ہے اس لئے ہر مفسر کو اس سے بحث کرنی ضروری تھی۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ہی متشککین کو مقابلے کی دعوت دی گئی ہے اور عام طور پر اسی مقام پر مفسرین اس مسئلے سے بحث کرتے ہیں۔

دوسرے دونوں راستے کلام کی شاہ راہ سے نکلتے ہیں۔ ان میں ایک تو پگڈنڈی سے زیادہ نہیں۔ اسے ان راہ نوردوں نے طے کیا ہوگا جو مسئلہ خلق قرآن کی پر پیچ گھاٹیوں میں چکر لگانے کے عادی تھے۔ اس طویل بحث کے ساتھ ساتھ کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق لازمی طور پر اس کے اعجاز کا مسئلہ بھی چھڑ گیا ہوگا اور ہمارے پاس اس کا ثبوت بھی ہے کہ ایسا ضرور ہوا۔

تیسرا راستہ جو ایک عام راستہ ہے اور جس پر چل کر بیشتر وہ مصنفین جن کا ہمیں ذکر کرنا ہے اس منزل تک پہنچے ہیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کلام کی عمارت کے دو نمایاں حصے ہیں جن پر ہر گذرنے والے کی نظریں پڑتی ہیں۔ ایک الٰہیات اور دوسرا نبوّات۔ پہلے حصے میں تو ایک چھوٹا سا گوشہ اس مسئلے کو دیا گیا ہے مگر دوسرا حصہ نہ صرف یہ کہ اسی مسئلے کے لئے وقف ہے بلکہ بلا مبالغہ اس کی بنیادیں بھی اسی مسئلے پر ہیں۔

الٰہیات کے تحت خدا کی ذات اور صفات سے بحث کرنے کے بعد متکلم مسئلہ نبوت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ پہلے تو وہ نوع انسان کے لئے نبی کی ضرورت ثابت کرتا ہے، پھر امکان بعثت سے بحث کرتا ہے، اس کے بعد کسی نبی کی صداقت کا معیار معین کرتا ہے اور آخر میں فرداً فرداً انبیا کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں ابتدا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سے ہوتی ہے اور انتہا محمدؐ پر۔ وہ طے کر چکا ہے کہ نبی کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ معجزہ دکھلائے۔ اب کہ وہ محمدؐ کی نبوت کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے اسے ان کے معجزوں کی تلاش ہوتی ہے۔ سب سے پہلے وہ قرآن کو ہاتھ میں لیتا ہے اور یہاں اسے اتنا کافی مسالہ مل جاتا ہے کہ آگے جانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ قرآن کا خود یہ دعویٰ ہے کہ اس کا جواب پیش کرنا تمام مخلوق خدا کے لئے ناممکن ہے اس لئے کہ وہ خود خدا کا کلام ہے۔ اب اس سے بڑا معجزہ کون سا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اسے ایک حدیث بھی مل جاتی ہے: وما من الانبیاء نبیٌ إلّا أعطیٰ من الآیات ما مثله أومن او آمن علیه البشر وانما کان الذی اوتیته وحیا

اوحاہ اللہ الیّ فأرجوانیّ اکثرھم تابعاًیوم القیامۃ (کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۔ صحیح بخاری)
کوئی نبی نہیں جسے کوئی نشانی نہ عطا کی گئی ہو کہ لوگ اس پر ایمان لائیں ۔ مجھے جو چیز دی گئی ہے وہ اللہ کی وحی ہے
اور میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیرو سب سے زیادہ ہونگے ۔ یہ مسئلہ اب حل ہو جاتا ہے ۔ قرآن ہی
محمدؐ کا معجزہ ہے اور پھر کیسا معجزہ ۔ ازلی اور ابدی ۔

ہم نے دیکھا کہ کس طرح یہ مختلف راستے مختلف قسم کے لوگوں کو ایک ہی منزل کی طرف لے آئے لیکن
ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ راستے متوازی ہیں بلکہ یہ ایک دوسرے کو بار بار کاٹتے ہیں جیسا کہ ہم بعد کو دیکھیں گے ۔
غالباً یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس موقعے پر سیدھا راستہ ہی سب سے دور کا راستہ ثابت ہوا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ
تفسیر کی راہ سے اس مسئلے تک پہنچے وہ سب سے بعد کو پہنچے ۔ پہلے متکلمین پہنچے اور ہم کہہ چکے ہیں کہ ان میں معتزلہ
پیش پیش تھے ۔ ان لوگوں کے لئے جو دین اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ حقیقت بہت ہی جانکاہ ہے
کہ معتزلہ جیسے غیر معمولی ذہین متکلمین کی تصانیف کا عشر عشیر بھی اب دستیاب نہیں ہوتا ۔ ان کے عقاید اور خیالات کا
جو تھوڑا بہت ذکر سننے میں آتا ہے وہ ان لوگوں کی زبانی جو کھلے بندوں ان کے مخالف تھے مثلاً اشعری[1]، بغدادی[2]،
ابن حزم[3] اور شہرستانی[4] ۔

اس مسئلے پر خصوصاً ان کی رائیں اس قدر اختصار کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں کہ دلائل تو درکنار ان کا
مفہوم بھی مشکل سے سمجھ میں آتا ہے ۔ اس سلسلے میں جو نام خاص طور پر لئے جاتے ہیں وہ نظّام[5]، ہشام[6]، عباد[7]،
اور مزدار[8] کے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ ان کو جمہور مسلمین کی رائے سے قدرے اختلاف تھا[9] ۔ باقی معتزلہ غالباً وہی
رائے رکھتے تھے جو عام مسلمین ۔ ان میں سے اس مسئلے پر صرف جاحظ کی ایک کتاب مذکور ہے جس کا نام نظم القرآن[10]
تھا ۔ افسوس کہ یہ کتاب اب کہیں نہیں ملتی ۔

اب ہمیں ایک بہت ہی اہم کتاب کا ذکر کرنا ہے جس کو صحیح طور پر " اسلام کا نیم سرکاری بیان[12] " کہا گیا ہے ۔
کتاب کا نام " کتاب الدین والدولۃ فی اثبات النبوۃ[11] " ہے اور مصنف اس کا علی بن ربّن الطبری

---

[1] مقالات الاسلامیین ۔ استانبول ۱۹۳۰ء [2] الفرق بین الفرق ۔ مصر ۱۳۲۸ھ (بقیہ نوٹ صفحہ آئندہ پر دیکھئے)

جو عباسی خلیفہ متوکل (۲۳۲ - ۲۴۷ھ) کا مولیٰ تھا۔ مصنف نے دیباچے میں ذکر کیا ہے کہ خود خلیفہ نے اس کتاب کی تالیف میں اس کی مدد کی تھی۔ کتاب کا مقصد جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے محمدؐ کی نبوت کو ثابت کرنا ہے چھٹے باب کا عنوان ہے "الباب السادس فی اُمیّۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وانّ الکتاب الّذی انزلہ اللہ علیہ وانطقہ بہ اٰیۃٌ للنّبوۃ" (نبی کے امی ہونے کے ذکر میں اور اس بیان میں کہ جو کتاب اللہ نے ان پر نازل کی اور ان سے پڑھوائی وہ نبوت کی نشانی ہے) مصنف کا طرز تحریر اور کتاب کے دلائل اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس وقت تک یہ مسئلہ علم کلام کے بڑے نظام کا ایک جزو نہیں بنا تھا اور نہ اسے وہ رسمی حیثیت حاصل ہوئی تھی جو بعد کو ہوئی۔ وہ تمام مسائل جن کی قسمت میں ایک طویل سلسلے کی کڑیاں بننا تھا

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ)

[3] کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل۔ مصر ۱۸۹۹-۱۹۰۳ء [4] کتاب الملل والنحل لندن ۱۸۴۶ء [illegible] ابراہیم بن سیّار م ۸۴۵ء [6] الفوطی م ۸۴۰ء (۷) ابن سلیمان الدمیری م ۸۴۰ء یا ۸۶۶ء [8] عیسیٰ بن صبیح م ۸۵۰ء یا ۸۴۰ء [9] ملاحظہ ہو مقالات ج ۱ ص ۲۵ و ۲۶ اور ملل ص ۴۸ [10] ملاحظہ ہو فہرست ص ۲۸ [11] مرتبہ منگانا۔ مصر ۱۹۲۳ء۔

حالات زندگی کے لئے ملاحظہ ہو: Z. D. M. G (neue Folge) Bd. 10, Heft 1/2, S. 38-68

کتاب کے اصلی ہونے کی بحث کے لئے:
1. Mingana: 'Remarks on Tabari's semi official defence of Islam' reprinted from 'the Bulletin of the John Ryland Library' Vol. 9, no 1, 1925
2. D. S. Margolliouth: 'On the book of Religion and Empire' reprinted from the proceedings of the British Academy Vol. XVI, London 1930. Compare also the Bibliography on page 9 ff.
3. Bouyges in M. F. O. B. X; 242 ff.

ابھی تک اپنی انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے کبھی کبھی ایک ساتھ بھی بحث کی جاتی تھی مگر بیشتر علیحدہ علیحدہ۔ انہی میں سے ایک یہ ہمارا مسئلہ بھی تھا۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئیں ہیں بس ان کے نام ہی ہاتھ آتے ہیں۔ اس عہد کی صرف ایک نمایندہ تفسیر جو غالباً بہترین تفسیر ہے موجود ہے اور وہ ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) کی ضخیم تصنیف ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کی تیسوں جلدیں دستیاب ہو سکتی ہیں[1]۔ یہ تفسیر اس لئے اور بھی زیادہ قیمتی ہے کہ یہ گویا مجموعہ ہے ان تمام معلومات کا جو اس عہد میں قرآن سے متعلق لوگوں کو تھے اور اس نے بعد کے مفسرین کے لئے ماخذ اور نمونے کا کام دیا ہے۔ اس میں اعجاز قرآن کی بحث سورۂ بقرہ کی آیات نمبر۲۱ و ۲۲ کی تفسیر کے سلسلے میں آتی ہے۔ یہ بحث بالکل سیدھی سادی ہے اور متاخرین کی طرح علم کلام کی اصطلاحوں سے بھری نہیں ہے۔ اس میں وہی دلائل پیش کئے گئے ہیں جو خود قرآن میں موجود ہیں اور صرف تفسیر و تشریح پر قناعت کی گئی ہے۔

قدیم تفاسیر میں سے دوسری کتاب جو ملتی ہے وہ حسن بن محمد قمی نیشاپوری (م ۴۰۶ھ) کی ہے[2]۔ اس میں بھی اس مسئلے سے بحث اسی مقام پر کی گئی ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ تین چوتھائی صدی میں کتنا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ قمی کا طرز مفسرین کا نہیں بلکہ متکلمین کا ہے اور وہ تمام تر انھی کی اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنے حدود سے باہر نکل جاتا ہے اور دوسرے حلقہ ہائے فکر سے دلائل مستعار لاتا ہے۔ بعد کے مفسرین نے طبری سے زیادہ قمی کی تقلید کی ہے۔ یہ پیوند تفسیر میں بالکل نہیں کھپتا اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ پودا کسی دوسری آب و ہوا میں پھلا پھولا ہے۔ مگر ابھی کیا یہ تو ایک طویل داستان کی محض ابتدا تھی۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا خانۂ تفسیر پر متکلمین کا قبضہ بھی بڑھتا گیا اور بجائے توضیح و تشریح کی سادگی کے عقائد و کلام کی پیچیدگی رونما ہوتی گئی۔ ہر فرقہ اپنے مخصوص عقائد کو قرآن کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے سیدھے سادے الفاظ کو طرح طرح کے معنی پہنائے جانے لگے۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ یونانی فلسفے کے تصورات

---

[1] مطبوعہ مصر ۱۳۲۱ھ [2] تفسیر طبری کے حاشیے پر چھپی ہوئی ہے۔

سے قرآنی آیات کی مطابقت ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔

ان چند الفاظ سے غالباً کچھ تھوڑا سا اندازہ اس کا ہوا ہوگا کہ اس عقیدے کی نشو و نما کیوں کر ہوئی۔ اب ہمیں ان تصانیف کا مطالعہ کرنا چاہئے جو اس موضوع پر دستیاب ہوتی ہیں اس لئے کہ بغیر اس کے اس مسئلے سے باقاعدہ بحث نہیں شروع ہو سکتی۔ اس تمام مجموعے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک تو اس قسم کی تصانیف ہیں جن میں صرف اسی موضوع سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے وہ جن میں کسی دوسری نظام کے تحت یہ بحث آئی ہے دوسرے نظاموں میں سب سے اہم معانی و بیان ہے۔ یہ تصانیف ہمارے موضوع کی خصوصی کتابیں بھی کہی جا سکتی ہیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے لیکن بعض اہم وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر بعد میں آئے گا ان سے علیحدہ بحث کرنا چاہئے۔ دوسرے دو نظام تفسیر اور کلام کے ہیں جن کی نشو و نما کا ایک خاکہ ہم کھینچ چکے ہیں۔

۲۔ خصوصی کتابیں | اعجاز القرآن کے نام سے جن لوگوں نے کتابیں یا رسائل لکھے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے صرف پہلے دو نام ابن ندیم کی فہرست میں جو ۳۷۷ھ میں مکمل ہو چکی تھی ملتے ہیں اس لئے یہ کہنا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ اس وقت ان کے علاوہ اور کوئی کتاب اس نام کی مشہور نہ تھی۔

۱۔ محمد[1] بن زید (یزید؟) الواسطی (متوفی ۳۰۶ھ)۔
۲۔ علی[2] بن عیسیٰ الرمانی (م ۳۸۴ھ) ۳۔ حمد[3] بن محمد الخطابی (م ۳۸۸ھ)
۴۔ ابو بکر[4] محمد الباقلانی (م ۴۰۳ھ)

---

[1] فہرست ص ۳۸۔ نایاب ہے [2] فہرست ص ۶۴ و ۷۲۔ ایک نسخہ وہبی آفندی کے کتبخانے استامبول، میں موجود ہے۔ میں نے ایک نقل حاصل کی ہے اور امید ہے کہ جلد اسے شائع کر سکوں گا۔ [3] لائڈن میں موجود ہے ملاحظہ ہو فہرست کتبخانہ ج ۴ ص ۱۰۷۔ اس کی نقل بھی میرے پاس ہے اور شائع کرنے کا قصد رکھتا ہوں۔
[4] کئی بار طبع ہو چکی ہے۔ آخری بار ۱۹۳۰ء میں۔

۵۔ محمد بن یحییٰ ابن سراقہ (م ۴۱۰ھ)[۵]
۶۔ السید الشریف المرتضیٰ (م ۴۳۶ھ)[۶]
۷۔ عبدالواحد بن اسمٰعیل الرّویانی (م ۵۰۲ھ)[۷]
۸۔ ابن باجوک البقالی (م ۵۶۲ھ یا ۵۷۶ھ)[۸]
۹۔ قاسم بن فِیرُّہ[۹ا] الشاطبی (م ۵۹۰ھ)[۹]
۱۰۔ نصیر بن عبدالسیّد المطرزی (م ۶۱۰ھ)[۱۰]
۱۱۔ ابن کمال پاشا (م ۹۴۰ھ)[۱۱]
۱۲۔ ابراہیم بن احمد الجزری (م ؟)[۱۲]
۱۳۔ محسن بن حسین النیسابوری الخزاعی (م ؟)[۱۳]

باقلانی کی کتاب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اس موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ یہ ایک مشہور متکلم اور امام اشعری کے سخت مقلد تھے۔ ان کے استاد ابوالعباس بن مجاہد الطائی امام اشعری کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ باقلانی کی بے شمار تصانیف میں سے بس یہی ایک دستیاب ہوتی ہے لیکن یہ ایک بھی ان کے علم وفضل کے اندازے کے لئے کافی ہے۔

اپنی تصانیف کے دیباچے میں باقلانی ان اسباب کا جو اس تصنیف کا باعث ہوئے اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

"جس پر سے پردہ ہٹانا خدا کے دین والوں کے لئے سب سے زیادہ اہم اور جس سے بحث کرنا الزم ہے وہ (یعنی قرآن) ان کے دین کی جڑ بنیاد، توحید کا ستون، ان کے نبی کی دلیل اور اس کے معجزے کا ثبوت ہے خصوصاً ایسی حالت

۵تا۷ ملاحظہ ہو کشف الظنون: اعجاز۔ تینوں نایاب ہیں۔ ۸و۱۱و۱۲ ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربی برلن ج ۱ ص ۲۸۸ و ۲۸۹۔ صرف نمبر ۱۱ موجود ہے (برلن 819 .Mq.) ۹و۱۰ ملاحظہ ہو رسالہ معارف ج ۱۸ نمبر ۵ ص ۳۳۱۔ دونوں مدینہ کے ایک کتبخانہ میں موجود ہیں ۱۳ ملاحظہ ہو کشف الحُجب عن اسماء الکتب کلکتہ ۱۹۱۲ء ص ۵۲۔ کتاب نایاب ہے۔

۹ا معارف میں نام فیرہ چھپا ہے۔ ارشادالاریب (ج ۶ ص ۱۸۴) میں فیرۃ ہے۔ بروکلمان (ج ۱ ص ۴۰۹)، فیّرہ لکھتا ہے اور اپنا قیاس یہ بتاتا ہے کہ یہ ایک قدیم ہسپانوی نام ہے۔

میں کہ جہل کا خیمہ وسیع اور اس کا بازار گرم ہے اور وہ تمام دنیا میں چھایا ہوا ہے اور علم مٹتا جاتا ہے، چھپتا جاتا ہے اور اہل علم زمانے کی جفاؤں کا شکار ہو رہے ہیں اور بے انتہا شدائد برداشت کر رہے ہیں یہاں تک کہ ان تکلیفوں کے مارے وہ نہ علم کا حق ادا ادا کر سکتے ہیں اور نہ اس کے راستے پر چل سکتے ہیں۔ آج کل لوگ دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ایک وہ جو حق سے دور اور ہدایت سے کنارہ کش ہے اور دوسری وہ جو اپنے کام کاج میں پریشان اور حق کی حمایت سے مجبور رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ملحد اصول دین کی چھان بین کرتے ہیں اور ضعیف ایمان والوں کو شک اور شبہے میں ڈال رہے ہیں۔ دین اب بے یار و مددگار ہے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ ہر اس شخص کے لئے ہدف بنا ہوا ہے جو اس پر نشانہ لگانا چاہے۔ اب بالکل وہی کیفیت ہے جو ابتدا میں قرآن کے ظہور کے وقت تھی۔ کوئی اسے جادو کہتا تھا، کوئی شعر، کوئی داستان پارینہ بتلاتا تھا اور کوئی کہتا تھا کہ اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا پیش کر سکتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے اور اقوال جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نقل کئے ہیں۔ ایک جاہل کے متعلق کسی نے مجھ سے یہ کہا کہ وہ قرآن کا مقابلہ بعض اشعار سے کرتا ہے اور اس پر بس نہیں کرتا بلکہ اشعار کو بہتر کہتا ہے۔ سو یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آج کل کے ملحد جو کچھ کہتے ہیں اس کا بیشتر حصہ وہی ہے جو ان کے بھائی قریش یا دوسرے قبائل کے ملحد اسی زمانے میں کہا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس زمانے کے بیشتر معترض بعد کو جب ان کی سمجھ میں بات آگئی تائب ہوئے اور ایمان لائے اور آجکل جہل غالب ہے اور ملحد ہدایت سے دور تر ہیں۔ ایسی حالت میں اہل ادب اور اہل کلام میں سے ان لوگوں کو جنھوں نے قرآن کے معانی اور فوائد پر مفید کتابیں لکھی ہیں یہ چاہئے تھا کہ اس مسئلے سے بھی تفصیلی بحث کرتے کہ قرآن کے معجز ہونے کے کیا وجوہ ہیں۔ یہ ان مسائل سے زیادہ ضروری تھا جن پر انھوں نے

کتابیں لکھ ڈالی ہیں مثلاً خبریا اَعراض یا بدیع اِعراب یا نحو کی باریکیاں کیونکہ اس کی
حاجت سخت تر ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا واجب تر۔ لوگوں نے تو اس باب میں
اتنی کوتاہی کی کہ ایک فرقہ براہمہ کا ہم خیال ہو گیا اور یہ سمجھنے لگا کہ جب لوگ اس معجزے
کی حمایت سے عاجز ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس کی حمایت ممکن ہی نہیں اور
اس معجزے کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب انھوں نے دیکھا
کہ ان لوگوں نے جدید مسائل میں تو حد درجہ لطافت اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے
اور اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ناقص اور تھذیب و ترتیب سے عاری ہے۔
بعض لوگ جو اس کوتاہی کے مجرم ہیں یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس مسئلے کی تحقیق اس
وقت کی جائے گی جب دوسرے زیادہ اہم اور دقیق مسائل حل ہو چکیں گے۔ یہ بات
زیادہ تفصیل کی محتاج ہے اور ہم آگے چل کر اسے پھر چھیڑیں گے۔ اس وقت معلوم
ہوگا کہ اس مسئلے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ جاحظ نے جو کتاب نظم القرآن لکھی ہے
اس میں ان متکلمین سے جو پہلے گزر چکے ہیں کچھ بھی زیادہ نہیں لکھا ہے اور نہ ان التباسات
کو واضح کیا ہے جو اس باب میں وارد ہوتے ہیں۔ مجھ سے ایک شخص نے یہ کہا کہ میں
ایک ایسی جامع کتاب اس مسئلے پر لکھوں جس سے جاہلوں کے تمام شکوک اور شبہات
رفع ہو جائیں اور اس معجزے کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے اس کا بھی رد ہو جائے میں
نے اس بات کو اللہ پر بھروسہ کر کے مان لیا۔ اب اس کے تقرب کی آرزو رکھتا ہوں
اور اس کی توفیق کا طالب ہوں۔"

اس دیباچے کو دیکھنے کے بعد تھوڑا سا اندازہ ہو سکتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اس
مسئلے کی کیا کیفیت تھی۔ تحریر کی اس مبالغہ آمیزی کو وضع کرنے کے بعد بھی جو ہر زمانے کے متکلموں کا خاص
رنگ ہے کم از کم اتنا ضرور باقی رہتا ہے کہ اس عہد میں مسئلہ اعجاز قرآن پر لوگوں کی توجہ کم تھی۔ جو کتابیں
اب تک لکھی گئی تھیں ان سے لوگ مطمئن نہیں تھے اور ایک جامع کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس

کی جارہی تھی۔ ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس کمی کو باقلانی نے باحسن وجوہ پورا کر دیا۔ اس کتاب نے بعد کے ان مصنفین کے لیے جنھوں نے اس مسئلے سے بحث کی ہے برابر ایک نمونے کا کام دیا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اس کا ایک مختصر خاکہ یہاں پر پیش کیا جائے۔

دوسرے متکلمین کی طرح باقلانی نے بھی اس دعوے سے ابتدا کی ہے کہ "قرآن ہی محمدؐ کا معجزہ ہے"۔ پہلے باب میں یہی بحث ہے۔ دوسرے باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن واقعی معجزہ ہے۔ تیسرے باب میں یہی بحث جاری ہے اور یہاں آکر تفصیل سے وہ تمام دلائل بیان کئے گئے ہیں جو اس دعوے کی موافقت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کا طرز ادا ایسا ہے کہ یہ کسی مخلوق کی فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اس موقعے پر باقلانی نے یہ دکھایا ہے کہ قرآن نہ تو شعر ہے اور نہ سجع۔ اگلے دو ابواب میں یہی بحث ہے۔ اب اس جگہ یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا قرآن کا اعجاز اس کے بدیع کے مطالعے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ باقلانی نے اس موقعے پر بدیع کے اقسام گنائے ہیں اور قرآن میں جو اقسام مستعمل ہیں ان کو بیان کر کے دوسرے کلام سے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ ایک طویل بحث کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس طرح قرآن کا اعجاز یقینی طور پر متعین نہیں ہو سکتا۔

تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تعین کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب دینے سے پہلے وہ یہ کہتا ہے کہ ان لوگوں کے لئے جن کی زبان عربی نہیں ہے یا اگر زبان عربی ہے تو اس کی باریکیوں سے واقف نہیں ہیں یہ فیصلہ خود کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھیں تو ان لوگوں کا دست نگر ہونا پڑے گا جنھیں کھرے کھوٹے کی تمیز ہو اور جو ادبی خوبیوں کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب وہ خود رسول کے بعض خطبوں اور خطوط کو نقل کر کے کہتا ہے کہ ان میں اور قرآن کے طرز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خود رسول بھی اس طرز کے مالک نہیں ہیں تو بجز اس کے اور کوئی صورت ممکن نہیں کہ اسے خدا کا کلام سمجھا جائے۔ اس کے بعد وہ اسی طرح صحابہ اور دوسرے مشہور جاہلی اور اسلامی خطیبوں کے کلام کو پیش کر کے یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ یہیں اس نے وہ چند جملے بھی نقل کئے ہیں جو مسیلمہ اور سجاح سے منقول ہیں اور ان کا اچھی طرح خاکہ اڑایا ہے۔ اب وہ شعراء کی طرف توجہ کرتا ہے۔ مقابلہ کرنے سے پہلے وہ یہ کلیہ پیش کرتا ہے کہ نظم میں طرز ادا کی وہ خوبیاں ہرگز نہیں پیدا

ہوسکتیں جو نثر میں ممکن ہیں اس لئے کہ نظم ردیف اور قافیے کی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس وجہ سے شعرا کے کلام کا کوئی مقابلہ قرآن سے ہو ہی نہیں ہو سکتا لیکن چونکہ بعض جاہل اس قسم کا مقابلہ کرتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی کمزوریوں کو واضح کیا جائے۔ وہ شاعروں کے سردار یعنی امرؤالقیس کا انتخاب کرتا ہے اور تفصیل سے اس کے اشعار کی خوبیوں اور خرابیوں سے بحث کرتا ہے۔ اب وہ قرآن کے طرز ادا کی چند خوبیاں بیان کرتا ہے اور فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دیتا ہے جو ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ بحث ابھی ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ اسلامی شعرا کے کلام کو بھی پیش کرتا ہے اس لئے کہ کچھ لوگ اس کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں حالانکہ کسی عربی شاعر کا امرؤالقیس سے بڑھ جانا اس کے خیال میں بہت مشکل ہے اور جب اسی کے شعر قرآن کے مقابلے میں نہ ٹھیر سکے تو دوسرے شعرا کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ باب بہت طویل ہے اور تقریباً نصف کتاب پر حاوی ہے۔

بعد کے صفحات میں باقلانی نے متفرق کم اہم مسائل سے بحث کی ہے مثلاً (۱) کیا قرآن کا اعجاز بدیہی ہے (۲) قرآن کا کتنا حصہ معجز ہے (۳) اعجاز کس چیز میں ہے (۴) تحدی سے کیا مراد ہے (۵) لفظ معجز کا صحیح مفہوم کیا ہے اور (۶) یہ کہنا کیوں صحیح نہیں کہ قرآن رسول کا کلام ہے۔ اب ایک باب اور باقی رہ جاتا ہے جو اگر اس بڑے باب کا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے ایک حصہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اس میں بلاغت کی تشریح کی گئی ہے اور قرآن سے اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں باقلانی نے بہت زوردار الفاظ میں ان مشکلات کا بیان کیا ہے جو ایک ایسے دشوار مسئلے سے بحث کرنے والے کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اس کی رائے ہے کہ قرآن کی تمام باریکیوں کو سمجھنا اور اس کی تمام خوبیوں کو بیان کرنا بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ باقلانی کی کیفیت نفسی کا اندازہ اس لطیفے سے ہو سکتا ہے جو اس نے اس موقعے پر بیان کیا ہے: ایک بدوی رات کو راستے سے بھٹک گیا تھا۔ دفعتاً چاند نکل آیا اور اس کی مدد سے اس نے اپنا راستہ پالیا۔ اب وہ چاند کو مخاطب کر کے کہتا ہے "میں تجھے کیا کہوں۔ کہوں کہ خدا تجھے بلند کرے تو وہ تو تجھے بلند کر ہی چکا ہے۔ کہوں کہ اللہ تجھے روشنی دے تو وہ تو تجھے روشنی دے ہی چکا ہے۔ کہوں کہ خدا تجھے جمال دے تو وہ تو تجھے جمیل بنا ہی چکا ہے۔"

بہت افسوس کی بات ہے کہ اس موضوع کی خصوصی کتابوں میں سے اکثر نایاب ہیں۔ شریف مرتضیٰ کی کتاب کا ضائع ہو جانا اس لئے اور زیادہ افسوسناک ہے کہ انھوں نے ایک غیر معمولی راہ اختیار کی تھی اور

اس نقطۂ نظر سے بحث کی تھی جو قدما میں غالباً صرف نظام کا تھا۔ ہمارے لئے یہ کتاب بہت دلچسپی کا باعث ہوئی۔ ان کے بعض دلائل دوسروں نے نقل کئے ہیں اور خوش قسمتی سے ایک ٹکڑا خود ان کا بھی اس مسئلے سے متعلق ملتا ہے۔ ان کے بہت سے خطوط جو انھوں نے دینی اور ادبی استفسارات کے جواب میں لکھے تھے محفوظ ہیں[۱۵]۔ ان میں سے دو خطوط اس مسئلے سے متعلق بھی ہیں۔

۴۔ دوسرے نظام کے تحت | (۱) معانی و بیان

یہ امر تو مسلم ہے کہ عربی معانی و بیان بہت کچھ قرآن پر مبنی ہے لیکن ابھی تک غالباً اس حیثیت کو واضح نہیں کیا گیا ہے کہ اس فن کی ترتیب اور تدوین کا باعث ہی اعجاز قرآن کا عقیدہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اور محرکات بھی تھے لیکن بہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محرک اول یہی عقیدہ تھا۔ قرآن کے اعجاز کی بحث میں سب سے اہم اور ابتدائی مسئلہ یہ تھا کہ محل اعجاز کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل شروع ہی میں دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک کہتا تھا کہ محلّ اعجاز قرآن کا نظم ہے اور دوسرے کو اس کے نظم میں کوئی خاص بات دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ فریق دوسرے دلائل پیش کرتا تھا لیکن بہت کم لوگ اس خیال کے تھے، زیادہ تر علما نظم ہی کو معجز قرار دیتے تھے۔ اب فطرتاً یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر مقابلے کا معیار کیا ہے؟ اس لئے لوگوں نے ادبی آثار کو جمع کرنا اور ان سے قرآن کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ یہی سبب تھا کہ جاحظ نے ایک کتاب نظم القرآن کے نام سے لکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ یہ واقعی نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ کتاب ضائع ہو گئی لیکن خود اس کا نام ہی اس کے موضوع کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔

یہ حقیقت بھی ابھی محتاج توضیح ہے کہ جاحظ ہی وہ شخص ہے جس کی ذات سے فن معانی و بیان کی ابتدا وابستہ ہے جس نے "البیان والتبیین" کا غور سے مطالعہ کیا ہے اسے اور کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس فن کے بانی عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۱ھ) تھے لیکن یہ بیان صحیح نہیں۔ اس میں کوئی

---

[۱۵] مخطوطہ برلن ۷۰/۴ تا ۸۹ (ورق ۴ الف۔ ۵ ب و ۹۲ ب۔ ۹۴ الف)۔

شبہ نہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے معانی و بیان کو مرتب اور مدون کیا لیکن وہ کسی طرح بھی اس کے بانی نہیں کہے جا سکتے۔ ان کی دونوں کتابیں اسرار البلاغۃ[۱] اور دلائل الاعجاز[۲] غالباً پہلی کتابیں ہیں جن میں معانی و بیان کے مسائل سے مرتب طور پر بحث کی گئی ہے مگر جو معلومات ان میں ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود ضرور تھیں اور انھوں نے ان کو صرف جمع کیا ہے۔

جرجانی کی کتاب دلائل الاعجاز ہمارے اس دعوے کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ فن معانی و بیان کی ترتیب کا ذمہ دار اعجاز قرآن کا عقیدہ ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں اعجاز کی دلیلیں بیان کی گئی ہوں گی لیکن آپ شروع سے لیکر آخر تک دیکھ جایئے تمام بحث نحو اور معانی و بیان کے مسائل سے ہے۔ بادی النظر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن اس کا حل بہت آسان ہے۔ بقول جرجانی کوئی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ قرآن معجز ہے جبتک وہ بیان کے مختلف طرزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو[۳]۔ اس نکتے کو جرجانی نے ایک ضمیمے میں اور زیادہ واضح کیا ہے۔ اس کا نام المدخل فی دلائل الاعجاز ہے[۴]۔ جرجانی نے خطابی کی کتاب اعجاز القرآن کی دو شرحیں بھی لکھی تھیں ان میں سے بڑی کا نام المقتصد تھا[۵]۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ان شرحوں کی تالیف کے دوران میں ان کو ادبی نقد کا معیار معین کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی ہو اور اسی احساس کا نتیجہ ان کی دونوں مشہور تصانیف ہوں۔ اس سے ہم ان کے خیالات کے ارتقا کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے ایک متقدم کی کتاب کی مختصر شرح کو کافی سمجھا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک بڑی شرح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے بعد انھیں شرح کا دامن تنگ معلوم ہونے لگا چنانچہ ایک مستقل تصنیف کی طرح ڈالنی پڑی اور یہی ان کی کتاب دلائل الاعجاز ہے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ بحث کا مدار وہی اعجاز قرآن کا مسئلہ ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اسرار البلاغۃ غالباً ان کی آخری تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے عقیدۂ اعجاز قرآن کا دامن چھوڑ کر صرف معانی و بیان کے مسائل سے بحث کی ہے۔ افسوس کہ ان کی دونوں

---

[۱] مطبوعہ مصر ۱۹۰۱ء طبع ثانی ۱۹۲۵ء [۲] مصر ۱۳۲۱ھ [۳] ص ۳۲-۳۳ و ۲۷۶ الخ [۴] مطبوعہ کتاب کے آخر میں منسلک ہے [۵] کشف الظنون ماتحت اعجاز۔

نثر میں نہیں ملتیں ورنہ ان کے ذہن کی ارتقا زیادہ طور پر ہمارے سامنے ہوتی۔

جرجانی کی دونوں کتابوں کو فخر الدین رازی نے ملخص کیا ہے اور اس کا نام نہایۃ الایجاز فی درایۃ الاعجاز[۱] رکھا ہے۔ انھوں نے جرجانی کے اس نکتے کو عام فہم الفاظ میں بیان کیا ہے کہ صرف معانی و بیان کی وساطت سے اعجاز قرآن کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ رازی نے اپنی تفسیر اور علم کلام کی دو کتابوں میں بھی جن کے نام "معالم اصول الدین" اور "محصل افکار المتقدمین"[۲] ہیں اس مسئلے سے بحث کی ہے مگر اس تمام بحث میں خود ان کا کوئی انفرادی عطیہ نہیں ہے۔

دوسرے مصنفین جنھوں نے جرجانی کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کیا ہے یہ ہیں: (۱) ابن ابی اصبع القیروانی (م ۶۵۴ھ) جن کی کتاب کا نام بیان البرہان فی اعجاز القرآن[۳] ہے۔ (۲) عبد الواحد الزملکانی (م ۶۵۱ھ) جن کی کتاب کا نام "کتاب التبیان فی علم البیان المطلع علی اعجاز القرآن[۴]" ہے۔ حازم بن محمد قرطاجنی (م ۶۸۴ھ) کا نام بھی اس سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے سے غالباً اپنی تصنیف منہاج البلغا[۵] میں بحث کی تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

یہ حقیقت بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا لفظ اعجاز بھی اپنے خصوصی معنی سے آہستہ آہستہ دور ہوتا گیا اور آخر میں تو یہ بلاغت کا مرادف ہو کر رہ گیا اسی طرح علم الاعجاز سے علم المعانی والبیان والبلاغۃ مراد ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ غیاث الدین لطف اللہ (م ۱۰۳۵ھ) نے ایک رسالہ "الایجاز فی علم الاعجاز" کے نام سے لکھا ہے جس کا موضوع سر تا سر علم معانی و بیان ہے اور اس میں ایک خفیف سا اشارہ بھی عقیدۂ اعجاز قرآن کی طرف نہیں ہے نہ مصنف نے دیباچے ہی میں اس کتاب کے نام اور اس کے موضوع

---

[۱] مصر ۱۳۱۷ھ [۲] دونوں مطبوعہ مصر ۱۹۰۵ء [۳] کتبخانہ مشرقی پٹنہ [۴] اسکوریال نمبر ۲۲۲ و ۲۶۳۔ اسی مصنف کی ایک کتاب مدینے کے ایک کتبخانے میں موجود ہے جس کا نام "البرہان الکاشف عن اعجاز القرآن" ہے (ملاحظہ ہو معارف ج ۱۰ نمبر ۵ نومبر ۱۹۲۶ء ص ۳۳۰) غالباً یہ ایک ہی کتاب ہے جس کے دو نام ہو گئے ہیں [۵] ملاحظہ ہو: مفتاح السعادۃ لطاشکبری زادہ مطبوعہ حیدرآباد ۱۹۱۱ء ج ۲ ص ۳۵۹ اور اتقان ج ۲ ص ۱۱۹۔

کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ اب اس سے زیادہ اور کیا دلیل اس تعلق کی ہوسکتی ہے جوفن معانی وبیان کو عقیدۂ اعجاز قرآن سے ہے کہ ایک لفظ جو اُس عقیدے کے اظہار کے لیے تراشا گیا تھا اِس فن کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

(ب) تفسیر

ہم اس سے قبل دو قدیم تفاسیر (طبری اور قمی) کا ذکر کر چکے ہیں۔ بعد کے مفسرین میں سے خاص طور پر جن لوگوں نے اس مسئلے سے بحث کی ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱) راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ)، مقدمۃ تفسیر القرآن (یہ مقدمہ مصر میں 'تنزیہ القرآن عن المطاعن' کے آخر میں طبع ہوا ہے۔ ۱۳۲۹ھ)

(۲) عمر بن محمد النسفی (م ۵۳۷ھ):۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن [illegible])

(۳) محمود بن عمر الزمخشری (م ۵۳۸ھ):۔ تفسیر الکشاف (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۵ء)

(۴) ابن عطیۃ الغرناطی (م ۵۴۲ھ):۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن؛ Spr. 408)

(۵) محمد بن احمد القرطبی (م ۶۷۱ھ):۔ تفسیر القرآن (مخطوطہ برلن: Spr. 436)

(۶) محمد بن جزی الکلبی (م ۷۴۱ھ):۔ کتاب التسہیل لعلوم القرآن (مخطوطہ برلن: [illegible])

(۷) اسمٰعیل بن عمر ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)؛ تفسیر القرآن (مطبوعہ مصر ۱۹۲۴ھ)

(۸) محمد بن عبداللہ الزرکشی (م ۷۹۴ھ): البرہان فی علوم القرآن (مخطوطہ کتبخانۂ محمودیہ، مدینہ۔ ملاحظہ ہو رسالہ معارف ج ۱۸ نمبر ۶ دسمبر ۱۹۲۶ء ص ۱۴۱۔ نیز مقدمۃ 'الاتقان' للسیوطی)

(۹) مجدالدین فیروزآبادی (م ۸۱۷ھ): بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز (کتاب نایاب ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربیہ برلن ج ص ۲۸۹)

(۱۰) جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ): الاتقان فی علوم القرآن (مطبوعہ مصر ۱۳۴۴ھ)

(۱۱) شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۔۔۔ھ): الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔

(ج) علم کلام

ہم علی بن ربن طبری کی کتاب کا ذکر کر چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام اشعری (م ۳۲۴ھ) نے بھی اپنی تصانیف میں اس مسئلے سے بحث کی تھی مگر بیشتر تو نایاب ہیں اور جو دستیاب ہیں ان میں کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے بعض خیالات دوسروں کی تصانیف میں مذکور ہیں۔ ایک اور مشہور متکلم جن کی تصانیف اب نہیں ملتیں ابو اسحٰق اسفرائینی (م ۴۱۸ھ) المعروف بہ 'استاذ' تھے۔ انھوں نے غالباً اپنی تصنیف 'جامع الجلی والخفی فی اصول الدین والرد علی الملحدین'[1] میں اس مسئلے سے بحث کی تھی۔ دوسرے متکلمین جنھوں نے اس مسئلے کو اپنے نظام کا جزو بنایا اور جن کی تصانیف دستیاب بھی ہوتی ہیں یہ ہیں:۔

(۱) عبد القاہر بن طاہر البغدادی (م ۴۲۹ھ): کتاب اصول الدین (مطبوعہ استانبول ۱۹۲۸ء)

(۲) علی بن محمد الماوردی (م ۴۵۰ھ): اعلام النبوۃ (مطبوعہ مصر ۱۳۱۹ھ)

(۳) علی بن احمد ابن حزم (م ۴۵۶ھ): کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل (مطبوعہ مصر ۱۸۹۹-۱۹۰۳ء)

(۴) عبد الملک بن عبد اللہ الجوینی (ابو المعالی امام الحرمین م ۴۷۸ھ): کتاب الارشاد فی اصول الاعتقاد (مخطوطہ لائڈن ۱۹۸۳۔ برٹش میوزیم ۱۶۲۸۔ ۲)

(۵) ابو حامد الغزالی (م ۵۰۵ھ): کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد (مطبوعہ مصر ۱۹۱۶ء)

(۶) قاضی عیاض (م ۵۴۴ھ): کتاب الشفا (مطبوعہ مصر ۱۹۱۱ء)

(۷) محمد بن عبد الکریم الشہرستانی (م ۵۴۸ھ): نہایات الاقدام فی علم الکلام (مخطوطہ برلن Pm 579 مطبوعہ آکسفورڈ ۱۹۳۱ء۔ ابھی صرف ایک حصہ شائع ہوا ہے)

(۸) علی بن ابی علی الآمدی (م ۶۳۱ھ) ابکار الافکار (مخطوطہ برلن Pet 233)

(۹) تقی الدین ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (مطبوعہ مصر ۱۳۲۲ھ)

---

[1] کشف الظنون: جامع۔

(۱۰) ہبۃ اللہ البارزی (م ۷۳۸ھ) توثیق عُری الایمان فی تفضیل حبیب الرحمٰن (مخطوطہ برلن Spr. 127)

(۱۱) بدر الدین بن عمر بن حبیب (م ۷۷۹ھ) النجم الثاقب فی اشرف المناقب (" " Pet. 342)

(۱۲) سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۱ھ) شرح مقاصد الطالبین فی اصول الدین (مطبوعہ استامبول ۱۲۷۷ھ)

(۱۳) الشریف الجرجانی (م ۸۱۶ھ) شرح المواقف للایجی (م ۷۵۶ھ) مطبوعہ لیپزگ ۱۸۴۸ء

(۱۴) ابو الحسین سعید بن ہبۃ اللہ الراوندی[۱] (القطب م ۵۷۳ھ) کتاب الخرائج والجرائح (مخطوطہ برلن Pm 113)

اس کتاب کو تمام و کمال محمد باقر مجلسی (م ۱۱۱۰ھ) نے اپنی عظیم الشان تصنیف 'بحار الانوار' مطبوعہ طہران ۱۲۷۰-۱۳۰۲ھ میں داخل کر لیا ہے۔

(۱۵) یحییٰ بن حسن القرشی الزیدی (م ۔؟) منہاج التحقیق و محاسن التلفیق (مخطوطہ برلن 96 [illegible])

(۱۶) رحمۃ اللہ الہندی (م ۔؟) اظہار الحق (مطبوعہ مصر ۱۳۰۹ھ)

(باقی)

---

[۱] فہرست مخطوطات عربیہ برلن ج ۲ ص ۶۲۴ پر یہ نام سعد اللہ درج ہے مگر یہ غلط ہے۔ ملاحظہ ہو 'منتہی المقال' لابی علی العاملی مطبوعہ طہران ۱۳۰۰ھ ص ۱۴۸ اور 'تذکرۃ المتبحرین' مطبوعہ طہران ۱۳۰۲ھ ص ۵۵ اور 'بحار الانوار' ج ۲۵ ص ۷۔

ہندو اور آریہ کی وجہ تسمیہ

ملک ہندوستان کی رہنے والی تمام قومیں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، بودھ، عیسائی وغیرہ لفظ "ہندی" یا "ہندوستانی" میں بخوشی شامل ہو جاتی ہیں لیکن لفظ "ہندو" کے مفہوم سے سکھ، پارسی، بودھ، مسلمان، عیسائی جدا ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اچھوت اور ذلیل اقوام کو دوسری اقوام کے مساوی معاشرتی حقوق عطا کرنے کی تحریک کچھ دنوں سے ہندوؤں میں جاری ہے لہٰذا جن لوگوں پر لفظ ہندو بولا جاتا ہے ان میں آجکل برہمن، راجپوت ویش، شودر، اچھوت، چنڈال سب ہی شامل سمجھے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ماضی قریب میں چماروں، بھنگیوں، کنجروں وغیرہ کو ہندوؤں کی قوم میں شامل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں برہمن، راجپوت اور ویش تین ہی قومیں جو جنیؤ استعمال کرنے کی حقدار ہیں شامل سمجھی جاتی تھیں۔ شودر قوموں میں عموماً ہندوستان کے قدیم باشندے شامل ہیں جن میں سے ایک بڑے حصے کو ہندوؤں نے اپنی خدمت گزاری کے لئے ضروری سمجھ کر کچھ ادنیٰ درجہ کی رعایتیں دیدی ہیں مثلاً کہاروں کو برتن اور کھانے کی چیزیں چھونے کی اجازت ہے۔ اسی طرح جاٹوں کو کچھ رعایات حاصل ہیں۔ بہرحال ہندوستان کی قدیم عظمت کو انھیں ہرسہ دوجنمہ قوموں نے اپنے بزرگوں سے وابستہ سمجھا ہے اور جب ہندو تہذیب، ہندو علوم، ہندو طاقت، ہندو مذہب، ہندو تمدن، ہندو معاشرت وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو ان کے مفہوم کو انھیں ہرسہ دوجنمہ قوموں سے تعلق ہوتا ہے۔ لفظ ہندو ان اقوام کے لئے سینکڑوں نہیں ہزاروں سال سے مسلسل استعمال ہوتا رہا ہے اور آجکل بھی مستعمل ہے لیکن چالیس پچاس سال ہوئے کہ ہندوؤں کے ایک جدید مذہبی فرقے نے جس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی صاحب آنجہانی ہیں اپنے آپ کو ہندو کہلانا نہ چاہا اور اپنا نام آریہ تجویز کیا چنانچہ آجکل لفظ آریہ سے عام بول چال میں ہندوؤں کا یہی مذکورہ فرقہ مراد لیا جاتا ہے (اب چند سال سے آریہ فرقے کے لوگ بھی اپنے آپ کو ہندو ہی کہنے لگے ہیں) لیکن مورخین کی اصطلاح میں آریہ اور ہندو دونوں لفظ مترادف اور ہم مفہوم ہیں یعنی وہ لوگ جو کسی قدیم زمانے میں شمال یا شمال ومغرب کی جانب سے ہندوستان میں آکر اور اس ملک کے قدیم ترین

باشندوں کو پہاڑوں اور جنگلوں میں پناہ گزیں یا قتل ہونے کے لئے مجبور کرکے خود ہندوستان پر قابض و متصرف ہوگئے تھے۔ انھیں قدیم فاتحین کی اولاد برہمن، راجپوت یا چھتری اور ویش تین قوموں میں تقسیم ہوگئی۔ ان لوگوں کی زبان سنسکرت تھی اور انھیں لوگوں نے ہندوستان کو ممالک عالم میں نامور بنایا اور یہی لوگ ہندو کہلاتے ہیں۔ بس آریہ یا ہندو ایک ہی قوم یا ایک ہی مجموعۂ اقوام کا نام ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر لفظ ہندو بولا جاتا ہے آریہ نہیں بولا جاتا لیکن تاریخ کی کتابوں میں مورخین ہندو کی جگہ لفظ آریہ استعمال کرتے ہیں۔ وید اور منوسمرتی میں بھی لفظ آریہ استعمال ہوا ہے۔ مورخین اس لئے بھی لفظ آریہ استعمال کرنے پر مجبور ہیں کہ اسی ہندی آریہ قوم کی ہم نسل دنیا کے دوسرے ملکوں میں اور قومیں بھی ہیں ان کو بھی آریہ اقوام کہا جاتا ہے ان پر ہندو کا لفظ نہیں بولا جاسکتا۔ لہذا جب اقوام عالم پر بحث کی جاتی ہے تو ہندوستان کی آریہ اقوام کو "ہندوستانی آریہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہرحال اس وقت آریہ اور ہندو دونوں لفظوں کی حقیقت و اصلیت پر غور کرنا مدنظر ہے۔

سنسکرت اور فارسی زبان میں ہ اور س کا بدل ہوجاتا ہے مثلاً ہفت اور سپت، یا سوریہ اور ہوریہ، یا سندھو اور ہندو، یا سوما اور ہوما، یا ماہ اور ماس یا دس اور دہ، یا سوم اور ہوم وغیرہ ہم معنی الفاظ میں س والے الفاظ سنسکرت زبان کے اور ہ والے فارسی زبان کے ہیں۔ فارسی زبان میں ہندو کے معنی سیاہ کے ہیں۔ سنسکرت زبان میں سندھو دریا اور سمندر کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سام یا سم کے معنی دونوں زبانوں میں سیاہ کے ہیں۔ جن ملکوں میں سورج کی دھوپ تیز ہوتی ہے وہاں رہنے سے انسان کے رنگ میں سیاہی آجاتی ہے بنابریں ایرانیوں نے سورج کا رنگ سیاہ مانا ہے۔ آگ چیزوں کو جلا کر کوئلہ یعنی سیاہ کردیتی ہے لہذا انھوں نے آگ کی اصل رنگت بھی سیاہ مان کر آگ کا ایک نام سم رکھ لیا۔ اسی لفظ سے "سم اندر" کا مخفف سمندر بنا۔ سمندر ایک جانور کا نام ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے۔ آگ سے باہر نکلتے ہی مرجاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چوہے کی برابر اور چوہے سے مشابہ ہوتا ہے۔ پانی کی عظیم الشان جھیل یا بڑے دریا کو بھی سمندر اسی لئے کہا گیا کہ زیادہ گہرا پانی سیاہ نظر آتا ہے۔ اب آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ سندھو کے معنی سنسکرت میں سمندر یا بڑے دریا کے ہیں۔ مذکورہ لفظ سام یا سم کے تصو

ں بنا پر تھے۔ چنانچہ ہندوستان یا پنجاب کا سب سے بڑا دریا خاص طور پر سندھو کے نام سے موسوم ہوا اور
ی لئے اس دریا کا ایک نام نیلاب بھی ہے یعنی نیلا پانی۔ ظاہر ہے کہ سیاہ اور نیلی رنگتوں میں کس قدر مشابہت
ہے اور نیلاب کا ترجمہ کالا پانی یا کالا دریا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال سنسکرت کا سندھو اور ایرانی زبان کا ہند
بس کے معنی سیاہ کے ہیں ایک ہی لفظ ہے۔ رگوید میں ہندوستان کے شمال و مغربی علاقے یعنی سات دریاؤں
ے ملک کو "سپتہ سندھو" کہا گیا ہے اور اسی ملک کو ژندواوستا میں "ہپتہ ہندو" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔
ان سات دریاؤں میں سب سے بڑا اور سرحد ایران کے قریب جو دریا ہے اس کو خاص طور پر سندھو اور نیلاب
بولا جاتا ہے۔ اس سپتہ سندھو یا ہپتہ ہندو علاقے میں جو غیر آریہ قومیں آریوں کی آمد سے پیشتر آباد تھیں وہ ایرانیوں
یا تورانیوں کے مقابلہ میں سیاہ فام، غیر تربیت یافتہ اور نامہذب تھیں اور تمام ایرانی یا آریہ ان کو ہندو یا
سندھو کہتے تھے اور اس طرح اس لفظ کا مفہوم کالا آدمی، چور، رہزن اور غلام ہو گیا جیسا کہ فارسی زبان کی
غات میں لفظ ہندو کے یہی معنی درج ہیں۔ زحل سیارے کی نسبت قدیم سے قوموں کا خیال ہے کہ اس کا
رنگ سیاہ ہے لہذا اس کو "ہندوئے فلک" کا خطاب دیا گیا۔ فارسی محاورے میں چڑیل اور پلید عورت کو
"ہندوزن" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جب ایرانیوں یا آریوں کا ایک حصہ پنجاب کو فتح کرکے ہندوستان
یں سکونت پذیر ہو گیا تو ایرانیوں نے ان کو بھی ہندو کے نام سے یاد کرنا شروع کیا لیکن ان آریوں نے
پنے آپ کو ہندو نہیں کہا اور ممکن ہے کہ اسی لئے انھوں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں یعنی ہندوؤں
سے اپنے آپ کو بالکل الگ اور ممتاز رکھنے کی کوشش میں قدیم باشندگان ہند کو ویدوں کی ہوا تک نہیں
لگنے دی اور اپنی معاشرت و تہذیب و اخلاق کو بھی ان سے جدا اور محفوظ رکھنا ضروری سمجھا کہ کسی طرح ان پر
فظ ہندو کا اطلاق نہ ہو سکے۔ لیکن چونکہ آریوں کا یہ حصہ جس نے ہندوستان پر قبضہ کیا ایرانی یا تورانی آریوں
سے ناراض اور خانہ جنگیوں میں مغلوب اور وطن سے بیدخل ہو کر آیا تھا (جیسا کہ اس کے زبردست قرائن
موجود ہیں اور وہ اپنے موقع پر بیان ہوں گے) لہذا ایرانی و خراسانی و بابلی ان کو ازراہ طنز بھی اور ہپتہ ہند
ا باشندہ بن جانے کے اعتبار سے بھی ہندو ہی کہتے رہے۔ ان آریوں نے ایک عرصہ دراز تک اپنے آپ کو ہندو
ہلانے سے پرہیز کیا اور یہاں کے قدیم ہندوؤں کو بھی ہندو کہنا ترک کرکے ان کو دسیو، دشت وغیرہ ذلیل

خطابات دئے اور کبھی کبھی ایرانی و بابلی ہمقوم رقیبوں کو جواباً چڑانے اور ترکی بترکی جواب دینے کے لئے اَسُر یا آہر کے ناموں سے ان ذلیل و مقہور قدیم باشندگان ہند کو مخاطب کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رگوید سے لے کر منوسمرتی کے زمانے تک ان آریوں نے اپنے آپ کو لفظ ہندو سے بچایا چنانچہ وید یا منوسمرتی میں ہندو کا لفظ آریہ قوم کے لئے قطعاً نہیں بولا گیا۔ بخلاف اس کے انھوں نے اپنے سفید رنگ ہونے پر جا بجا فخر کیا ہے جیسا کہ وید کے گیتوں سے ثابت ہے۔ اس کے بعد جب اور متعدد گروہ اسی طرح شمالی و مغربی ملکوں سے فاتحانہ آ آکر ہندوستان میں سکونت پذیر ہوئے اور ان پہلے آئے ہوئے آریوں میں گھل مل گئے تو پھر اس لفظ ہندو میں آریوں کے لئے وہ اذیت رساں اور رنجدہ مفہوم باقی نہ رہا اور جب پنجاب و سندھ کا علاقہ مفتوح ہو کر ایران کی اشکانی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا تو ہندوستان والوں کے لئے عام طور پر ہندو استعمال ہونے لگا۔ اس کے بعد سے ان لوگوں نے خود اپنے آپ کو ہندو کہنا شروع کر دیا اور آجکل تو جیسا کہ اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوا ہے لالہ ہردیال نے انگلستان میں لفظ ہندو کے متعلق ہندوؤں کو سمجھایا اور نہایت جوش کے ساتھ وعظ فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو ہندو کہہ کر تمہارا سینہ از راہ فخر آگے کو اُبھر جانا چاہئے۔

اب رہا لفظ آریہ۔ یہ بہت قدیم لفظ ہے جو ایک اس قوم کا نام تھا جس کا ایک حصہ ہندوستان میں آیا، ایک حصہ ایران میں سکونت پذیر ہوا، ایک حصہ بحیرۂ کاسپین کے قریبی علاقوں میں مسکن گزیں ہوا۔ وہاں سے ایک حصہ جزیرہ نما بلقان اور اٹلی کی طرف گیا، ایک حصہ جرمنی ہوتا ہوا انگلستان کے جزیروں تک پہنچ گیا۔ چنانچہ ملک ایران کا نام ہی خود بتا رہا ہے کہ یہ آریا یا آریہ لوگوں کا ملک ہے۔ ہرات کی وجہ تسمیہ بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ وہ آریہ قوم کا دارالصدر رہا ہے۔ ملک ایران میں غیر معروف قدیم مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے زمانۂ حال میں پڑھے گئے ہیں جن کی زبان سنسکرت زبان سے مشابہ اور ژند اوستا کی زبان ہے ان میں شاہ گشتاسپ کے نام کے ساتھ آریہ کا لقب موجود ہے۔ قدیم یونانی مورخ سلطنت ایران کے تمام مقبوضہ ممالک کو ایریانہ کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ ہیروڈوٹس مورخ نے ایران کے کئی پادشاہوں کے ناموں کے ساتھ لفظ آریہ استعمال کیا ہے بابلی لوگوں میں مادی قوم کو یونانی مورخ نے آری آئی اور اس کی ایک شاخ کو آریزنتی کہا ہے۔ آرمینیا کا ملک اور آرمینین قوم بھی آریا سے تعلق ظاہر کر رہی ہے۔ کوہ قاف میں

آیرن قوم موجود ہے۔ شمالی یونان یعنی علاقہ تھریس کا پرانا نام آریا تھا۔ آئرلینڈ کی رہنے والی کیلٹ قوم کا قدیم نام "آئرن" تھا چنانچہ اسی کے نام سے یہ جزیرہ موسوم ہوا۔ اوستا میں ایک آیت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "آریانہ ویجو ہی سب سے قدیم زمانے میں کاشت شدہ سرزمین تھی باقی تمام زمین بنجر تھی" اس سرزمین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سرد علاقہ تھا۔ غالباً یہی علاقہ کل آریہ اقوام کے آباؤ اجداد کا ابتدائی مسکن ہوگا اور اس قوم نے سب سے پہلے چرواہی کے ساتھ کاشتکاری بھی وہیں سیکھی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ چوپان کو زمین کی محبت نہیں ہوتی۔ وہ جس زمین میں اپنے جانوروں کے چرانے کے لئے سبزی دیکھتا ہے وہیں مقام کر دیتا ہے۔ جب وہاں جانوروں کا چارہ ختم ہو جاتا ہے تو اس علاقے کو چھوڑ کر فوراً دوسری چراگاہ کی تلاش میں چل دیتا ہے۔ لیکن کاشتکار کو زمین کی محبت ہوتی ہے وہ جس جگہ کھیتی شروع کر دیتا ہے پھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا اور ہمیشہ اس پر قابض رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے صوبے میں دیکھتے رہے ہیں کہ کاشتکاروں کو دخیل کار اور موروثی بننے کی کس قدر خواہش و آرزو ہوا کرتی تھی۔ اب چند سال سے جدید قانون نے قریباً ہر ایک کاشتکار کو حق دخیل کاری عطا کر دیا ہے لیکن چونکہ یہ دخیل کاری نسلاً بعد نسل جاری نہیں رہ سکتی اس لئے کاشتکار کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے جو دلیل اس بات کی ہے کہ کاشتکاروں کو زمین کی اس قدر زیادہ محبت ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اپنی پوری زندگی بلکہ اپنی آئندہ نسلوں میں بھی اپنی زیر کاشت زمین کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔

پس اس قوم نے جب کاشتکاری سیکھ لی تو زمین کے قبضے کی بابت آپس میں ضرور جھگڑا ہوا ہوگا اس لئے کہ قوم میں تعداد نفوس نے ترقی کی اور زیر کاشت زمین محدود تھی بنابریں طاقتور افراد نے کمزوروں کو مار کر نکال دیا یا وہ خود ہی دوسری قابل زراعت زمین کی تلاش میں وہاں سے نکل گئے۔ اسی شوق زراعت نے اس قوم کو دنیا کے دور و دراز علاقوں تک پہنچا دیا۔ جس طرح زند اوستا میں کاشتکاری اور فن کاشتکاری کی تکریم موجود ہے اسی طرح رگ وید میں جا بجا کاشتکاری اور اس کے متعلقات کا ذکر موجود ہے۔ کہیں بیجوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے برہسپتی سے التجا کی گئی ہے کہیں ہرنوں کے شکار کرنے والوں اور کرخت آواز بھیلوں سے کھیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے امداد چاہی گئی ہے۔ یجر وید ادھیائے ۱۲ منتر ۷۱ میں ہے کہ "اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لئے زمین کو پھاڑنے والا جو "پھال" ہے اور اس پھال کو مضبوط کرنے کے لئے

اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت پٹی لگی ہوئی ہے، اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو۔ اسی طرح تم اپنے خوبصورت رتھوں کو چلاؤ اور اپنی حفاظت کرو۔" پھر ایک جگہ اسی وید اور اسی ادھیا میں ہے کہ "اے انسانو! تم ہلوں کو جوئے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو اور اس کو اچھی طرح جوت کر اس میں جو وغیرہ اناج بوؤ۔ جو محنت کرنے والا کاشتکار ہے اس کو چاہیئے کہ بیلوں کے ذریعہ ہل میں پھال لگا کر زمین کو جوتے۔"

غرض اس بات کے لئے زیادہ وضاحت اور دلائل کی ضرورت نہیں کہ ویدوں کے مطالعہ سے بلا اشتباہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آریا قوم ایک کاشتکاری پیشہ قوم تھی اور دودھ کے جانور گائے بکری وغیرہ بھی پالتی تھی۔ بابل و نینوا کی آسوری زبان میں آری کے معنی جتے ہوئے کھیت یا کاشت شدہ زمین کے تھے۔ بنجر زمین کو لا آری کہتے تھے۔ اسی ملک کی کوشی زبان میں ارآرا کے معنی فصل کا کاٹنا ہیں۔ ہنٹر اور مشہور سنسکرت داں میکسمولر کا قول ہے کہ لفظ آریہ سنسکرت زبان کے مصدر آر سے مشتق ہے جس کے معنی کاشتکاری اور زمین پھاڑنے کے ہیں لہذا آریہ کے معنی کاشتکار ہوئے۔ آر چمڑا سینے کے اوزار اور بیل ہانکنے کے ڈنڈے کو بھی کہتے ہیں جس کے سرے پر ایک نوکدار کیل لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اس طرح آریہ کے معنی چمڑا سینے اور بیل ہانکنے والا ہوئے۔ اس ملک کے قدیم باشندے چونکہ فن کاشتکاری سے ناواقف اور شکار پر گزران کرنے والے تھے لہذا وہ اناریا یا غیر آریہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ چونکہ یہ غیر آریہ سیاہ فام، پست فطرت، چپٹی ناک والے، کم ہمت اور چھپ چھپ کر حملہ کرنے والے تھے لہذا قدرتی طور پر لفظ آریا میں روشن چہرہ، اونچی ناک والے، بلند حوصلہ اور شریف کا مفہوم پیدا ہو جانا چاہیئے تھا چنانچہ یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہونے لگا۔

رباعیات

اے بے خبر خودی! ہے کیوں سر بسجود؟ تیرے ہی خیالات ہیں تیرے معبود!!
تیری ہی تگ ودوے ہے.. ہنگامۂ دہر ہے تو ہی حقیقت اور تو ہی مقصود!!

اے شعلۂ برق! شمع محفل ہو جا!! غارت گر تاریکیٔ باطل ہو جا!
دل، حاصلِ کشت زندگانی ہے اگر خاشاک خرد کو پھونک کر دل ہو جا!

اک سعیِ مدام، جس کا حاصل ہی نہیں اک جادہ، کہ روشناس منزل ہی نہیں
اک خام خیال ہے تمنائے سکوں اس بحر حیات کا تو ساحل ہی نہیں

ہمراہ یہ کارواں لئے جاتا ہے کیا مجھ کو کشاں کشاں لئے جاتا ہے
اک کشتیِ آوارہ ہوں، طوفان حیات معلوم نہیں کہاں لئے جاتا ہے

کیا کیا نہ کیا! دہر میں کیا کیا نہ ہوا! یہ قلب طپاں مگر شکیبا نہ ہوا
آخر کو فنا ہوا یہ کہتے کہتے، افسوس کہ ایسا ہوا، ایسا نہ ہوا

غزل

ہر نفس اف اف ہے ہر دم آہ آہ
تیر اور تیز نگاہِ بے پناہ

دل کی حالت کیوں نہ ہو اب روبراہ
دل کی دنیا کر گئی زیر و زبر

"موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے"
یادگار عشرتِ ایام وصل

ترک الفت پر بھی یاد آتی رہی
آج شاید ان کو کچھ آجائے رحم

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں ہیں تباہ
دل کے بچنے کی نہیں اب کوئی راہ

اس پہ ہے ان کی محبت کی نگاہ
ان کی شرمائی ہوئی نیچی نگاہ

عشق میں نا استواری ہے گناہ
اشک ہے یا آہ، وہ بھی گاہ گاہ

ابتدائے آرزو کی رسم و راہ
اس طرف جاتا ہوں با حال تباہ

صبر کر لینا تو آساں ہے جلیلؔ
چھیڑ سے جب باز آئے وہ نگاہ

انشا

محمد یحییٰ صاحب تنہا بڑے ثقہ نقاد ہیں۔ انھیں جیسے بزرگوں کے متعلق انشا نے کہا ہے۔ ع
میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے منقطع میرا تیرا میل نہیں۔ بہرحال ہمارے شعرا نے شیخ کی پگڑی دل کھول کر
اچھالی ہے۔ آخر شیخ کی زبان کیوں نہ چلے۔

سید انشاء اللہ خاں انشا حکیم ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے۔ سادات صحیح النسب سے کہے جاتے ہیں۔
ہلے ان کے بزرگوں نے دلی میں سکونت اختیار کی اور رفتہ رفتہ امرائے شاہی میں داخل ہوگئے۔ تاریخ پیدائش
لوم نہیں ہے لیکن آپ مرشد آباد میں پیدا ہوئے جبکہ آپ کے والد وہاں نوابان بنگالہ کے طبیب تھے۔ ابتدائے
ر میں علوم رسمیہ آپ نے اپنے والد ہی سے حاصل کئے۔ شعر کہنے کا بچپن سے شوق تھا۔ آپ اپنے والد سے
صدر تخلص کرتے تھے اصلاح لیا کرتے تھے۔ آپ مرشد آباد سے دہلی آئے اور یہاں مشاعروں میں بے حد
پی لی۔ کچھ دنوں تک شاہ عالم کے دربار میں بطور درباری شاعر کے رہے۔ شاہ عالم آپ کی بہت قدرومنزلت
تے تھے لیکن آپ نے اپنا گزارہ دربار شاہی میں نہ دیکھ کر لکھنؤ کا رخ کیا اور وہاں مرزا سلیمان شکوہ کی ملازمت
تیار کرلی۔ تھوڑے عرصے کے بعد شاہزادے کے استاد مصحفی کی جگہ پر آپ فائز ہوگئے اور مصحفی اور انشا میں
اعرانہ جنگ و جدل کے بعد سخت بگاڑ ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کے امرا نے انشا کا ساتھ دیا اور
مصحفی سے جو ایک پیر کہن سال شاعر تھے بے اعتنائی اختیار کی لیکن درحقیقت انشا نے اپنے تمسخر اور مذاق
سے امرا کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا ورنہ ان کا پایۂ شاعری مصحفی سے برتر نہیں ہے۔ مصحفی کو تمام لکھنؤ کا استاد
ننا چاہئے کیونکہ یہ انھیں کی بدولت ہوا کہ قدیم شاعری ان کے سلسلے سے آج تک لکھنؤ میں جاری ہے ورنہ
ضرت انشا نے اس شاعری کی مٹی خراب کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

علامہ تفضل حسین خاں کی وساطت سے آپ نواب سعادت علی خاں والی اودھ کی مصاحبت میں

داخل ہو گئے اور بہت دنوں تک نواب صاحب کی ناک کے بال بنے رہے لیکن ایک رو ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو کر گمنامی کے ساتھ پیوند زمین ہوئے۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔

خبر انتقال میر انشا دل غمدیدہ تا نشاط شنفت
سال تاریخ او ز جان اہل عرفی وقت بود انشا گفت

۲ + ۱۲۳۰ = ۱۲۳۳ھ

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱۔ کلیات انشا جس میں کلام ذیل شامل ہے: (۱) اردو کا دیوان (۲) دیوان ریختی (۳) قصائد (۴) دیوان فارسی (۵) مثنوی شیر و برنج فارسی (۶) مثنوی بے نقط (۷) مثنوی شکار نامہ (۸) مثنویات در ہجو زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس۔ (۹) مثنوی شکایت زمانہ (۱۰) مثنوی فیل (۱۱) مثنوی در ہجو گیان چند ساہوکار (۱۲) اشعار متفرقہ، رباعیات، قطعات و تاریخہائے متفرقہ (۱۳) چیستانیں اور پہیلیاں مخمس وغیرہ (۱۴) دیوان اردو بے نقط مع رباعیات و نثر بے نقط (۱۵) شرح مائۃ عامل نظم فارسی (۱۶) مثنوی مرغ نامہ۔

۲۔ ایک داستان جو نثر اردو میں لکھی ہے اور ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔

۳۔ دریائے لطافت۔ اس میں اردو صرف و نحو، منطق، عروض و قافیہ، معانی و بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک ہندی اہل زبان نے اردو صرف و نحو پر لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ عجیب جامع و بے مثل کتاب ہے۔

کلام پر تبصرہ | ہمارے اردو شعراء میں آپ کا نام بھی کافی مشہور ہے بلکہ آپ استادان فن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جب تک آپ کا کلیات میری نظر سے نہیں گزرا اس وقت تک مجھے بھی یہ ہرگز خیال نہ ہوا کہ آپ "بدنام کنندۂ نکونامے چند" ہیں۔ آپ کا کلام تمام کا تمام جو غزلیات کے نام سے درج ہے رکاکت اور سخافت کے آخری درجہ پر ہے اور اگر اس کو ہم دیوان ہزلیات کہیں تو اس میں ہرگز مبالغہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کاش سر لو

پر دیوان ہزلیات لکھا ہوتا تو ہم ہرگز اس سے تعرض نہ کرتے اور آپ کے قصائد اور فارسی غزلوں کے دیکھنے میں وقت صرف کرتے، جیسا کہ ہم نے آپ کے دیوان ریختی کے ساتھ برتاؤ کیا ہے کہ اول تو اس کو پڑھا ہی نہیں اور اگر اوراق الٹنے میں ایک آدھ شعر ادھر اُدھر سے نظر پڑا بھی تو ہم اس سے یہ کہہ کر گزر گئے کہ آخر کار یہ ریختی ہے۔ اس کی شکایت کیا؟ افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے آپ کے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کرنی چاہئے تھی اس سے دریغ کیا اور آپ کی شخصیت سے مرعوب ہو کر صاف صاف جو کہنا تھا نہ کہا۔ بالاجمال کچھ کچھ ضرور کہا لیکن ان کے دبے لفظوں سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ آپ کی غزلیات تہذیب و شائستگی کی آخری حد پر ہیں اور آپ کے خیالات عشق مجازی کے کیا معنی بلکہ بوالہوسی کے لئے بھی باعث شرم ہیں۔ بلند نظری اور علوئے خیالات کی تلاش آپ کے یہاں نہ صرف بے سود ہے بلکہ تجسس کی نافہمی پر دال ہے۔ تخیل جو شاعری کی جان ہے وہ آپ کے یہاں بالکل مفقود ہے۔ اوباش یا عیاش مزاجوں کی جو گفتگو ہو سکتی ہے وہ اس دیوان میں موجود ہے۔ وہی خیالات، وہی طرز ادا، وہی الفاظ، وہی بانکپن، وہی شہدپن پایا جاتا ہے۔ آپ نے اپنے دماغ کو ذرا فکر کرنے یا سوچنے کی زحمت نہیں دی۔ ظرافت اور شوخی نے جو مضمون سجھایا بے کم و کاست شعر کے نام سے اسے لکھ دیا۔ اپنے رتبہ اور خود شاعری کے درجے کو نظر انداز کر دیا۔ مانا کہ آپ کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت ملی تھی مگر وہ ہرگز واجد علی شاہ نہ تھا۔ وہ مدبر اور متین بھی تھا اور آخری تاجدار اودھ کی طرح عیاش نہ تھا۔ مانا کہ اس نے یہ مصرع کہہ کر "پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی" سید انشا سے غزل پوری کرنے کی فرمائش کی لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ آپ کی طبع زاد غزلیں اس غزل سے بھی بدرجہا بدتر ہوں اور یہ سب کی سب دیوان میں داخل کی جائیں۔ واجد علی شاہ کے شاہی یا درباری شعراء نے ہرگز شعر کا مرتبہ اس قدر کم نہیں کیا۔ آپ نے تو اردو شاعروں میں سب سے بڑھ کر فحش کہا اور لطف یہ کہ اس کو متین کلام کہہ کر دیوان غزلیات میں شامل کیا۔ ہم نے جو چند اردو شاعروں کے کلام پر اب تک تبصرہ کیا ہے اس میں ان کے رکیک اشعار کا بھی ذکر کیا ہے اور ایک خاصی تعداد کے اندر کسی کے یہاں کم اور کسی کے یہاں بیشتر اشعار رکیک پائے گئے ہیں لیکن آپ کے دیوان کو تو دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آپ کے دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اور ہم کو بمشکل تمام بہتر اشعار ایسے دستیاب ہوئے جو سخیف، اور رکیک نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ

اعلیٰ اشعار میں شمار نہیں کیے جا سکتے تاہم ان کی سید انشا کے عام رنگ سے علیحدگی نہ کہ ان کی عمدگی ان کے انتخاب کی سفارش کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ کوئی شاعر آج تک ایسا نہیں گزرا جس کا سنجیدہ کلام اس قدر سبک اس قدر رکیک اور اس قدر لغو ہو جیسا کہ سید انشا کا ہے۔ شاعری ایسے شاعر سے پناہ مانگتی ہے اور اردو شاعری تو سید انشا کے نام سے کانپتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی تمام تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔ عجب نہیں کہ اردو شاعری جو بدنام ہے وہ سید انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں کے نام نامی اور کلام گرامی کی بدولت ہو۔

آب حیات میں آزاد نے میاں بیتاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انشا کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی دربار داری نے ڈبویا بعد اس قول کو خود صحیح تسلیم کیا ہے۔ بے شک سید انشا کا علم و فضل مسلم لیکن ہم کو ان کی شاعری تسلیم نہیں ہے۔ وہ نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت سے بہت پہلے شعر کہتے تھے۔ انھوں نے دلی میں رہکر مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا کا ناطقہ بند کر دیا تھا بلکہ تمام شعرائے دہلی کو ان کے ساتھ ساتھ لتاڑا تھا۔ پھر لکھنؤ پہنچ کر بھی کچھ عرصہ تک مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم رہے اور حضرت مصحفی سے دست و گریباں رہے۔ شاعری کا ان سے قافیہ تنگ تھا اور شاعری کو ان کے نام سے ننگ ہو چکا تھا جبکہ وہ نواب سعادت علی خاں کے مصاحبوں میں شامل ہوئے۔ لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ انشاء اللہ خاں کی شاعری کو نواب سعادت علی خاں کی صحبت نے کھویا۔ آخر وہ کیا شاعری تھی جو برباد گئی اور جس کا نمونہ بھی باقی نہ رہا۔ گلشن بے خار میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تحریر فرماتے ہیں "درفنون رسمیہ مہارتے داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بہ آواز تمام می نواخت۔ بر موزونان معاصر از اعتراضات و مطاعن قافیہ تنگ نمودے۔ دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقۂ ریختہ شعر نگفتہ اما در شوخی طبع و جودت ذہن او سخنے نیست۔"

افسوس ہے کہ نواب صاحب موصوف نے بھی آزاد اور بیتاب کی طرح سید انشا کے کلام کے متعلق صرف یہ کہہ کر کہ "ہیچ صنف را بطریقۂ ریختہ شعر نگفتہ" اپنی رائے کو اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ آپ کے ان الفاظ سے ہرگز یہ مترشح نہیں ہوتا کہ سید انشا کا کلام واقعی پڑھنے کے لائق نہیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ کے نزدیک کلام انشا استادان شعر کے طرز پر نہیں ہے لیکن یہ کسی کو خیال نہیں ہوتا کہ اس سے آپکا

مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کلام انشا رکیک و سخیف ہے اور شعرائے نامور کے لحاظ سے بعید گرا ہوا ہے۔ کلام انشا سے نواب صاحب نے جو اشعار انتخاب کئے ہیں ان میں سے دو چار ہم یہاں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک رکاکت اور سخافت سے پُر ہیں:۔

آبخورے برف کے انشا کو بھیجے آپ نے	اس کے یہ معنی کہ لو نقشہ تمہارا جم گیا
امردِ ہوئے ہیں اس کے خریدار چار پانچ	دے اور ایسے حق مجھے اغیار چار پانچ
بولے وہ اپنے سرو خراماں کو تاڑ باندھ	گر قصد بوسہ ہووے تو گردا سکے پاڑ باندھ
گالیاں سیکڑوں ہی باتوں باتوں جو طلبے ہم نے	محنتیں خوب ہی کیں خوب سے انعام لئے

جناب مصحفی نے اگرچہ سید انشا کی ہجو میں کہا ہے لیکن ہرگز اس میں مبالغہ نہیں اور بالکل سچ کہا ہے ع ۔ واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے ۔ ان کی رفتار و گفتار بالکل بھانڈوں کی سی ہے۔ ہماری رائے میں اگر حضرت انشا اس وقت ڈراما لکھتے اور اس فن کا علم ان کو ہوتا تو وہ نہایت کامیاب ڈراما نویس ہوتے اور ایکٹر و نقال بھی ایسے ہوتے کہ باید و شاید۔ ان کا جواب آج بھی ہندوستان میں تو کیا یورپ اور امریکہ میں بھی تلاش کرنے پر نہ ملتا اور وہ نواب سعادت علی خاں کے معتوب ہو کر بھی روزی کما سکتے اور اپاہجوں کی طرح خانہ نشین ہو کر افلاس اور تنگ دستی کے ہاتھوں اپنی لاابالی زندگی کا خاتمہ نہ کرتے اور خسر الدنیا والآخرہ کے مصداق نہ بنتے۔

میر و سودا نے اردو شاعری کو جس بام ترقی پر پہنچایا تھا وہاں سے میر انشا اس کی ٹانگ پکڑ کر نہ صرف یہ کہ زمین پر کھینچ لائے بلکہ اسے قعر مذلت میں ڈھکیل دیا۔ جرات نے تو صرف چوماچاٹی ہی کو اپنا کمال سمجھا لیکن سعادت یار خاں رنگین اور انشا نے یہ اور جدت کی کہ ریختہ کے ساتھ ریختی ایجاد کی۔ ایجاد بندہ اگرچہ گندہ۔ اس پر آشوب زمانے میں اگر کسی شاعر نے قدیم روایات کو قائم رکھا اور مسلک شاعری پر استقلال اور ہمت مردانہ کے ساتھ گام زن رہا تو وہ صرف مصحفی ہے۔ ورنہ یہ اردو شاعری جو کچھ ہمیں نظر آتی ہے وہ بھی لکدکوب حوادث کی متحمل نہ ہو سکتی۔ چنانچہ ہماری شاعری میں ہزلیات کا باب اسی زمانے سے فروغ پاتا ہے اور آجتک اپنی سخت جانی کی بدولت قائم ہے۔

حضرت انشا اوران کے یاران جلسہ کو اگر میر ذرا بھی موقع دیتے تو وہ ان کی پگڑی اچھالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ غنیمت ہے کہ اس ابوالشعرا نے ان کو منہ لگایا اور بد دماغی کے پردے میں بیٹھ کر اپنی جان بچائی۔ لیکن انشا کی بے چین طبیعت کب ہار مان سکتی تھی میر نہ سہی مصحفی سہی۔ غریب مصحفی کا وہ ناطقہ بند کیا کہ جس پر شاعری آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔ اور پھکڑ پن، فحش اور شہدپن بغلیں بجاتے ہیں۔

آئیے اب آپ دیوان انشا کی سیر کیجئے اور سمجھ لیجئے کہ بنی نوع انسان کے لئے ہمارے شاعر کا پیام بوالہوسی تھا اور بس۔

اگرچہ آپ کے یہاں الفاظ کی کثرت ہے اور صفائی زبان بھی پائی جاتی ہے لیکن قدیم محاورات اور متروکات بھی بدستور قائم ہیں۔ ذیل میں بطور نمونہ چند متروکات لکھے جاتے ہیں:۔

ٹک بجائے ذرا، ہے گا بجائے ہے، خماری بجائے مخمور، اون نے بجائے اُس نے، تجھ بن بجائے تیرے بغیر، اجی بالکل متروک ہے اس کا قائم مقام کوئی لفظ نہیں، اے لو بھی بالکل متروک ہے، جوں بجائے جب، جریانہ بجائے جرمانہ، زور بجائے بہت، کبھو بجائے کبھی، بھلا رے بجائے کلمۂ تعجب جو آجکل بالکل متروک ہے، بھل بے اور واچھڑی بھی آجکل بالکل متروک ہیں، ذرہ بجائے ذرا، دوکھا بجائے براکہا ؎

مجھے دوکھا جو کسی نے تو وہ بولے واہ ایک میرا ہے وہ لاکھوں کی برابر عاشق

بیسوں بجائے بیسیوں، اولینڈ بجائے الٹ، ہیں گے بجائے ہیں، غلطی بجائے اختلاط، ندی بجائے ندی، انھوں کی طرح بجائے اُن کی طرح، تجھ پاس بجائے تیرے پاس، ہو کرکے بجائے ہوکر، تڑپ جھپٹ بجائے سوائے تڑپ، اکد بجائے کب وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں بعض الفاظ بھی غلط بندھے ہیں۔ ایسے شخص کو جو دوسروں کی غلطیاں فاش کرنے میں طاق تھا کسی قدر احتیاط سے کام لینا چاہئے تھا۔ بطور نمونہ چند الفاظ لکھتا ہوں:۔

طَرَف کو طَرْف لکھا ہے یہ درست سہی مگر اردو میں اب استعمال نہیں ہوتا ؎

تجھے انشا اور تو کیا کہوں وہ جہاں ہیں کوئی بھی عنقا ہے جو خدا کے نور سے پُر نہو کہ محال دہر میں ہے خلا

"پہنچ" کو "پونچ" باندھا ہے ؎

ہرگز جہاں نہ پونچ سکے طائرِ خیال ہے کاخِ فضل کا ترے یہ عظم و ارتفاع

اگلے شعر میں 'آہ' کی 'ہ' یا 'اے' کا 'الف' تقطیع سے گرتا ہے ؎

یہاں دل میں اور ہاتھ میں ہیں لاکھ داغ و گل آہ اے بہار کس کو تمنائے باغ و گل

'آہ اے' کی بجائے 'آہے' پڑھا جاتا ہے۔ شاید کہا جائے کہ یہ جائز ہے۔ اگر جائز بھی ہے تو مکروہ ضرور ہے۔ الف کو ہ کے ساتھ حذف کرنا نہایت ناگوار ہوتا ہے۔

'سمجھے' کو 'سمجے' باندھا ہے ؎

شوق سے سویئے سر رکھ کے مرے زانو پر اس کو مت سمجئے کچھ خوف و خطر کا تکیہ

آپ کے یہاں بھی اوق الفاظ کافی ہیں مثلاً تسطیح، شطیح و نطیح، شیخ، مطارع، مشعبد، ذنب الغار، قنطرا، سعالِ مرمن فلفل، صخرۂ جنی، احراق، شیر اجم، تفرعن، قوارع، یبروج، قور، بیرق، زیبق، طاغوت وغیرہ وغیرہ۔ ان الفاظ کی گرانی اظہر من الشمس ہے اور غزل میں ایسے الفاظ ناگوار طبع ہوتے ہیں۔

آپ نے بعض الفاظ ایسے لکھے ہیں جو آج کل گنوار لوگ استعمال کرتے ہیں یا کم از کم ثقات نہیں بولتے مثلاً جھکڑا، سوندھ ساندھ، کھ بھاٹ، جھڑ بدلی، ہنسوڑا وغیرہ۔

آپ نے ایک فارسی شعر کا ترجمہ اپنے شعر میں کیا جس سے فارسی شعر کی عمدگی جاتی رہی ہے۔ جب ترجمہ برا ہو تو اسے سرقہ کہنا جائز ہے ؎

غلط ہے آہ کہ ہے دل کو دل سے راہ نہیں کہ تیری چاہ مجھے تجھ کو میری چاہ نہیں

فارسی شعر کیسا اچھا ہے ؎

غلط است آں کہ گویند کہ بدل ہست دل را دل من زغصہ خوں شد دل تو خبر ندارد

بعض الفاظ آپ نے ایسے استعمال کئے ہیں جو بول چال میں تو ضرور استعمال ہوتے ہیں لیکن تحریر اور خصوصاً نظم میں آجکل لوگ نہیں لکھتے مثلاً پکھیرو، تہ، تندیلا، کھڑ بیچ، اینڈے گا، کھوسٹ وغیرہ وغیرہ

آپ نے اپنے نزدیک سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنا بھی جزو شاعری خیال کیا ہے۔ اگر

آپ عمدہ مضامین نکالتے اور قافیے خوب بٹھاتے تو کم ازکم آپ کی جولانی طبع کی ضرور داد دی جاتی لیکن آپ نے ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا ہے جو آپ کے رکیک خیالات کے لیے توموزوں ہے مگر اچھے مضامین نہ ایسی ردیفوں اور قافیوں میں کوئی لکھے گا اور نہ لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جدت تو ضرور ہے کہ دیگر شعراء سے آپ کی زمینیں مختلف ہیں لیکن محض اختلاف تو کسی کام کا نہیں جب تک کہ ان میں کارآمد مضامین بھی نہ باندھے جائیں اور شعرائے ماسبق سے بڑھ چڑھ کر علوئے تخیل نہ ہو۔ ذیل میں آپ کی چند زمینوں کے نمونے دیے جاتے ہیں:۔

جبل میں بٹھا یا۔ بغل میں بیٹھا۔ پہاڑ غش کیا۔ کیواڑ غش کیا۔ بناوٹ سے غش کیا۔ جیٹ سے غش کیا۔ نبیڑے جا۔ چھیڑے جا۔ باغ ٹھنڈا۔ چراغ ٹھنڈا۔ مال بوسہ کا۔ سوال بوسہ کا۔ بلبل کا منہ چڑایا۔ قلقل کا منہ چڑایا۔ سنگ میں کیڑا۔ انگ میں کیڑا۔ اسی طرح میں فرماتے ہیں ؎

زاہد جو چپک جائے تو جوں کرمک شب تاب — دے بھیج کوئی...... بر تنگ میں کیڑا

چاند نکلا۔ پھاند نکلا۔ گہرا پردا۔ اکہرا پردا۔ کوہ قاف کا جوڑا۔ اوصاف کا جوڑا۔ کواڑ خوب۔ پچھاڑ خوب۔ زنداں سے لپٹ۔ اسیراں سے لپٹ۔ رکاوٹ سے لپٹ۔ کروٹ سے لپٹ۔ داغ کو چوٹ۔ زاغ کو چوٹ۔ طرحدار کی گیند۔ دستار کی گیند۔ خاک اینڈ اینڈ۔ تاک اینڈ اینڈ۔ جادو پہ اتنا گھمنڈ۔ گیسو پہ اتنا گھمنڈ۔ پھاڑ کر۔ گاڑ کر۔ نازنیں نہ چھیڑ۔ نہیں نہ چھیڑ۔ زلف رسا کو چھیڑ۔ کافر بلا کو چھیڑ۔ او بے لحاظ۔ رہو بے لحاظ۔ گھونگٹ عاشق۔ جیٹ جیٹ عاشق۔ اوجڑ عاشق۔ دھڑا دھڑ عاشق۔ سمٹ رہے ہوں۔ لپٹ رہے ہوں۔ جھاڑ میں۔ پہاڑ میں۔ گھمنڈ کرتے ہیں۔ ڈنڈ کرتے ہیں۔ آڑ میں۔ پہاڑ میں۔ گڑیاں باغ میں۔ چھڑیاں باغ میں۔ پہاڑ باندھ۔ جھاڑ باندھ۔ موڑ دیکھ۔ مروڑ دیکھ۔ پرے بیٹھ۔ ارے بیٹھ۔ جمپٹ گئے۔ رپٹ گئے۔ گدگداہٹ ہے۔ سجاوٹ ہے۔ کڑی کڑی۔ اڑی اڑی۔ توڑ بیٹھے۔ جوڑ بیٹھے۔ پڑگئی۔ رہ گئی۔ ران میں چٹکی۔ جان میں چٹکی۔ جوڑے اڑگئے۔ گھوڑے اڑگئے۔ رنگ اڑے۔ ڈھنگ اڑے۔ تاڑ توڑے۔ جھاڑ توڑے۔ کڑی مجھ سے لڑی۔ گھڑی مجھ سے لڑی وغیرہ وغیرہ۔

بعض بعض فارسی ترکیبیں بھی کانوں کو ناگوار گزرتی ہیں اور آجکل مروج نہیں ہیں مثلاً ع

بروان ساقی کو فرا سرخم کو پیر مغاں ہلا ع کبھی تو از پہر سیر کیجے بسوئے بیت الصنم نوازش ع نادر ملک

حسن میں آپ بسن جاؤ۔

جہاں ہم نے آپ کے اتنے عیوب ظاہر کئے ہیں وہاں ہم پر لازم ہے کہ آپ کی خوبیاں بھی بیان کریں اگر کچھ ہوں بقول کیکہ عیب او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔

آپ کے یہاں عربی جملے اس صفائی اور بے تکلفی سے اشعار میں کھپ گئے ہیں کہ اب ان کا باندھنا آسان نہیں ہے مثلاً

ع کہ اگر الستُ بربکم تو ابھی کہے تو کہیں بلیٰ ۔ ع نہ وہ لن ترانی ادھر کی سن ارنی ہی کہنے پہ جی چلا

اے عشق مجھے شاہد اصلی کو دکھا لا — تم خذ بیدی وفقک اللہ تعالےٰ

انھیں بھوک پیاس سے کیا غرض وہ جو قید تن سے ہوئے جدا

ثمر جناں انھیں دیویں گے وا توبہ منتشا بہا

ع ۔ بہت ان کو لکھو ہیں تو والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ ع لگا القاص سے ہے لایحب القاص کا جوڑا

معنیٔ آیۂ لا اسئلکم سید نا — جو نہ سمجھے تو وہ اسلام کے لشکر میں نہیں

کہوں بقید قسم لا الٰہ الا اللہ — کہ اب بجز اس اب مجھ میں لے الٰہ نہیں

آیۂ اینما تولوا کا — ماحصل خوب کرکے کد دیکھو

پڑھو آگے فثم وجہ اللہ — یعنی اس قول کی سند دیکھو

بس یداللہ فوق ایدیہم — چپکے سے پڑھ لو انکو جد دیکھو

اے عشق جلوہ گر ہے خود تجھ میں ذاتِ مولا — والسابحات سبحاً فالسابقات سبقا

سبزا اگر چہ پڑھا نا منظور صبح دم ہو — تو بیجے برگ کوئی والناشطات نشطا

آپ کے یہاں مقامی رنگ تو بکثرت موجود ہے اس کا ذکر ہی کیا لیکن مثالاً چند اشعار درج کئے دیتا ہوں :۔

دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے — جس طرح کوئی بھونرا ہووے کنول میں بیٹھا

لیا گر عقل نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا — تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

گر حکم ہو تو سائیں سلفے کا دم لگا کر ‏ ‏ پھنکاروں اور بھی میں سبزی کا ایک کونڈا

عکس لب جاں بخش سے جوں بیر بہوٹی ‏ ‏ پھرتا ہے پڑا ایک قدح بنگ میں کیڑا

کپڑے کے پر انگیا میں لگا رادھکا بولی ‏ ‏ ہے کشن یہ کاٹے گا مرے انگ میں کیڑا

چل نہ اتریوں میں جھولیں لیں درختوں کی ہوا ‏ ‏ چھا گئی کالی گھٹا ہے تیرہ بختوں کی ہوا

جہاں کے تھے راجہ بھرتری جی کنوان ستانے کو وہاں کسی نے ‏ ‏ زمین کھودی تو ایک جوگی دھرے ہوئے سر پہ ناند نکلا

تمھورا کے جو محلوں کی ہو کوئی آکھ کی ٹرھیا ‏ ‏ بنے وہ آکے بوڑھے اور بڑے نداف کا جوڑا

نہ کیوں کر بن کے بن ٹیسو کے پھولوں کے نظر آویں ‏ ‏ جو جنگل جی سے جوگی آپ لیویں بھاگ کا جوڑا

مہاراجہ جہاں چگتے تھے موتی ہنس کے جوڑے ‏ ‏ وہاں کا اب شری ٹھاکر بنا ہے کاگ کا جوڑا

تمھارے بیٹھنے اور بلنے کے غل کرنے کو سن لیوے ‏ ‏ نہ دیکھا جن نے ہو پیپل تلے کے بھوت کا جوڑا

آپ نے ہندی الفاظ بھی نہایت خوبی کے ساتھ باندھے ہیں لیکن شکایت وہی ہے کہ مضمون کچھ نہیں:۔

جو لوگ تشریف لے سدھارے عدم کو انکی ملی خبر کیا ‏ ‏ سنو اچنبھا کہ جیتے ہی ملا نہ ہم کو سراغ اپنا

جام مے عشق آنکھ موند پی جب ‏ ‏ ہے ایک ہی گھونٹ کڑوا کسیلا

غزل لکھ اب انشا تو ایک اور بھی ‏ ‏ کہ یہ قافیے ہیں انوکھے اچھوت

دم ذرا سادہ کے لیتے ہیں پھر تری تو ابھی ‏ ‏ سوتن کھینچے ہوئے لاہوت کو جا سکتے ہیں

مفت میں گل کھا کے تیہا آپ ناحق لڑ پڑے ‏ ‏ نرگستاں سے جو میری آنکھیں تر یا باغ ہیں

گو برگنیش تو ندہی ایسی ہے شیخ کی ‏ ‏ نسبت نہ ہووے بھینس کو جسکے شکم کے ساتھ

دوں دم میں ندا آ باندہ اسے چاندنی کو سونپ ‏ ‏ رکھے ارتبیج جو کہ اسام امم کے ساتھ

دیکھے ترے جلوے کو باہمن کی جو بیٹی بھی ‏ ‏ مونھ سے وہیں کلمہ کو یکبار لگے جپنے

آپ کے یہاں بعض غزلیں مسلسل بھی پائی جاتی ہیں مثلاً

ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے سہ کریم جلد کرم کر کہ ہو مزاج صحیح ‏ ‏ برنگ نرگس بیمار ناتواں ہوں صریح

دوسری غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎ بہار ہو کے مجسم بوضع بادلہ پوش ہوئی جو آکے خیاباں میں مجھ سے ہم آغوش

تیسری غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎ لہرا دیا صبا نے جو گل سبزہ زار کو دوہیں گھٹا نے گھیر لیا چشمہ سار کو

یہ غزلیں جہاں مسلسل ہیں وہاں پایۂ تہذیب سے بھی گری ہوئی نہیں ہیں۔ نہیں معلوم ہمارے یہاں مسلسل غزلوں کے لکھنے کا کیوں رواج نہیں رہا۔ اگر بغیر مطلع کے قطعہ لکھا جا سکتا ہے تو مطلع کے ساتھ مسلسل غزل لکھنے میں کیا قباحت ہے؟

آپ کا دیوان ریختی تو اس قابل ہی نہیں کہ اس کا کوئی ذکر کیا جائے البتہ آپ کے قصائد برے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں بھی آپ کی ظرافت اور رکاکت کہیں کہیں جلوہ گر ہو جاتی ہے تاہم غنیمت ہیں۔ لیکن کوئی خاص بات ایسی نہیں جس سے آپ کے قصائد درجۂ امتیاز حاصل کر سکیں۔

آخر میں آپ کے کلام سے جو صاف اور شستہ اشعار ہم کو نظر آئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا	۱	تو ڈھونڈھتا ہے جس کو ہے وہ بغل میں بیٹھا
ہر چند کہ عاصی ہوں پر امت میں ہوں اسکی	۲	جس کا ہے قدم عرش معلےٰ سے بھی بالا
مکھڑے پہ اسکے صرف نہ بلبل نے غش کیا	۳	چٹ چٹ بلائیں غنچوں نے لیں گل نے غش کیا
کر جبر جہاں تلک تو چاہے	۴	میرا کیا اختیار تیرا
دست جنوں سے اسے ولے دیلا	۵	سونے نہ پائے ٹک پاؤں پھیلا
لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا[۱]	۶	جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا
اس ہستیٔ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا	۷	واللہ کہ اس سے ہے مراتب عدم اچھا
دست جنوں سے اپنے گریبان صبر کو	۸	اے عشق تار تار کیا ہم نے کیا کیا
بیتابیٔ دل کے سبب اس شوخ تک انشا	۹	پہنچے ہے بلا واسطہ پیغام ہمارا
نہ کہہ تو شیخ مجھے زہد سیکھ مستی چھوڑ	۱۰	تری پسند جدا ہے مری پسند جدا

۱؎ یہ غزل کلیات انشا میں درج نہیں ہے جو ہمارے پاس ہے۔ آبحیات میں درج ہے۔

مجھے کیوں نہ آئے ساقی نظر آفتاب الٹا ۱۱ کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب الٹا

چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم کے عاشق ۱۲ نہ ہوا ثواب حاصل یہ لیا عذاب الٹا

فقط اس لفافہ پہ ہے کہ خط آشنا کو پہنچے ۱۳ تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹا

جو شخص جبہ سا ہو خدمت میں یاں تمھاری ۱۴ کیونکر نہ پھر وہ دیکھے لاہوت کا تماشا

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں الله سے ۱۵ واسطے دو دن کے عرش کبریائی انگتا

زاہد مرے مولا کے اسرار نہیں پاتا ۱۶ غافل اسے کیا یاوے ہشیار نہیں پاتا

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا ۱۷ ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

جس شخص نے کہ اپنے نخوت کے بل کو توڑا ۱۸ راہ خدا میں اس نے گویا ہبل کو توڑا

اپنا دل شگفتہ تالاب کا کنول تھا ۱۹ افسوس تو نے ظالم ایسے کنول کو توڑا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی ۲۰ بھول جاتا ہوں و لے تیری مدارات کے وقت

بیان ذات کے اوصاف کس سے ہوں آتش ۲۱ صفات جس کی ہیں حامل عرش ہیں مبہوت

گر یہ چھٹنے کی خبر سچ ہے تو قیدی تیرے ۲۲ خوب سر مار دیں گے دروازۂ زنداں سے لپٹ

اب خیر و عافیت تو لگا مجھ سے پوچھنے ۲۳ اتنا تو بارے نرم ہوا یار کا مزاج

ہے یہاں وہ نخل عشق میں دیوانہ پن کی شاخ ۲۴ جس سے اُگی نہال اویس قرن کی شاخ

ابتدائے دوستی میں دل کو ہے یہ بے کلی ۲۵ کچھ نظر آتا ہے اس آغاز کا انجام بد

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھنی ایک چونچ ۲۶ بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر ۲۷ فعل بد تو ان سے ہو لعنت کریں شیطان پر

مجھے رونا آتا ہے شمع سحر پر ۲۸ کہ بیچاری اب مستعد ہے سفر پر

پیر مغاں کسی کو نہ تو تشنہ کام چھوڑ ۲۹ تحقیق خاص و عام برائے عوام چھوڑ

ہو جائے اگر جہاں فراموش ۳۰ کب دل سے ہو دلستاں فراموش

مطلق نہ آشنائیِ دنیا پہ کر گھمنڈ ۳۱ ظاہر پرست ہوتے ہیں سب آشنا غرض

سلطنت بیچتے ہیں دردکشاں خاک کے مول ۳۲ ہے یہاں سایۂ ہما کا خس وخاشاک کے مول

بھر رہے ہیں یوں پھپولے اس دل صدچاک میں ۳۳ آ رہے ہوں خوشۂ انگور جیسے تاک میں

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں ۳۴ کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں ۳۵ بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ۳۶ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں ۳۷ نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

کہاں گردش فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا ۳۸ غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجیے ۳۹ زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

جبتک کہ خوب واقف راز نہاں نہ ہوں ۴۰ میں تو سخن میں عشق کے بولوں نہ ہاں نہ ہوں

کفالت رزق کی کس سے کسی کی ہو سکے انشا ۴۱ صفت مخصوص ہے یہ تو فقط اس ذات باری میں

حسرت و ارماں یاس و تمنا درد و فراق و رنج و تعب ۴۲ اپنے سر پر آتی بلائیں ناحق اے دل جھیل نہیں

حرم سے دیر میں یہاں آب و دانہ لے آیا ۴۳ برب کعبہ مرا اس میں کچھ گناہ نہیں

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو ۴۴ بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

کوئی اس دام محبت میں گرفتار نہ ہو ۴۵ اے خدا یہ تو کسی بندہ کو آزار نہ ہو

ہو جو انشا کو اجازت تو بھرے وہ نالہ ۴۶ کبھی بلبل کے فرشتوں کو بھی جو یاد نہ ہو

گرچہ ہم سخت گنہگار ہیں لیکن واللہ ۴۷ دل میں جو ڈر ہے ہمیں ہے اسی ڈر کا تکیہ

چند مدت کو فراق صنم و دیر تو ہے ۴۸ چلیے پر کعبہ بھی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

آنے اٹک اٹک کے لگی سانس رات سے ۴۹ اب ہے امید صرف خدا ہی کی ذات سے

جنوں کے رہ نوردوں کا کوئی لگتا کہیں دل ہے ۵۰ بسانِ گردباد ان کو سدا قطع منازل ہے

ہمصفیران چمن دیکھیے کیا ہوتا ہے ۵۱ آج صیاد پھر آیا قفس و دام لیے

کیا کیا آہِ ناتواں تو نے ۵۲ آگ سی پھونک دی یہاں تو نے

گالی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی ۵۳ سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہو تم ۵۴ میری طرف کو دیکھیو میں نازنیں سہی

لب پہ آئی ہوئی یہ جان پھرے ۵۵ یار گر اس طرف کو آن پھرے

پھر کچھ گئے ہوؤں کی مطلق خبر نہ پائی ۵۶ کیا جانیے کدھر کو جاتا یہ قافلہ ہے

بارِ گراں اُٹھانا کس واسطے عزیزو ۵۷ ہستی سے کچھ عدم تک تھوڑا ہی فاصلہ ہے

جو نسیم صبح لپٹ گئی کسی گل کے دامن پاک سے ۵۸ تو شعاعِ مہر نے اک چھڑی جڑی اسکو آکے شتاک سے

لے اشک گرم کر مرے دل کا علاج کچھ ۵۹ مشہور ہے کہ چوٹ کو پانی سے دھارے

مخدوم پیر مرد جہاں گشت کی نمط ۶۰ اپنا خیال بھی یہ جہاں گرد ہی سو ہے

بولے ہی سہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں ۶۱ بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز ۶۲ رچی ہوئی جو پہاڑوں کے آبشار میں ہے

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے ۶۳ کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہزار طرح کی فکریں خراب کرتی ہیں ۶۴ غرض نہ پوچھو کہ انسان کس لتاڑ میں ہے

گھر آئے شور سے دل بادل آج دیکھ انشا ۶۵ کہ بے طرح سے پھنسی رق بھیڑ بھاڑ میں ہے

کر بیٹھے وہیں بفضل خدا ساز پہ تکیہ ۶۶ جب بن نہ پڑے بات کچھ اپنی تگُ دوسی

مل گئے پر حجاب باقی ہے ۶۷ فکرِ ناز و عتاب باقی ہے

یہاں زخمیٔ نگاہ کے جینے پہ حرف ہے ۶۸ ہے دل پر اپنے زخم کہ سینے پہ حرف ہے

غیر کے اک اشارے پر اٹھ گئے میرے پاس سے ۶۹ تس پہ یہ مجھ سے پوچھنا بیٹھے ہو کیوں اُداس سے

سچ یہ آفت تری یہ دھج یہ خوشش اندامی ہے ۷۰ کہ نظر بھر کے تجھے دیکھیں تو بدنامی ہے

غصے میں نرے ہم نے بڑا لطف اٹھایا ۷۱ اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہوگئی ۷۲ دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہوگئی

قاضی جی

رخصتی کی تیاری اور جہیز کا جائزہ

اس مضمون کی چند قسطیں رسالہ ادب لکھنؤ کے جولائی، اگست، دسمبر ۳۱ء اور جنوری، فروری مارچ ۳۲ء کے نمبروں میں چھپ چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ ملک کی ناقدردانی سے ادب جیسا پاکیزہ رسالہ بند ہو گیا اور یہ مضمون ناتمام رہ گیا۔ ہم اس کا بقیہ حصہ جس کا ارباب ذوق کو بہت اشتیاق ہے شائع کرتے ہیں۔

کھانے سے چھٹی ملی، قاضی صاحب کے بھائیوں نے رخصتی کے تقاضے شروع کئے، جہیز گھر سے نکلنے لگا، جوڑے باگے، خوان، خوان پوش، صندوق، پٹیاں، قطی، پٹارے، دری، چاندنی، فرش فروش، دیگ، دیگچیاں، لوٹے، لوٹیاں، کٹورے، کٹوریاں، گھڑے، مٹکے، منجھولے، اگگرے، تتیرے، گھڑونچی، بجھرے، پتیلیاں، رکابیاں، لگنیں، سینیاں، جیبی، سلفچی، آفتابے، مقابے، گلدان، شبودان، اگالدان، حسن دان، گلوری دان، خواصدان، پاندان، منجن دانی، ابٹن دانی، سرمہ دانی غرضکہ نہ جانے کتنے دان اور کتنی دانیاں وغیرہ وغیرہ سب کچھ تھا۔ قاضی صاحب باہر مسند پر جلوہ افروز ہیں۔ دلھن والے جہیز نکال نکال کر قاضی صاحب کے سامنے ڈھیر لگاتے جاتے ہیں۔ حضرت نا' باتیں اگرچہ رفقا سے کر رہے ہیں، مگر کن انکھیوں سے جہیز کا جائزہ بھی برابر ہوتا جاتا ہے اور مصرف صحیح کا تعین بھی ابھی سے دل میں کرتے جاتے ہیں۔ خوش سلیقہ ہونا بھی کیا بات ہے۔ قاضی صاحب کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ اس تلاش، اس جائزے میں جو قاضی صاحب نے ڈھونڈھ نکالا اس میں بہت کچھ تنہا انھیں کے لئے باکار نکلا جیسے حقہ کا سامان "لب معشوق" صرف قاضی صاحب کی لب نوازی کر سکتا ہے۔ بی بی صاحب کو عادت نہیں، نہ قاضی صاحب عادت ہونے دیں گے کیونکہ دیہاتی شرفا میں عورتوں کا حقہ پینا ممنوع ہے۔ بہت کچھ بی بی ہی کے لئے ضروری ٹھہرانا پڑا جیسے چھوٹے کپڑے۔

فرض کرو قاضی صاحب اگر بہن بھی لیں تو اس کی خلائیں کیا رکھیں گے۔ اس لئے بیکار ٹھہرا۔ یا جیسے بڑے پائنچوں کا پیجامہ، شاہی میں اگرچہ مردانہ وضع شرفا میں داخل تھا، تذکیرو تانیث کے کھبیڑے نہ تھے مگر اب متروک ہے۔ لشاء اللہ قاضی صاحب اپنے کو مذکر سمجھتے ہیں پہننے سے رہے۔ مگر زیادہ حصہ دونوں کی "رفع حاجات" میں مشترک قرار پایا۔ مثلاً مثلاً پنہانے کا لوٹا، دونوں طہارت کر سکتے ہیں، پنہانے کی چوکی، دونوں کے لئے "بلاخطرہ" اجابت گاہ ہے۔ پلنگ پر دونوں برابر برابر سو سکتے ہیں۔ لحاف میں جوڑے کا جوڑا ملفوف ہو سکتا ہے۔ سرمہ دانی دونوں کو تحریم سنت کے قیام کا موقع دے سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ البتہ ان سب چیزوں میں سب سے پہلے جو شے قاضی صاحب مشترک مصرف میں لائیں گے وہ پلنگ ہے۔ اس لئے اس کا جائزہ بھی قاضی صاحب نے بنظر غائر لیا۔ جتنا غور کرتے ہیں کیا دیکھتے ہیں، نرم نرم توشک، اس پر سفید چادر، نئی روئی کا چھپا ہوا لحاف، گدگدے تکیے، کھنچا پلنگ۔ قاضی صاحب کے خواب میں بھی کبھی ایسا بستر نہ آیا تھا، آج اس پر آرام مع دلارام کے خیال سے "شغال دل" قبل از وقت رال ٹپکانے لگا۔ باچھیں کھل گئیں

دلھن کی رخصتی

جہیز گھر سے برآمد ہو چکا۔ قفس ڈیوڑھی میں لگائی گئی۔ قاضی صاحب کی طلبی اندر ہوئی۔ ڈومنیوں نے "بابل" شروع کی تھی ع بابل مورا نیہر چھوٹا جائے۔ ابھی ابھی دو ہی ایک کڑیاں گانے پائی تھیں کہ حضرت اندر داخل ہوئے۔ دلھن کے پلنگ کے پاس پہنچ کر رکے۔ بابل خود بھی سننے لگے۔ سب عورتیں بابل سن کر اپنا اپنا وقت، اپنا اپنا زمانہ یاد کر کے "گریۂ شادی" میں ساون بھادوں برسا رہی ہیں۔ اللہ رکھے ایک تو قاضی صاحب کا "مزاج شاعرانہ" طبیعت گداز تھی ہی، اس پر زنانخانے کی ہوا جو لگی، پھر تاب ضبط کجا، سب عورتوں کے ہمنوا ہو کر چھاجوں برسے۔ بارے ڈومنیوں کی بھول کی بدولت "بابل" ختم ہوئی۔ عورتوں نے بھی ضبط گریہ کیا۔ حضرت کے بھی آنسو پاک کئے گئے مگر ہنوز اثر باقی ہے یعنی بسورر ہے ہیں۔

حمالی عروس

بابل ختم ہوئی تو بڑی بوڑھیوں نے کہا۔ میاں نوشاہ بنے، بسم اللہ کرو، خدا تم کو اسی طرح

ن کا "بار" اٹھانا نصیب کرے۔ قاضی صاحب ابتک اثر رقت سے حواس باختہ، یہ ہوش کہاں کہ اپنے قطعی گز بھر قامت کا اندازہ اور دلھن کے پانچ ہاتھ لمبان کی جانچ پڑتال کر کے ہاتھ ڈالتے۔ بلا سوچے سمجھے جامے کے دامن گردان جھک کر بوڑھیوں کے کہنے کو خدائی فرمان سمجھ کر حمالی عروس میں منہمک ہی تو ہوگئے۔ اب ننھے منے ہاتھوں میں جتنا پھیل سکے بقچہ عروسی مستحکم گرفت کر کے لگے ہمک ہمک کر زور لگانے۔ دو چار زور "بحیال خویش" کوہ شکن مارے مگر لنگر بھاری تھا۔ قاضی صاحب کے "قد و قامت" "قوت و طاقت" سے بالاتر نکلا۔ گو ہمت شادی ابھارتی رہی اور قاضی صاحب ٹھہر ٹھہر کر زور لگاتے رہے مگر وہ ٹس سے مس نہ تھا نہ مسی۔ اب سمجھے کہ کہیں یہ "بھاری پتھر" چوم کر چھوڑ نہ دینا پڑے۔ مایوسی کا پوڈر رخ قاضی پر پھرنے لگا۔ بحسرت بوڑھیوں کی جانب نگراں ہوئے۔

بوڑھیوں کی سفارش

بڑی بوڑھیوں نے جو قاضی صاحب کی یہ تنگ ہی کا کمزوریاں دیکھیں اور اس پر یہ "ناکامی" "قلق" ترس سے بیقرار ہوگئیں۔ دو ایک "خنگی" "مضبوط" بی بیوں کو جو پاس ہی کھڑی ہوئی تھیں ملامت کی "ارے تم سب دیکھ رہی ہو۔ لڑکا تھکا جاتا ہے اور تم سہارا نہیں دیتیں"۔ غرض کہ سات پانچ کی لاٹھی اور کسی کی بھینس "عروسی بورہ" چار پانچ عورتوں نے اکسایا۔ قاضی صاحب نے بھی "ہمک، ہمک" کر زور لگایا۔ "زیادہ حصہ" اپنے ہی اوپر لادا۔ ادھر ادھر سے عورتوں نے سنبھالا۔ خدا خدا کر کے بلا کسی حادثہ کے ہر طرح سے محفوظ یہ بار عظیم محبت "ہانپتے، کانپتے" گر گر کر سنبھلتے، اور محبت کی گراں گٹھری سنبھالتے، تھوڑی دیر کے لئے ضیق النفس میں مبتلا، جوں توں کر کے قاضی صاحب نے قفس میں لا ڈالا۔ قفس میں رکھ کر دم راست ہوئے ہیں، سانس ٹھہری۔

قاضی صاحب کی واپسی گھر کو دلھن بیاہ کر

ڈیوڑھی سے باہر آئے۔ "پونی" "بے آب وگیاہ" "بہ ہیئت اولیٰ" بلکہ اس سے کچھ حالت "بتر"

"منظر حالی" قاضی صاحب نے "بہ طرز قدیم" شہسواری فرمائی۔ اسی طرح "دستِ رفتار کی" "ٹمکا نیاں (بیاکھیاں)، وہی کبڑے کے ٹونڈے کی "کشاکشِ لجام" وہی "ٹونی مذکور" کے نحافت و نقاہت بھرے نخرے، وہی بہ تخیلِ قدیم رفتار سے گریز، آگے آگے باجا گاجا، اس کے پیچھے جہیز، اس کے بعد "عروسی ڈولا" اس کے پیچھے "تبیجے کچھے" باراتی، سب کے پیچھے "ٹوئی قاضی صاحب مع قاضی صاحب" ضرب چوب دستی کے "بل" پر پھونک کر قدم اٹھاتا۔ قاضی صاحب "حسب دستور نوشاہاں" شش جہتی بارشِ سلام فرماتے جس سے ذی روح، غیر ذی روح، زمین، آسمان، شجر، حجر حتیٰ یہ کہ مکانات راہ کے در و دیوار بھی مستثنیٰ نہ رہے رواں ہیں۔ "الحمد للہ خیر صلا" سے دلھن بیاہ کر گھر پہنچے۔ باندازِ قدیم نزول فرمایا غریب ٹونی حالی کی بیگار سے چھوٹ تو گیا مگر عمر بھر کے لئے "از کار رفتہ"۔

قاضی صاحب کا دلھن آتارنا اور رونمائی

قنس ڈیوڑھی میں لگائی گئی۔ دلھن آتارنے کے لئے "عورتوں کا ٹھٹھہ" دروازے پر لگا ہے۔ قاضی صاحب "لاگو جانور" کی طرح دوڑ کر پھر قنس کے پاس پہنچے اور پھر حمالی عروس پر مستعد ہوئے۔ "نسوانی امداد و اعانت" اور سابق کی "یاد گرفتہ" ترکیبوں سے دلھن اٹھا کر "مقامِ مقصود" پر رکھ آئے۔ عورتوں نے دلھن کی "رونمائی" کی رسم میں حتی الامکان دل کھول کر قاضی صاحب کے "زمانہ اسلاف" کا پشتینی قرضِ حسنہ بے باق کیا۔

قاضی صاحب کی کھیر چٹائی

رونمائی سے فراغت ہوئی تو قاضی صاحب کی کھیر چٹائی کے لئے اندر طلبی ہوئی۔ کہنہ سال مشاطہ نے دلھن کا ہاتھ پھیلا کر اس کی ہتیلی پر تھوڑی سی کھیر رکھی اور "کھیر کھا بنّے کھیر کھا" والا مجرب منتر منمنا منما کر "یک جان دو قالب" کرنے کے لئے پڑھنا شروع کیا۔ انشاء اللہ سات مرتبہ اس عمل کی تکرار ہوگی۔ قاضی صاحب اس وقت زیادہ تر مشاطہ کے "بے محل بخل" اور کسی قدر اپنی "نوشاہی حیا" سے دل گرفتہ اور متامل

تھے مگر کچھ تو مشاطہ کا کھیر کھا بنے کھیر کھا" گا گا کر ترغیبیں دینا اور کچھ گاتے ہوئے آنکھوں سے" حیا شکن" "کھیر نوش" اشارے کرنا اور سب سے بڑھکر دلھن کی ہتیلی پر کھیر رکھے ہونے سے "بیک کرشمہ دو کار" یعنی کھیر کھانے کے ساتھ ہی متواتر "بوسوں" کے چاٹ کے خیال نے کچھ ایسا گڑبڑایا کہ "خودی" اور "خود داری" نے اپنے کو "بے خودی" پر قربان کر دیا۔ اب قاضی صاحب "سر" بڑھا بڑھا کر" بلامنت دست" صرف "زبان" کی حرکتوں کے "سہارے" کھیر اڑانے میں "مصروف" ہیں اور اس شدت سے "مصروف" ہیں کہ مشاطہ کھیر رکھنے بھی نہیں پاتی کہ ان کے "سر و زبان" کی "سرعت حرکت" کبھی کبھی خیالی ہی مزے لے کر پلٹ آتی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے کھیر اگر سات مرتبہ رکھی گئی تو آپ نے کم سے کم چوبیس بار ہتیلی کو چاٹا اکیس مرتبہ پھر بھی بڑھے رہے۔

نماز عاشقاں اور باراتیوں کا شکریہ

کھیر چاٹ چکے۔ بڑی بوڑھیوں کو نماز عاشقاں یاد آئی۔ قاضی صاحب سے تقاضا ہوا کہ" میاں بنے" دو رکعت نماز شکرانہ تو دلھن کے دامن پر ادا کر لو۔ قاضی صاحب "کھیر آلودہ" "چپ چپا" منہ پاک کر رہے تھے "لگے ہاتھوں" بقول دیہاتیوں کے وضو بھی "بنا لیا" اور "ہم خرما اور ہم ثواب" کے مزے لوٹنے چلے۔ ایک بی بی نے دلھن کے دوپٹہ کا دامن فرش پر پھیلایا۔ نماز، اور پھر دلھن کے دامن پر، اللہ اللہ، نہ جانے کن کن منتوں، مرادوں سے یہ وقت نصیب ہوا تھا۔ ہمارے قاضی صاحب کا تہیہ تو ایک ہی سجدہ میں عمر تمام کر دینے کا تھا اور ایسا ہوتا بھی مگر باہر احبا، اعزہ، برادری والوں کا مجمع، جو اس گاڑھے وقت میں، آڑھے آئے تھے، ان کا شکریہ ادا کرنے کے خیال نے اس ناحق، جاں بحق ہونے سے روکا اور قاضی صاحب نے اس قدر پھرتی سے نماز عاشقاں کا دوگانہ ختم کیا ہے کہ اس مدت ہیں مداری صاحب کا "ڈنڑ پیل بندر" اپنی آموختہ ریاضت ہرگز پوری نہیں کر سکتا۔ مختصر یہ کہ اس طرح سے اللہ میاں کی نماز کو ٹال کر، شادوں شاد، نہالوں نہال، ہنستے، مسکراتے باہر آکر اعزہ، رفقا، باراتیوں سے جو مبارکباد مل رہی ہے اس کو دماغ میں ذخیرہ کرتے جاتے ہیں اور ایک ایک کا گڑگڑا گڑگڑا کر اس گاڑھے وقت

ہیں کام آنے پر اظہار تشکر کرتے ہیں اور نہیں تھکتے۔

قاضی صاحب چوتھی کھانے جاتے ہیں

قریب شام قاضی صاحب دلھن بیاہ کر گھر پہنچے تھے، تاریکیٔ شب بڑھنے لگی۔ یوم مسعود نیک تاریخ گزر جانے کے خیال سے دلھن والے متقاضی ہوئے۔ قاضی صاحب نے بھی تائید کی کہ آج ہی چوتھی کے جانے کی رسم ادا ہونا چاہئے۔ بارات پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ایک ہی قصبہ کا تو واسطہ تھا، چند منہ بولے سالے داس سے کہ قاضی صاحب کا کوئی اصلی خسر پورہ آج تک وجود میں نہیں آیا، چوپہلا لئے آ دھمکے۔ حضرتنا کی ابھی باہر ایک پلنگ پر نشست تھی، احباب کے مجمع میں گل افشانیاں کر رہے ہیں، اتفاقاً وہی حکیم صاحب جو افلاریں تھے پہلو میں ہم نشین تھے۔ اندرونی جذبات کے بھونچال میں ان کی حاضری قاضی صاحب کو غنیمت معلوم ہوئی بلا تامل ہاتھ بڑھایا۔ انھوں نے نبض پر ہاتھ پر رکھا۔ اب حضرتنا کا استفسار پر استفسار ہے کہ بھئی میرا کیا حال ہے۔ وہ عرض کرتے ہیں کہ حضت (حضرت) اور تو کچھ میری سمجھ میں آتا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ رگوں میں بجائے خون، بجلیاں کوندر ہی ہیں، جواباً فرماتے ہیں لاریب، آمنا، صدقنا، مگر اس کی وجہ اس وقت طبیب صاحب کا ناطقہ بھی، خر درگل، تھا۔ کیا کہیں، کیا نہ کہیں، آنادبی زبان سے عرض کیا کہ وجہ، سبب، علت، نائت تو حضرت ہی مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ غرض کچھ تم سمجھے کچھ ہم سمجھے ہو کر یہ قضیہ طاق نسیاں پر یوں رکھا گیا کہ کہاروں نے حسب عادت غل مچایا "ڈیوڑھی میں چوپہلا لگا ہے"۔ قاضی صاحب گوش برآواز تھے، ہوشیار ہو کر جلد جلد چوتھی میں چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں، بارہ ابرن، سولہ سنگھار، آراستہ پیراستہ، لباس ہنی مون سے مُطّوّنُر، بالکل ریڈی ہو کر نکلے، ادھر دلھن سوار ہوئی۔ کہاروں نے چوپہلا اٹھایا، ادھر قاضی صاحب مع رفقار دنبال عِنس ہوئے اور اسی تاریکیٔ شب میں کہاران صبا رفتار کے نقش قدم پر قدم جماتے، سنگ ہائے راہ سے الجھتے، ڈگتے، ڈگمگاتے، خاک راہ یار کو آنکھوں میں جا دیتے، گرد قدم کہاران کو طوطیائے چشم بناتے، کبھی کبھی شدت افتادگی میں سجدۂ تعظیمی، بی بی صاحب کا ادا فرماتے، رشتۂ زوجیت جس کا کنکشن "چوپہلے سے ہے" گلے میں ڈالے، اسی کے بل پر کھنچتے،

گھٹتے، رفتار کو ڈوریں فرلانگوں شکست دیتے "ابھی پورے پونے دس تھے کہ "بہشت دلآرا" میں داخل ہوگئے مگر "تکان گریز"، رفتار بے اختیار نگاپوئے غیر عادی سے قاضی صاحب کی ننھی سی شکمی توند دھونکنی بن گئی۔ پہنچتے ہی ہاتھوں ہاتھ لے لئے گئے۔ حضرتنا کی رسیدپر سسرال والوں پر جو بوکھلاہٹ خیر مقدم کی سوار تھی اُس نے قاضی صاحب کے اس فوری دمہ کے دورے میں مبتلا ہوجانے پر کسی کا خیال نہ جانے دیا۔ فی الحال ایک گوشۂ فرش پر شکن شیر دمی کر رہے ہیں۔ آمد و رفت نفس کی سرعت میں بتدریج کمی شروع ہوچکی تھی مگر پھر بھی باقی تھی کہ کسی قدر تاخیر سے رفتار پہنچے۔ پردۂ شب نے جو آثار تگاپو حضرتنا پر طاری وساری تھے اُن کی ستاری بہت کچھ کی، مگر سانس کی "ہینکاروں" نے حضرتنا کے کسی بلائے مُبرَم سے دوچار ہونے کی خبر دے ہی دی اور احباب کو استفسار پر مجبور کر ہی دیا۔ سب نے متفق اللہجہ ہوکر کہا "قاضی صاحب خیر تو ہے، کیا حال ہے؟" فرمایا "الحمدللہ" ع بر سر فرزند آدم ہرچہ آید بگزرد" قاضی صاحب اتنا ہی جملہ کہنے پائے تھے۔ وقت زیادہ آگیا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اب پورے دس بجے تھے۔

چوتھی کے کھانے

سسرال والوں نے دسترخوان بچھایا۔ "کندوری" کے "باقیات الصالحات" کھانوں کے علاوہ ساس، سالیوں، سلہجوں نے اپنے ہاتھوں کے مزے چکھانے، حضرتنا کے رجھانے کی خاطر جو جو نعمتیں پکی تھیں ان کی بوقلمونی اور رنگا رنگی سے دسترخوان صرف نمونۂ گلزار نہیں بلکہ قاضی صاحب کی آرزوؤں کے غٹ کی طرح بچی کھچی کندوری میں غیر معمولی اضافوں سے کھچا کھچ بھرا ہی ہے، تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ حضرتنا مع رفتار گرد دسترخوان جمے، دست شوئی ہوئی۔ قاضی صاحب نے اب گہری گہری نظروں سے کھانوں کے رنگ و روپ کو دیکھ کر ان کے مزوں کا اندازہ لگایا، غالباً حس کے خیالی مزے زبان پر بھی آنے جانے لگے، اس پر طرہ یہ کہ دل ہی دل میں ان کی تعداد کا شمار بھی شروع کردیا۔ اب سنئے کہ غذاؤں کی کثرت تعداد کے ساتھ ان کی نفاستیں، ان کی خوشبوؤں کی لپٹیں، آپ کی خوش غذائی، طعام تلاشی شہوت صحیح معدی، مناسب موقع، سسرال والوں کا اصرار، دمبدم بسم اللہ کی پکار بڑھائے

دے رہی ہے اور ہمارے حضرت کا تحمل بھی عنان گسیختہ، "واصل بہ یقین" ہوتا جارہا ہے بگوارش و رغبت تمام
آمادہ و مستعد بھی ہیں کہ "ہرچہ بادا باد" مرغی اور ریٹ والی کارروائی جاری کریں مگر پھر بھی کچھ ایسا ہے جس سے
حضرت کی طبع معلیٰ کا "خورندہ ٹٹو" "سندا" پڑا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ جبر یہ ہی کیوں نہ ہو قاضی صاحب
روٹھے ہیں۔ حضرت یہ روٹھنا کیسا، اس وقت یقیناً قاضی صاحب کی حالت قابلِ رحم ہے۔ وہ غریب اس
"ناشدنی" مصنوعی رسم کی جان کو جو فی الحال عناں گیر دست، دہانی چھینکا بن کر صحیح جذبات خورندگی کا
ملیامیٹ، خون ناحق کر رہی ہے، رو رہے ہیں۔ گریہ "ناکردنی" کرنی تھی اس لئے کہ جوتھی روٹھنا اور وہ بھی
تادیر ضروری ہے۔ یہ رسم یوں ہی ہوتی آئی ہے، "جلب نفع" اس کی تاخیر ہی میں مضمر ہے اور یہ بھی تھا کہ
قاضی صاحب اب تک بے شادی کے ہر قانون پر ایک "امن پسند" تابع آئین کی طرح عامل رہے، نہ
"ادھر بھر ادھر ہٹے" نہ "ادھر بھر اُدھر ہٹے"۔ اس رسم میں "میرڈ ڈبس اوبیڈینٹ" بنکر واویلا کیوں کر
کریں، ہاں ایک بات ہے، اتنے کھانے اور "ایسے کھانے" اور اس پر ستم یہ کہ "آنکھوں کے سامنے"
(جن کی خاطر آپ کا بیشتر حصۂ عمر "تنور" ہی میں گزرا۔ جن کے لئے کوئی عزیز، کوئی دوست، کوئی آشنا،
کوئی شناسا، منتہیٰ یہ کہ گاہے گاہے غیر شناسا بھی چار دانگ ہند میں ایسا نہ بچا کہ جس کو بادل خواستہ یا ناخواستہ،
بطلب یا بلاطلب آپ کا "شرف میزبانی" نہ نصیب ہوا ہو) اب خواہش خورندگی کی لپک اور للک اور
رکاوٹوں کے "اینٹک" میں جو گتھم گتھا اور گھمسان پڑے ہیں ان کی بے چینیاں اور بے قراریاں دیدنی ہیں۔
بے کل ہو رہے ہیں، جماہی پر جماہی نہیں آتی، نہیں معلوم "کس خیال" میں "منہ کھول کھول کر" رہ جاتے
ہیں۔ جماہی کے ساتھ پانی منہ میں بھر آتا ہے۔ "اس روٹھنے کی لعنت پر" "آخ تھو" راہبانہ ساخت
سے اگالدان پر کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد سسرال والوں کے اصرار میں جس قدر ترقی ہے اسی قدر
آپ کی بے چینیاں بھی آپے سے باہر ہیں، غرضکہ حال کیسا، بے حال ہیں۔ "دل کی تو اللہ جانے" ظاہر
میں قاضی صاحب کھانا دیکھتے ہیں اور ڈرتے ہیں، بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں، پھیلتے ہیں اور سکڑتے ہیں،
کھنچتے ہیں اور سمٹتے ہیں، اُبھرتے ہیں اور دبتے ہیں، کسمساتے ہیں اور رہ جاتے ہیں، ابھی کسی پہلو تھے، کہ نیا
پہلو ڈھونڈھا، اس بھل تھے، کہ اس بھل رکے۔ یہ زانو تھا کہ وہ زانو بدلا، "اضطراراً" ہاتھ سوئے

لقمہ دراز ہوا، کہ کسی خیال نے کے آتے ہی کھنچا۔ رفقا بھی، پرگھر کا خیال، آداب خورش کی جکڑ بندیاں، لحاظِ ناموس میزبان، پاس ہمراہیِ حضرت، اہمیت موقع کے ٹسکتے (چھینکے) منہ پر چڑھائے "جبری مقاطعہ جوعی" کئے اپنی اپنی طبیعتوں کے بے چین، بھوکا ڑے (مر بھکے) یونیوں کی لگامیں کھینچے، تانے حضرتنا کے ہم عناں ہیں اور آپ کے ان میمونی حرکات کے فقط تماشائی نہیں بلکہ صبر کی بھاری سلیں چھاتی پر رکھے، مقاطعۂ جوعی کے گراں تھرمیٹوں سے باندھے آپ سے لپے جمے ہیں۔ سسرال والوں کا اصرار بڑھنے لگا "قاضی صاحب بسم اللہ، حضرتنا نوش فرمائیے" مگر قاضی صاحب کی گردن بخوف قانون شکنی، مجبوراً نفی وانکار پر برابر جنباں ہے، ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بی طہورن رشتۂ زوجیت میں منسلک ہو کر بوقت رخصت دولھا کے ساتھ جانے کے لئے "مداری" کے طلب اقرار پر جو آموختہ انکار بذریعہ "سر" ظاہر فرماتی ہیں اس میں یہ مزا کہاں جو قاضی صاحب کی چوتھی خوری کے انکار ڈگڈگاتے سر، ملتی گردن میں ہے۔ گرچہ بی میمونہ ایک ناقص ہیولیٰ قاضی صاحب ہی کی جنس کی ہیں مگر ہمارے حضرت کو جو ارتقائے کامل حاصل ہو چکا ہے وہ کہاں سے لائیں گی اور اگر فرض محال، محال نباشد تخم تاثیر، صحبت کا اثر جا ل ہمنشیں کے فیض، مداری صاحب کے "گتکا" کی تربیت سے انسانی عادتیں سیکھ بھی جائیں اور اس نقص کو کسی طرح پورا بھی کرلیں تو پھر فرمائیے کہ یہ شاعرانہ مزاج کہاں سے پائیں گی۔ سسرال والوں نے خالی خولی اصرار بے کار جاتے دیکھ کر کھنکتے چھنکتے روپیوں کی تھیلی کو درمیان میں ڈالا۔ اب وہ بھی سسرال والوں کے اصرار میں ہم زباں ہے۔ قاضی صاحب نے بھی اب کان بجائے (کان کھڑے کئے) گو ابھی تک انکار کے تھرما میٹر کا پارہ جس ڈگری پر پہنچ چکا تھا اسی پر قائم ہے، ادھر روپیوں نے "کوتا گھار" مچائی، لمحہ بہ لمحہ سسرال والوں کے اصرار کی طرح دو دو ایک ایک کرکے بڑھنے لگے۔ "زر بر سر فولاد نہی نرم شود" قاضی صاحب کا انکار بھی ریشۂ خطمی کے لعاب کی طرح بنے، موم ہو کر پگھلنے لگا۔ جنکِ جنباں کی "سریع دوری حرکت" بطی ہونے لگی، اب کبھی کدھار دوری جھٹکا، دیر، دیر کے بعد ہو جاتا ہے، غرضکہ "کیش پرس" نے کشاکش اقرار، قید انکار سے نکال کر قاضی صاحب کا دست و دہانی لگام وسکہ (چھینکا) تڑایا، سوکھے دھانوں پانی پڑا، رکی ہوئی طبیعت میں روانی ہوئی، گنگاجی میں طغیانی آئی، گھا گھرا کا

بند ٹوٹا، سیلاب خورش ہیں ماحضر سے متزاد، سسرال والوں کے توقع و امید سے کہیں زیادہ بہاؤ آب،
مُنی سی بلیک ہول کا کوئی کونہ کترا ایسا نہ بچا جس میں جاؤ بے جا، تول بے تول، ناپ بے ناپ، تلے اوپر،
اوندھے سیدھے، تہ بہ تہ، لقمہائے تر بند نہ کئے گئے ہوں۔ اس بنیا میں خالی ظروف بدقت بیچے، مگر
قاضی صاحب کے دل سے کہیں زیادہ صاف "بی پڑوسن" یعنی ذابح البقر کی رجسٹری شدہ منظور نظر
بہ کرایہ یا بپاس مروت یا بادلے حق ہمسائگی فی الحال سسرالی ماماجی زحمت ظروف شوئی سے آج
کے دن بالکل محفوظ اور مطمئن ہیں۔ رفقا رنے بھی حضرت کی معیت میں مقاطعہ جوعی تکست کرکے مال مفت کے
لئے دل بے رحم بن کر اپنی اپنی اونچی نیچی خندقیں، گڑھیاں، چقر، نالے، نالیاں، کھوے، ڈبرے،
بھرے پاٹے۔

قاضی صاحب حجلۂ عروسی میں جاتے ہیں

ادھر تو قاضی صاحب مع رفقار بحر طعام میں شناوریاں دکھا رہے ہیں، اُدھر سالیوں سلہجوں نے
لپ جھپ برقی سرعت کے ساتھ "حجلۂ عروسی" ٹیپ ٹھاک کر دیا، فقط قاضی صاحب کے پہنچنے کی دیر
ہے، سب تیار ہے۔ پورے گیارہ بجے تھے کہ قاضی صاحب نے جملہ رفقار کو "نان کہ خوردی خانہ برد" کی
عام ہدایت دے کر "ہفت خوان" پر چڑھائی کی ٹھان لی۔ چل تو پڑے مگر "بادلِ ناخواستہ"۔ آئیں یہ کیا،
ٹائیں ٹائیں پھش، یا یہ شوراشوری، یہ زور یا یہ بے نمکی، یہ پھسپھساہٹ۔ نہیں کوئی بات ضرور ہے ورنہ
قاضی صاحب رکنے والے اسامی نہیں۔ دو چار دن سے برات کے ہنگاموں میں دوڑے دھوپے،
تھکے ماندے "سسرالی" لڑکی کا بیاہ کرکے گھوڑا نہیں گھوڑی بیچ کر، مردوں سے شرط لگاکر دیکھے بھالے،
سوچے سمجھے، معاملہ سے مطمئن، ادویہ سریع التاثیر کے جوہروں کے ظہورے، سیر خوری کے برکات، چہل
سالہ جوگ کے کرامات سے بڑی بڑی امیدیں لگائے "جو دنیا میں ہوتا آیا ہے" اس سے کہیں زیادہ
کے قاضی صاحب سے متوقع سوئے اور ایسے سوئے گویا سانپ سونگھ گیا ہے کہ "گجردم" ناشتہ نہاری
کی تیاری کی خاطر اٹھنا ہے۔ سسرال والوں کی یہ توقعات بیجا نہ تھیں اور قاضی صاحب بھی ہر طرح

کے زور دکھانے، جیسی چاہئے ویسی کراتیں ظہور میں لانے پر بالقوی قادر تھے۔ مگر اس کا لحاظ رہے، جہاں ہر طرح
قاضی صاحب عجیب الخلقت ہیں وہاں نفس پر قدرت بھی غیر معمولی رکھتے ہیں۔ اول تو اس کا ایک شمہ مختصر،
اظہار منظور دوسرے کچھ چلہ کشیوں کا پایان و اختتام نہ ہوا تھا، اس لیے دست و پابستہ بندے رہے، آئین شکنی
کا خیال البتہ نیش زنیاں کر رہا ہے، اس واسطے نام چار کو یہ رسم بھی ادا کرنا ضروری تھی، گئے، مگر قدرت نفس
کے وہ کرشمے دکھلا گئے کہ انسان تو جنس حیواں ہے فرشتہ خاں بھی اس محل پر گوش و دم بریدہ نظر آتے۔
آپ دیکھتے نہیں، اندرون حجلۂ عروسی موجود ہیں مگر جبر پر اختیار کیا کہنا، نہ مس عروس ہوئے، نہ نشست پلنگ آشنا
ہوئی۔ تحت چھپر کھٹ جلوس ہے اور جویائے محل گریز۔ آمادۂ فرار ہیں۔ "چھپر کھٹ" پر حجاب نوعروسی
میں سرشار دلھن تنہا در راز، جائے قاضی خالی، زمانہ کا اونچ نیچ دکھا کر، نیک صلاح، مفید مشورہ دے کر
"بھگوڑے دولھا" کے خطاب سے بچانے میں کسی طرح قاضی صاحب کی "عناں گیر" نہ ہو سکی۔ اگر کوئی
صلاح مشورہ ہوتا بھی تو قاضی صاحب ان پھندوں میں کب پھنسنے والے تھے، صنف نازک کا ضعف عقلی
ظاہر۔ قاضی صاحب کو فراری میں مفر تھا اور مفاد مضمر تھے، بدیں وجہ ابھی تحت چھپر کھٹ جلوس تھا کہ بیٹھے
سے اُٹھ کھڑے ہوئے، اب شگاف حجاب سے برابر تاک جھانک، سسرال والوں کے جاگا نیندی کی
ٹوہ لی جا رہی ہے۔ دل خوفِ فرار میں پتے کی طرح ہل رہا ہے، ماہی بے آب کی طرح پھڑک رہا ہے،
ادھر "نفیر ہائے خواب سسرالیاں" گوش قاضی تک پہنچیں اور قاضی صاحب سمجھے کہ نیند نے چھاپہ مارا،
ادھر جس طرح جنگلی خرگوش جھاڑی سے نکل کے بھاگتا ہے اسی طرح قاضی صاحب کھڑک سے پردہ
کے باہر آئے۔ دبے پاؤں، بلی کی چال، پنجوں کے بل، دروازے پر پہنچ کر زنجیر کھول سر پر پاؤں رکھ
پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے، ہندوستان کے دل سے دفتری اقتدار کے اعتماد کی طرح اُڑنچھو، رفوچکر، بھاگوں
بھاگ، سسرال والوں کو خواب خرگوش میں چھوڑ، پورے "بارہ" تھے کہ انتہائے گریز کی بوکھلاہٹ میں
اپنا محلہ اپنا گھر بھول کے بھائی صاحب کی سسرال کا "دق الباب" فرمایا۔ بھائی صاحب، تین دن
سے شادی کے دوڑے دھوپے، خستہ بھربھرے، تھکے ماندے مع مسٹر فالکو (قاضی صاحب کے بھائی کا
سب سے آخری حماقت کا ملخص)، ایک پلنگ پر سو نہ رہے تھے بلکہ غش میں تھے جس سے افاقہ مشکل

تھا مگر حضرت کی پیہم منجرہ شگافیوں نے غش سے چونکایا۔ گو بھائی صاحب حسب قرار داد اس فرار سے آگاہ تھے مگر شدت خستگی میں قاضی صاحب کی اس ناوقت آمد بے ہنگام رسید کے خیر مقدم کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ مگر کچھ تو طرز وقوع واقعہ فرار سے خبردار ہونے کا خیال، کچھ قاضی صاحب کی اس شب تار میں دروازہ پر استادگی کی تکلیف کے احساس نے بھائی کا دل بے چین کر دیا، دل ناخواستہ کو خواستہ بنا کر، گرتے پڑتے، جھومتے جھامتے کسی نہ کسی طرح اپنے کو دروازے پر پہنچایا، زنجیر کھولی۔ قاضی صاحب نے قدم اندر رکھا۔ بھائی صاحب نے پوچھا "خیر صلّا" فرمایا "سب خیر ہے"۔ الحمد ری شاعرانہ بلاغت لاتنے سے فقرے میں سب حکایت فرار بیان کر گئے۔ بھائی صاحب ہر پہلو سے مطمئن، بعالم خستگی پھر پلنگ پر ٹھس ہو کر گرے۔ اور "آنجہانی"۔ خیال رہے کہ قاضی صاحب شب وصال کو شب فراق بنا کر آئے ہیں، ایک کھرّے پلنگ پر دراز ہوئے، نہ بخیال استراحت، بلکہ بلحاظ وقت گزاری طوالت شب، مگر خائف بھی، جانتے ہیں کہ سسرال دو چار کھیت دور، سسرالی "یادگار بنافر" (آلھا اودن کا ہیرو) ہاتھی چھوٹے، گھوڑا چھوٹے، کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے، چند ساعت کا قیام بھی پُر از خطرات، مگر "کلموہی" رات کی زیادتیوں سے مجبور، کریں تو کیا۔ گو پلنگ نمونۂ قبر جھولا ہے، چاہتے تو صبح حشر تک سکون سے پڑے رہتے مگر دل کی بے چینیاں آڑی ترچھی لمبی چوڑی، اوندھی سیدھی کروٹوں پر کروٹیں بدلا رہی ہیں، کبھی کروٹوں سے اکتا کر چیت ہو کر اختر شماری میں مصروف ہیں، ایک تارا گھنگرو تارا، دو تارے، گھنگرو تارے، اب شمار کا سلسلہ قاضی صاحب نے "الی غیر النہایہ" بڑھایا، کبھی سو پچاس تک پہنچے کہ ایک تارا، گھنگرو تارا پر آ رہے، غرضکہ اسی عالم میں تارے گن گن کے چار بجائے، بیل گاڑی بی طباخہ کو اسٹیشن پر لانے کے لئے موجود تھی۔ چاہتے تو قاضی صاحب، ہم خرما و ہم ثواب، کرتے بی طباخہ سے راستہ بھر بات چیت، گلغپ اڑاتے، پان خوری مفت میں ہوتی، راہ کٹ جاتی، سواری گھاتے میں پڑتی، مگر بہ مصالح پیادہ روی کو ترجیح ملی، بہ معیت رفیق دلی، میاں وزیر علی، و بیک دست چھڑی ہلاتے رواں دواں ہیں، راہ بھر قدم قدم پر قدرت نفس کے کرشمے، فلسفۂ فرار کے اذکار کرتے رفیق راہ سے ہر نکتہ گریزی کی خوبی کی تائید کراتے پوپھٹے پھٹے، اگرچہ اسٹیشن چار پانچ کوس تھا، موجود رکھے ہیں۔ گاڑی آنے میں دیر تھی اُسی

کے انتظار میں پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے ہیں بسسرال والوں کی سنیئے، جوانی کی نیندیں اور
دن سن تو مشہور ہی ہیں، جوانیں تو خیر جوانی کی نیندیں لے رہی ہیں۔ بوڑھیاں، ٹھوریاں بھی خستگی و
تھکاوٹ سے میں دماغی کا مبادلہ کرکے وہ لمبے خرّاٹے کس رہی تھیں کہ ٹبیوں کی لڑائی مات ہے۔
نو بجتے بجتے گھر کے گھر کی آنکھ کھلی۔ دیکھتی کیا ہیں نوشاہ بنے فقرو، نوکرشاہی اعتماد کی طرح ناپید۔
سمدھیانے آدمی پر آدمی جا رہا ہے، محلہ محلہ ڈھونڈھیا پڑی ہے، قاضی صاحب ہوں تو ملیں، خسر صاحب
اس غم و غصے میں شمشیر برہنہ تھے۔ خیر ہوئی قاضی صاحب ملے نہیں ورنہ خدا جانے کیا نوبت آتی۔
خیر اب تو ہمارے قاضی صاحب بھاگ آئے ہیں۔ میں بھی رخصت ہوتا ہوں۔ بعد چلّہ کشی
جب ہفت خوان پر چڑھائی ہوگی تو یہ کمترین بھی حاضر ہوگا۔

——— ✻ ———

داغِ ناتمامی

دنیا پرانی ہوتی گئی، دنیا پرانی ہوتی گئی اس قدر کہ زمانے کی قید اُٹھ گئی، وقت کا شمار جاتا رہا، ماہ و سال، شب و روز کے تفرقے اُٹھ گئے، قیاسِ وقت کی ضرورت ہی نہ رہی، محاسبہ کار نے دن اور رات کی جگہ لے لی، مصروفیت اور آرام کا شمار تکمیل کار قرار دیدیا گیا، دقیقہ اور ساعت، صبح اور شام بے معنی ہو گئے۔

دنیا پرانی ہوتی گئی اور اس قدر کہ احساس بعد مکانی جاتا رہا، براعظم اور بحر اعظم انسانی قدرت مسافت کے لئے بلامعنی ہو گئے۔ تمام کرۂ ارض ایک شہر ہو کر رہ گیا جس میں دور پارینہ کی طویل مسافتیں صرف اس قدر رہ گئیں کہ جیسے ایک محلے سے دوسرے محلے کا سفر۔ صرف خیال ہی انتقال مکانی کے لئے کافی اور وافی ہو گیا۔

دنیا پرانی ہوتی گئی اور اس قدر کہ انسانی قوت کا اندازہ اس طرح لگایا جانے لگا کہ ہر خواہش کے حصول کا مقدور ہی معیار قطعی قرار دے دیا گیا۔ انسانی اشکال اور ساخت کی تمیز اٹھ گئی۔ معاشری اور نوعی تعلقات کا خاتمہ ہو گیا۔ قوم اور فرقے کا وجود ہی مٹ گیا۔ خاندان کہ جو معاشرت کا سنگ بنیاد ہے فرسودہ ہوتے ہوتے خاک میں مل گیا۔

دنیا پرانی ہوتی گئی حتیٰ کہ "آواز" کا احساس ہی نہ رہا اور تمام کرۂ ارض پر ایک خاموشی کہ جو موت کی خاموشی سے زیادہ گہری تھی طاری ہو گئی۔ جذبات کے اظہار کا رواج ہی نہ رہا اور شاید ان کا وجود ہی باقی نہ تھا اور اگر تھا تو انسانی جسم کا وہ حصہ جو ان کا منبع اور مخزن ہے اس قدر ضابط اور مستبد ہو گیا کہ اظہار ممکن نہ رہا۔ انسانی جسم تمام امراض سے مبرا ہو گیا اور انسانی خیال اس درجہ سریع الرفتار اور وسیع ہو گیا کہ اس کا شمار اور احتساب حدود وضاحت اور تشریح سے بالاتر ہے۔

اسی کرۂ ارض پر ایک بادل اُٹھا، نہایت تیرہ اور نہایت تاریک۔ علم انسانی کو یہ پتہ نہ لگ سکا کہ یہ

بادل کس رخ سے آیا ہے اور یہ نہ معلوم کر سکا کہ کس طرف کو جا رہا ہے۔ نہ تو اس بادل کے برسنے کا یقین تھا اور نہ اس کے نہ برسنے کا احتمال۔ مگر اس کی سیاہی بڑھتی گئی ٹھیک اسی طرح کہ جیسے دنیا پرانی ہوتی گئی تھی۔ اس کی سیاہی بڑھتی گئی اور نگاہ کی قوت زائل کرتی گئی ٹھیک اسی طرح کہ جیسے قیود زمانی اور مکانی زائل ہوتی گئی تھیں۔

آخر کار وہ سیاہ بادل کرۂ ارض پر محیط ہو گیا۔ عدم اور وجود کا سوال ہی درمیان نہ رہا۔

آہستہ آہستہ وہی سورج کہ جو ہبوط آدم کے وقت مشرق سے طلوع ہوا تھا پھر افق مشرق پر نمودار ہوا۔ اس کا نور پھیلتا گیا، روشنی ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ چیزیں نظر آنے لگیں۔

اس سپیدۂ صبح میں نمودار ہونے والی پہلی چیز ایک وسیع ریگستان تھا، اس قدر وسیع کہ انسانی ہمت اس کے عبور کرنے کے خیال سے پریشان ہو جائے مگر اس ریگستان میں ایک قافلہ مسافروں کا نظر آیا کہ جو متواتر مشرق کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ طویل مسافت طے کرنے کے بعد ریگستان کا خاتمہ ہوا اور ایک دل شکن دلدل کی ابتدا ہوئی مگر ان مسافروں کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں، اور وہ قدم اٹھائے چلے گئے۔ اس دلدل میں جان مارتے ہوئے اس قافلے کو کافی وقت گزر گیا۔ سورج نصف النہار تک پہنچا اور اب مغرب کی افق میں ہلکے ہلکے بیٹھنے لگا۔

دلدل ختم ہوئی اور شفاف پانی کی ایک جھیل شروع ہوئی۔ ان مسافروں کو دن بھر کی محنت اور مشقت نے چور کر دیا تھا لیکن جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک پرانے قلعے کے نظر آجانے سے ان کے چہرے شاداب اور بشاش ہو گئے۔ ان سب کے دست و پا میں خاص قوت پیدا ہو گئی اور ان کی رفتار کافی تیز ہو گئی۔ غروب سے کچھ قبل یہ اس عالیشان قلعے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اس قلعے کا نام قلعۂ دورِ چرخ تھا۔

یہ قلعہ بہت پرانا تھا اسی قدر کہ جتنی دنیا پرانی تھی۔ اس میں فضا کی تلاطم سے پیدا ہونے والی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ وہی آوازیں کہ جو روحوں کو ایک موسم حیات کے لئے میدان عمل میں بھیج دیتی ہیں۔

ان مترنم آوازوں کو سنتے ہی مسافروں کا قافلہ یک زبان ہو کر چیخ اٹھا "دروازہ کھول دو کہ ہم اندر داخل ہو سکیں"۔

وہم و خیال سے زیادہ قوی اور زیادہ پیاری آواز نے پوچھا "تم کون ہو"۔

تیغ و تیر اور زرہ بکتر سے آراستہ شخصیت مجمع سے آگے بڑھی اور یوں گویا ہوئی: "میں نے کرۂ ارض پر انسانِ اعلیٰ کے اقتدار کے قیام کے لئے جماعتوں کی تنظیم کی، میں نے کمزور اور معمولی انسانوں کے کثیر انبوہ کو کہ جن کی قوت صرف جماعت پر مبنی تھی زیر و زبر کیا۔ میرا جسم زخموں سے چور ہے۔ میری تلوار خون سے آلودہ ہے۔ میرا زرہ بکتر دشمن کی ضربوں سے پاش پاش ہے مگر میرا دل اتنا ہی قوی ہے کہ جتنا کسی فاتح کا ہو سکتا ہے۔ میں حقدار ہوں کہ حریم مصفا اور منزہ میں داخل کر لیا جاؤں"۔

حقارت آمیز ہنسی نے اسے خاموش کر دیا اور دوسرا شخص بولا "میں نے کرۂ ارض پر منتشر دولت اور زر و سیم کو یکجا کرنے میں کسی بات سے دریغ نہیں کیا۔ زبردست سے لڑ کر اس کی دولت چھینی، کمزور کو دھوکا دے کر مفلس کر دیا۔ سمندروں پر اور ہواؤں میں غرضکہ ہر جگہ میں نے اپنا جال پھیلا دیا۔ سرمایہ کی حفاظت کے لئے لطائف الحیل سے کام لیا۔ کرۂ ارض کی ہر شے کو کار آمد بنایا اور ابھی میں اپنی کوششوں میں انہماک سے مشغول ہوں۔ ایک دن آئے گا کہ جب ...."

خاموش ہو جا، خاموش ہو جا کے ناطق حکم نے اس کی بات لبوں پر روک دی اور ایک تیسرا شخص مصروفِ گفتار ہوا۔

"ان دونوں کے دعوے باطل ہیں۔ یہ ہمیشہ میرے محتاج رہے۔ پہلے مدعی نے ضرور خون بہائے، ضرور قلعے فتح کئے، لیکن اس کے پاس صرف ناکارہ اور دقیانوسی اسلحہ ہی موجود تھے۔ میں نے نئے سے نئے آلات بربادی ایجاد کئے۔ اسی طرح سرمایہ فراہم کرنے والے کو بھی میری ہی عقل و دانش نے سرمایہ دار بنا دیا۔ اوقیانوس کی گہرائیوں میں دیکھنے کے لئے میں نے اسے آنکھیں دیں، پہاڑوں کی دشوار گزار چوٹیوں پر اڑتے پھرنے کے لئے میں نے اسے بازو دئے۔ انسانی سماعت کی کمزوری میری ایجادوں نے رفع کر دی۔ غرضکہ ہر ناتمامی کو تمامیت پر میں نے پہنچایا۔ ان دونوں سے زیادہ حقدار ہوں"۔

"اور کوئی بھی مدعی ہے" قلعہ در چرخ سے اٹھنے والی آواز نے کہا۔ چوتھے دعویدار نے کہنا

شروع کیا۔

"میں نادم ہوں کہ میرے امکان میں اتنی وسیع خدمات نہیں۔ ہاں میں اس بربادی کو دیکھ دیکھ کر روتا ضرور رہا ہوں کہ جو پہلے تین دعویداروں نے اپنے کرشمہ ہائے ستم سے کرۂ ارض پر برپا کر رکھی تھی۔ اس خون سے جو بہایا جاتا رہا میں اپنے صفحۂ دل پر گلکاری کرتا اور پھر ان گلکاریوں کو اپنے آنسوؤں کے پانی سے دھو دیتا۔ میں اپنے شکستہ ساز پر ایسے دلکش راگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ جو ظلم کوش کو سست رگ کر دیں۔ کچھ میری سنتے رہے اور کچھ مجھ سے منحرف رہے۔ میں صرف زخمی دل اور ناتمام کوششوں کے وجود کا مظاہرہ ہوں۔ میں مکمل ہوں مگر میری تکمیل........"

تم مقرب بارگاہ ہو۔ دروازہ کھلتا ہے اندر آ جاؤ۔

دروازہ کھلا۔ حقدار نے قدم بڑھائے لیکن شخص اول الذکر مجمع کو چیرتا پھاڑتا بہ سرعت تمام دروازے میں یہ کہتا ہوا داخل ہو گیا کہ "دنیا میں قوت قبضے کی ضمانت ہے۔"

———

دارالسلطنت مانڈو اور اس کے حکمران

ہزارہا سیاح ہر سال اجین سے ہو کر گزرتے ہیں لیکن سوائے چند کے کوئی بھی مالوے کے قدیم دارالسلطنت مانڈو کا رخ نہیں کرتا جو اجین سے چند ہی میل کے فاصلے پر ہے اور کسی زمانے میں ایک عظیم الشان شہر تھا۔ اب بھی اس کی عمارتیں اور کھنڈر دیکھنے والوں کے دلوں پر عجیب اثر کرتے ہیں۔ مہاراجہ دھار نے جن کی ریاست میں یہ شہر ہے ان کی حفاظت کے لئے خاص انتظام کیا ہے پچاس برس کا عرصہ ہوا کہ یہ کھنڈر زمین میں دب گئے تھے اور وحشی جانوروں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی کہ وہاں ایک رات بھی بسر کرنا ناممکن تھا۔

مانڈو ایک ٹیلے پر واقع ہے جو سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فیٹ بلند ہے۔ اس کا کل رقبہ پچیس مربع میل ہے ٹیلے کی چوٹی پر دہلی دروازہ ہے اور اس کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں ہیں جن کے اندر متعدد مقبرے، شاندار مساجد اور خوبصورت محل ہیں۔ محلوں میں دو عمارتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہنڈولہ اور جہاز محل۔ جہاز محل کی چھت سے ویران شہر کا نظارہ قابل دید ہے۔ میلوں تک سرسبز درخت، مختلف قسم کی عمارتیں اور نیلی نیلی جھیلیں عجیب بہار دکھاتی ہیں۔ جب کوئی ان چیزوں کو دیکھتا ہے جن پر ہر وقت سکون اور خاموشی چھائی رہتی ہے تو بمشکل یقین آتا ہے کہ کبھی اس شہر میں بھی چہل پہل تھی اور ہنسی قہقہوں کی آوازیں اس کے در و دیوار تک سے گونجتی تھیں۔

جہاز محل کے پاس ہی ایک عمارت ہے سادہ مگر پر شکوہ۔ اس کے نیچے سلطان ہوشنگ شاہ غوری آرام کی نیند سو رہا ہے۔ اس کے قریب سنگ سرخ کی وسیع اور خوبصورت جامع مسجد ہے۔ جامع مسجد سے سڑک جنگل میں سے ہوتی ہوئی ساگر تالاب پہنچتی ہے۔ یہ تالاب یوں ہی کافی خوبصورت ہے لیکن کنول کے پھول اس کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ ایک میل اور چلنے کے بعد باز بہادر کا محل آتا ہے۔ اس کے بلند دروازے میں داخل ہونے کے بعد انسان کو جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ محل کے عقب میں چھوٹی سی ایک پہاڑی پر روپ متی کا شامیانہ ہے جس میں بیٹھ کر یہ حسین و جمیل رانی دریائے نربدا کو دیکھا

کرتی تھی جو بارہ ہزار فیٹ نیچے بہتا ہے۔

مانڈو کی بنیاد کے متعلق بہت سی روایات ہیں۔ ان میں سے ایک ابوالفضل نے نقل کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اس ملک میں ایک قسم کا پتھر پایا جاتا ہے جسے پارس کہتے ہیں۔ جس دھات کے ساتھ یہ چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے۔ راجہ بکرماجیت سے بھی کہیں پہلے ہندوستان میں ایک راجہ جے سنگھ دیوا نامی حکومت کرتا تھا۔ یہ راجہ اپنی سخاوت اور نیکی کی وجہ سے اپنی رعایا میں ہر دلعزیز تھا۔ اس کے عہد میں ایک غریب آدمی کو اتفاقاً پارس مل گیا جس سے اس کی درانتی سونے کی ہوگئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوفزدہ ہوا اور ایک سنار کو جس کا نام منڈو تھا وہ پتھر دے دیا۔ سنار یہ پتھر لے کر راجہ کے دربار میں پہنچا اور تحفے کے طور پر یہ قیمتی چیز اس کو دے دی۔ راجہ نے اس کے ذریعہ سے بہت سے رفاہ عام کے کام کئے اور ایک قلعہ بھی تعمیر کیا جس کا نام سنار کے نام پر مانڈو رکھ دیا گیا۔

یہ روایت جہانگیر نے بھی اپنی تزک میں نقل کی ہے لیکن اس پر تنقید کرتے ہوئے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ "یہ روایت محض خیالی اور ناقابل اعتبار معلوم ہوتی ہے"۔ بہرحال دوسرے تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے مانڈو ایک معمولی سا گاؤں تھا۔

دراصل مانڈو کی اصلی تاریخ دلاور خاں سے شروع ہوتی ہے جس نے سنہ ۱۴۰۱ء میں اپنی خود مختاری اور بادشاہی کا اعلان کیا تھا جبکہ امیر تیمور کے حملے سے شاہان دہلی کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ دلاور خاں کا اصلی نام حسین تھا اور اس کے آباؤ اجداد غور سے آکر شاہان دہلی کے دربار میں مختلف عہدوں پر مقرر ہو گئے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے وقت حسین نے چند ایسے کارنامے کئے کہ اسے دلاور خاں کا خطاب عطا ہوا اور فیروز تغلق کے بعد اس کے جانشین سلطان محمود نے اسے مالوے کی صوبیداری پر متعین کر دیا۔

سنہ ۱۴۰۶ء میں دلاور خاں مر گیا اور اس کا بیٹا الپ خاں السلطان الاعظم حسام الدنیا والدین ابوالمجاہد ہوشنگ شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ نوجوانی ہی سے اس کے دل میں کشور کشائی اور فتوحات کا شوق تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے سید مبارک شاہ بادشاہ دہلی، احمد شاہ بہمنی اور جون پور کے بادشاہ کے خلاف لڑائی چھیڑ دی۔ ان تینوں کے خلاف الگ الگ لڑائیاں ہوئیں جن میں بالآخر سلطان کامیاب ہوا

جنگ و جدل کے شوق کے ساتھ ساتھ سلطان کے سینے میں ایک فیاض اور دردمند دل تھا
رعایا اس کو دل سے چاہتی تھی جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد ہر سال اس کی قبر
بڑی شان سے عرس ہوتا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں مشہور مورخ برگس مانڈو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ "چند عابد
زاہد مسلمان اب بھی یہیں رہتے ہیں جو ہر سیاح کو دلی عقیدت سے سلطان کے مقبرے کی زیارت کراتے ہیں
جس کے دروازے پر یہ شعر کندہ ہیں:۔

شہ والا قدر سلطان ہوشنگ — سوئے دار البقا چوں کرد آہنگ
بپرسیدم ز ہاتف سال تاریخ — ندا آمد نماندہ شاہ ہوشنگ

فن تعمیر میں بھی سلطان اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے اس شوق کی وجہ سے مانڈو نہ صرف
ناقابل تسخیر قلعہ بلکہ ایک نہایت عمدہ اور حسین شہر بن گیا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی عمارتوں میں سے جامع مسجد
دہلی دروازہ اور خود اس کا مقبرہ بہت مشہور ہیں۔

ہوشنگ شاہ اپنے ایک عزیز محمود خاں کو بہت چاہتا تھا۔ جب اس کے مرنے کا وقت قریب
آیا تو اس نے اپنے بیٹے غزنی خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور محمود خاں کو ہدایت کی کہ وہ غزنی خاں کا
ہر طرح سے خیال رکھے۔ محمود نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس کی حفاظت میں بہادے گا
شروع شروع میں محمود اپنے وعدے پر قائم رہا لیکن جب دربار کی اندرونی سازشوں اور رشک و حسد کی
وجہ سے اس کی اپنی جان کی خیر نہ رہی تو اس نے بادشاہ کو زہر دے کر مروا ڈالا اور ۱۴۳۶ء میں خود
السلطان الاعظم علاء الدین والدنیا ابوالمظفر محمود شاہ خلجی کے لقب سے تخت پر بیٹھ گیا۔

محمود کو علم و ادب سے خاص شغف تھا۔ اس نے علم و ادب کی ترقی کے لئے اپنی سلطنت میں
کئی کالج قائم کئے تھے۔

فرشتہ کہتا ہے کہ سلطان محمود نرم دل، بہادر اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں
ہندو مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں سلطان دنیا کے بادشاہوں اور درباروں
کے حالات سنا کرتا تھا۔ وہ فخر سے کہا کرتا تھا اور یہ بات تھی بھی درست کہ وہ انسانی فطرت سے بخوبی

واقف ہے اور اس کا مطالعہ اچھی طرح سے کیا ہے۔ ۱۴۴۶ء میں سلطان محمود نے ایک ہسپتال کی بنیاد ڈالی اور اپنے خاص شیر طبی فضل اللہ کو وہاں کا منتظم و مہتمم مقرر کیا۔ اس ہسپتال میں الگ الگ وارڈ تھے اور مریضوں کا علاج بڑی اچھی طرح سے کیا جاتا تھا۔

سلطان محمود بڑا بہادر سپاہی بھی تھا۔ اس کی فوجی قابلیت ہندوستان سے نکل کر اسلامی ممالک میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ اس کے دربار میں سلطان ابوسعید شاہ ماوراءالنہر اور امیرالمومنین مستعد باللہ کی طرف سے سفیر رہتے تھے۔ سلطان بھی ان ملکوں میں اپنے سفیر اور تحفے تحائف روانہ کرتا تھا۔ تحفوں میں اکثر عمدہ ململ، عربی گھوڑے، رقاصہ لڑکیاں، ہاتھی، مینا اور طوطے ہوتے تھے۔ مینا اور طوطوں کو بڑی محنت سے فارسی کے بہت سے جملے یاد کرائے جاتے تھے۔

سلطان کو فن تعمیر سے بھی بہت شوق تھا۔ سلطان ہوشنگ کی جامع مسجد مکمل کرانے کے بعد اس نے بہت سی اچھی اچھی عمارتیں بنوائی تھیں۔ ۱۴۶۹ء میں ایک مہم سے واپس آرہا تھا کہ انتقال ہو گیا تاریخ وفات یہ ہے:۔

شہ والاقدر سلطان محمود   چو شد از امر حق رحلت گزینے
پئے سیدم ز ہاتف سال تاریخ   ندا آمد کہ شد جنت نشینے

سلطان محمود کے انتقال پر اس کا بیٹا الواثق بالملک الملتجی؟ ابوالفتح غیاث خلجی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں تو مانڈو نے انتہائی عروج حاصل کر لیا تھا۔ مانڈو کا نام بدل کر شادی آباد رکھا گیا۔ غیاث کے دربار میں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں جن کی تعداد کوئی ڈیڑھ ہزار تھی۔ ان سب کو کوئی نہ کوئی فن سکھایا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر حکومت کے مختلف عہدوں پر مامور تھیں۔

شاہی باڈی گارڈ کے دو حصے تھے ایک میں حبشی کی لڑکیاں تھیں اور دوسرے میں ترکنیں۔ ان کی کل تعداد ایک ہزار تھی۔ یہ خیال کر کے کہ رشک و حسد کی وجہ سے دربار کے امن میں کسی قسم کا خلل نہ پڑے اس کا حکم تھا کہ نوجوان لڑکیوں اور بوڑھی عورتوں کی تنخواہ میں ایک پائی کا بھی فرق نہ ہو۔ وہ اپنے تکیے کے نیچے سونے سے بھرا ہوا تھیلا رکھ کر سوتا تھا اور صبح اٹھتے ہی غربا میں تقسیم کر دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک

مرتبہ اس نے حکم دیا کہ اس کے لئے ایک معجون تیار کی جائے۔ جب معجون تیار ہوگئی تو اس کو اس کی اطلاع کی گئی۔ اس نے کہا کہ جب تک وہ ان دواؤں کے نام نہیں سن لے گا جو اس میں پڑی ہیں وہ اس کا استعمال نہیں کرے گا۔ مجبوراً سب چیزوں کے نام گنوائے گئے۔ ان میں سے ایک چیز جو سپل بھی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ دوا کسی کام کی نہیں ہے۔ اس معجون پر کئی ہزار روپیے صرف ہوئے تھے لیکن اس نے حکم دیا کہ اس کو کوڑے کرکٹ میں پھینک دیا جائے۔ ایک درباری نے کہا کہ یہ کسی غریب کو دیدی جائے تاکہ اس کا ہی فائدہ ہو جائے۔ مگر اس نے جواب دیا "ہرچہ برخود نہ پسندی بہ دیگراں ہم مپسند"

غیاث جس قدر سخی تھا اتنا ہی منصف مزاج اور نیک بھی تھا۔ شب و روز اس کے محل میں خوبصورت لڑکیاں خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ جب نماز کا وقت آئے تو اسے پلنگ پر سے کھینچ کر ہوشیار کر دیا جائے اور اگر اس پر بھی نہ اٹھے تو سرد پانی اس پر ڈال دیا جائے۔

تیس برس تک غیاث اسی طرح حکومت کرتا رہا۔ باوجود اس عیش و عشرت کے اس کی سلطنت کا انتظام بہت اچھا تھا۔ رعایا خوش حال تھی اور ملک میں امن وامان تھا۔ لیکن اس کا خاتمہ بڑے اندوہناک طریقے سے ہوا۔ غیاث کی عمر اسی برس کی تھی جب ایک دن اس کا لڑکا نصیرالدین زہر کا پیالہ ہاتھ میں لئے اچانک اس کے خاص کمرے میں داخل ہوا اور اپنے باپ سے کہا کہ اس کو پی جاؤ۔ بادشاہ کے بازو بند میں اس وقت زہر مہرہ تھا اور اگر وہ چاہتا تو زہر کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا لیکن دو مرتبہ پہلے بھی اسے زہر دینے کی کوشش کی گئی تھی اب تیسری مرتبہ اس نے زہر مہرہ اپنے بیٹے کی طرف پھینک دیا اور یہ کہتے ہوئے زہر کا بھرا ہوا پیالہ غٹا غٹ پی گیا کہ "اے خدا تو نے اپنے معمولی بندے کو ایسی زندگی عطا کی جس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔" مرتے وقت اس نے وصیت کی کہ نصیرالدین کو قتل کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ غیاث الدین کی زندگی کے حالات پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الف لیلیٰ میں سے کوئی قصہ بیان کیا جا رہا ہے لیکن یہ تمام باتیں واقعات پر مبنی ہیں جن کی تصدیق فرشتہ اور دوسرے مورخین نے بھی کی ہے۔

نصیرالدین کے اس ذلیل فعل کی مذمت اگرچہ مارے خوف کے اس کی زندگی میں نہیں کی گئی لیکن

اس کے مرنے کے بعد اس کو خوب ہی برا بھلا کہا گیا یہاں تک کہ شہنشاہ جہانگیر جب مانڈو گیا تو اس نے خود بھی اس کی قبر کو اپنے پاؤں سے ٹھکرایا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ بھی ایسا کریں۔ اس پر بھی جب اس کا غصہ کم نہ ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اس کی ناپاک ہڈیوں کو قبر سے نکال کر دریائے نربدا میں پھینک دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اپنے باپ کے انتقال کے فوراً بعد یعنی ۱۵۰۰ء میں نصیر الدین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ اس کی سلطنت کا انتظام اچھا تھا لیکن ظلم و ستم نے اس کی اچھائی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن نصیر الدین نشے میں کسی تالاب کے کنارے بے ہوش پڑا تھا۔ یکایک وہ پانی میں گر گیا۔ چار خادمات جو وہاں موجود تھیں انھوں نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر اس کو بڑی مشکلوں سے باہر نکالا اور بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر نیا لباس پہنا دیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو سخت دردِ سر کی شکایت کی۔ خادمات نے سارا واقعہ اس کے حضور میں عرض کر دیا۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے چنانچہ انتہائی غصے کی حالت میں اس نے تلوار نکالی اور ان کی التجاؤں اور منتوں کے باوجود انھیں قتل کر دیا۔

نصیر الدین کے انتقال پر مانڈو تقریباً نصف صدی تک لڑائیوں اور جنگوں کا مرکز بنا رہا یہاں تک کہ ۱۵۵۵ء میں ملک بایزید سلطان باز بہادر کے لقب سے تخت نشین ہوا اور سانڈو پر حسن و عشق نے اپنا تسلط جما لیا۔

باز بہادر کو لڑائیوں اور جنگوں سے سخت نفرت تھی لہٰذا اس طرف سے اپنی توجہ ہٹالی۔ روپ متی سے ملنے کے بعد تو وہ بس اسی کا ہو گیا۔ باز بہادر اور روپ متی کے عشق کی داستان عجیب ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن سلطان باز بہادر نربدا کے کنارے شکار کھیلتا ہوا اپنے ہمراہیوں سے الگ ہو کر ایسی پر فضا جگہ پہنچ گیا جہاں روپ متی بیٹھی ہوئی مناظر فطرت پر موسیقی کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ جنگل کے جانور اس کی آواز کی بے پناہ کشش سے اس کی طرف کھنچے آتے تھے۔ روپ متی گانے میں اس قدر محو تھی کہ گرد و پیش کی مطلق خبر نہ تھی۔ باز بہادر بھی گانا سننے میں محو تھا۔ یکایک دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔

روپ متی دھرم پور کے رئیس کی لڑکی تھی۔ جب اس کے باپ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت برافروختہ ہوا اور اس سے کہا کہ ایک مسلمان سے محبت کرکے تو نے اپنے دھرم کا ناش کرلیا ہے۔ اس کی سزا یہ ہے کہ تو موت کے لئے تیار ہو جا اور یہ زہر کا پیالہ تجھے پینا پڑے گا۔

روپ متی نے جواب دیا "مرنا مجھے منظور ہے۔ میں آپ کی عزت برقرار رکھوں گی۔" اس نے زہر کا پیالہ لیا اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی زہر کا پیالہ اس کے ہونٹوں تک بھی نہ گیا تھا کہ خدا کی قدرت سے باز بہادر جسے اس واقعے کی خبر ہو گئی تھی وہاں پہنچ گیا۔ یہ عاشق مزاج سلطان رئیس دھرم پور اور اس کے ساتھیوں کے حملوں کو روکتا ہوا روپ متی کے پاس جا پہنچا اور اس کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ چھین کر زمین پر گرا دیا اور اس کو اپنے ساتھ لے کر اس ہنگامے سے صاف نکل آیا۔

پانچ برس تک باز بہادر اور روپ متی عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ روپ متی ایک بہت اچھی سوار، فن موسیقی کی ماہر اور شاعرہ تھی۔ دونوں ایک ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے جاتے اور موسم گرما کی چاندنی راتوں میں جن کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے "مجھے صبح بنارس، شام اودھ اور شب مالوہ چاہیے" شعر و سخن کا چرچا رہتا۔

لیکن یہ ہنسی خوشی کے دن جلدی ہی گزر گئے۔ ۱۵۶۰ء میں اکبر اعظم کی فتح مند افواج نے مانڈو پر حملہ کر دیا اور باز بہادر نے راہ فرار اختیار کی۔ ایک عرصے تک دونوں فوجوں میں جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ جنرل ادہم خاں نے مالوہ کو پوری طرح سے سخر کرلیا۔ روپ متی ایک پھول بیچنے والی کے بھیس میں بھاگ گئی اور اپنے تینوں بھائیوں سے مدد چاہی۔ ادہم خاں کو جب معلوم ہوا کہ شکار ہاتھ سے جاتا رہا ہے تو اس نے فوج کا ایک دستہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ایک ایک کرکے اس کے تینوں بھائیوں نے اپنی جانیں دیدیں اور روپ متی گرفتار ہو کر مانڈو لائی گئی۔ اس دفعہ بچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس نے ادہم خاں کو لکھا کہ اگر اسے تین دن کی مہلت مل جائے جس میں وہ اپنے آپ کو تیار کرے تو وہ اس سے مل سکے گی۔ ادہم خاں بہت خوش ہوا اور اس کی درخواست منظور کرلی۔ تین دن تک خوب جشن ہوتا رہا تیسرے دن ادہم خاں جب روپ متی کے کمرے میں پہنچا تو اس کو مردہ پایا۔ یوں مر کر روپ متی نے اپنے

لئے حیات جاوید حاصل کرلی۔ مولانا عظمت اللہ مرحوم کی ایک نظم کے دو بند ہیں جن میں اسی واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ

ایک طرف تھی وفا
ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا
جان ہی قربان کی،
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی
موت تیری موت تھی
عشق کی دیوی تیری
موت وہ تھی جان بھی
جس پہ ہے قربان کی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

اجین میں ایک خوبصورت جھیل کے کنارے روپ متی کی خاک دفن ہے اور اس کے قریب باز بہادر بھی ابدی نیند سو رہا ہے۔

اس کے بعد سے مانڈو کا زوال شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر اکثر موسم گرما میں یہاں آیا کرتا تھا اور وہ محض سیر وشکار کی خاطر۔ اور یہیں انگلستان کے پہلے سفیر سر ٹامس رو نے جہانگیر سے ملاقات کی تھی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے مانڈو کی شکستہ اور برباد شدہ عمارات کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں لیکن اس کی قدیم حالت کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں ازمنۂ متوسطہ کے مغربی سیاحوں کی تحریروں کی طرف توجہ کرنا پڑے گی۔ لیٹری لکھتا ہے :

"مانڈو ایک نہایت ہی بلند پہاڑ پر جس کی چوٹی نے ایک وسیع اور ہموار میدان کی صورت اختیار کرلی ہے واقع ہے۔ اس پہاڑ پر جو درخت کھڑے ہیں ان کے درمیان

کچھ ایسا فاصلہ رکھا گیا ہے کہ نیچے سے نظر ڈالئے تو ایک نہایت ہی عمدہ منظر دیکھنے میں آتا ہے۔"

ولیم فنچ لکھتا ہے:۔

"یہ شہر دس کوس لمبا اور چار کوس چوڑا ہے۔ شہر کے اردگرد ایک نہایت ہی خوبصورت مرغزار ہے جس میں جا بجا سولہ خوبصورت تالاب واقع ہیں۔ شہر کا جو حصہ اس وقت موجود ہے اس کی خوبصورتی میں کلام نہیں لیکن اسے قدیم شہر سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں پتھر کی اس قدر مضبوط خوبصورت عمارتیں اور اونچے اونچے دروازے موجود ہیں کہ یورپ کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

یہ حالت تھی مانڈو کی اس زمانے میں جب اس کی عظمت و شہرت کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ بایں ہمہ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی قدیم شان و شوکت کیا ہوگی۔

تنقید و تبصرہ

کتب

جدید اردو شاعری۔ تاج آفرینش۔ آلام حیات۔ مشاہیر اردو کے خطوط۔ رہبر حجاج۔
آرسی۔

جدید اردو شاعری | از عبدالقادر سروری ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی۔ مددگار پروفیسر اردو کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)۔

جدید اردو شاعری کے نام سے عبدالقادر صاحب کی تازہ تصنیف ہمیں موصول ہوئی ہے۔ کتاب تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ حصہ اول میں مصنف نے شعر کی ماہیت، تعریف اور اقسام سے بحث کی ہے اور حصہ دوم میں جدید اردو کے ارتقا کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ حصہ سوم میں جدید شاعری کے ابتدائی دور کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام، پھر ان کے بعد آنے والے شعرا کے حالات اور ان کا کلام پیش کیا ہے۔ اور اس ترتیب کو چار حصوں پر تقسیم کر کے شعرائے مستقبل کا عنوان بھی قائم کر دیا ہے جس میں اس عہد کے بعض نوجوان خوشگو شعرا کے نام نظر آتے ہیں۔

حصہ اول میں اردو شاعری کے اقسام اور اس کی نوعیت کو نہایت خوبی سے واضح کیا گیا ہے اور جا بجا دوسری زبانوں اور مغربی شعرا کے خیالات نقل کئے ہیں۔ اردو شاعری کے خد و خال اس باب سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

حصہ دوم میں قدیم شاعری کے اسباب تنزل سے بحث کی ہے اور اس عہد کے سیاسی انقلابات اور حکومت اسلامی کے زوال کو شاعری کی پستی اور بدمذاقی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ دلچسپ ہے اور اس میں جدید اردو کی تاریخ بھی شامل ہے۔

آخری حصے میں شعرا کے کلام کے نمونے اور ان کے حالات زندگی درج ہیں۔

کتاب بحیثیت مجموعی مفید ہے اور ترتیب و زبان قابل داد۔ شعرائے مستقبل کے عنوان میں کسی قدر جسارت ادبی کا اظہار کیا گیا ہے یا اس باب کا عنوان ایسا ہے کہ مصنف کے دلی مقصد کا اظہار نہیں ہوتا۔ غزل گو شعرا میں شاد عظیم آبادی، ثاقب لکھنوی کا نام نہیں اور شعرائے مستقبل میں بھی بعض نام ایسے ہیں جن کو بہ آسانی شامل کیا جا سکتا ہے لیکن غالباً اس فہرست سے "مشتے نمونہ" کا کام لینا مقصود ہے حصہ مد نظر نہیں۔ افسوس ہے کہ کتابت و طباعت کی خوبی

کتاب کے معنوی محاسن کی ہمسر نہیں اور تصاویر تو ایسی ہیں کہ ان کا نہ ہونا ہی اچھا تھا۔

تاج آفرینش | از جناب عبدالحمید صاحب نعمانی ضخامت ۲۰۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ متوسط، قیمت ۱۰ر

ملنے کا پتہ: (۱) انجمن بک ڈپو پرنسس بلڈنگ بمبئی ۹ (۲) مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

ملک خانم عرف باحثۃ البادیہ مصر کی مشہور وطن دوست اور مصلح خاتون تھی۔ مصری خواتین میں اصلاح و ترقی کی تحریک کو اس نے اس وقت اپنے ہاتھ میں لیا جبکہ مصر میں عورتیں بہت ہی پست اور ذلیل حالت میں تھیں۔ اس نے اپنے مقصد کے لئے زبان و قلم دونوں سے کام لیا۔ جلسوں میں تقریریں کیں اور اخبارات میں مضامین لکھے۔ زیر نظر کتاب اس کے انھیں مضامین کا ترجمہ ہے۔ یہ مضامین تعداد میں سترہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو تقریروں کا خلاصہ بھی درج کیا گیا ہے۔ مضامین سب اہم اور غور و توجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں مثلاً پردہ، شادی، شادی کی عمر، تعدد ازواج، یا سوت عورتوں کے چند عیوب۔ غلط غیرت۔ شوہر کے رشتہ داروں سے نفرت۔ زودرنجی اور جدائی کی دھمکی۔ فضول خرچی اور مقابلہ کی عادت۔ مردوں کے چند عیوب۔ حرص و طمع۔ عورتوں کی تحقیر۔ تعلیمیافتہ مردوں کے گھر میاں بیوی میں تکلف۔ دیہات اور شہر مشرق و مغرب کا نسوانی موازنہ۔ دور ولادت۔ دور طفلی۔ جوانی سے پہلے منگنی اور شادی کا دور وغیرہ۔ ان تمام مضامین میں مردوں اور عورتوں کے ان تمام عیوب و نقائص کو نمایاں کیا گیا ہے جن کی وجہ سے دونوں کی باہمی زندگی اجیرن ہوگئی ہے اور وہ روز بروز مصیبت و پریشانی، تباہی و بربادی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی ان خراب عادات و اخلاق کے اصلاح کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔

یہ مضامین اب سے تقریباً پندرہ سولہ برس پہلے کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس مدت میں مصر میں نسوانی ترقی کی تحریک بہت آگے بڑھ چکی ہے بلکہ بعض موقعوں پر حدود سے تجاوز کر گئی ہے لیکن ہندوستان میں یہ مضامین اب بھی اسی طرح مفید ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلام کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور خیالات بہت معتدل ہیں۔ اصلی مضامین عربی میں تھے۔ جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی نے نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا ہے اور ایک مفید مقدمہ کا بھی اضافہ فرمایا ہے۔ شروع میں باحثۃ البادیہ کے مختصر سے حالات بھی لکھے ہیں اور اس کی تصویر بھی دی ہے۔

آلام حیات | مخمور اکبرآبادی ادبی دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کے مالک ہیں۔ جن لوگوں نے نقاد کے پرچے دیکھے

ہیں وہ مخمور کو ایک بلند پایہ ادیب تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتے۔ نقاد کے بعد مخمور نے گوشۂ عافیت اختیار کر لیا کبھی کبھی نگار میں مخمور نظر آجاتے تھے۔ ان سے ادب اردو کو بہت سی توقعات تھیں، وہ اب مایوسی میں تبدیل ہو رہی تھیں لیکن مقام شکر ہے کہ یہ مایوسی دور ہونیوالی ہے۔ مخمور کے شائع شدہ ادبی مضامین میں سے بعض کو مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے اور یہ اس کا پیش خیمہ ہے کہ مخمور اب پھر ادبی دنیا میں کیف پیدا کریں گے۔

کتاب میں کل ۵ افسانے ہیں اور ہر افسانہ بجائے خود ایک مستقل سامان کیف و تاثر ہے۔ فہرست یہ ہے:۔

(۱) بادشاہ کی محبت میں (۲) بنت البحر (۳) ملکۂ بہار (۴) اسیر بحر (۵) دولھا کی روح۔

جن لوگوں کو ادب لطیف سے ذوق ہے، امید ہے کہ وہ اس مجموعہ کی ضرور قدر افزائی کریں گے۔

آگرہ اخبار پریس کے حسن کتابت و طباعت کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتہ "تسنیم بک ایجنسی آگرہ" یا "رام پرشاد اینڈ برادرس کتب فروش، چوک، آگرہ"۔

مشاہیر اردو کے خطوط | بابو مہیش پرشاد صاحب "مولوی فاضل، ہیڈ مولوی، عربی فارسی اردو ڈپارٹمنٹ ہندو یونیورسٹی بنارس" نے یہ کتاب تیار کی ہے۔ درج شدہ خطوط میں اکثر خطوط شائع شدہ ہیں۔

شروع میں "خطوط اور ان کی اہمیت" پر مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے خیالات کا اقتباس "مکتوبات حالی" سے مولنا سید سلیمان ندوی، مولوی محمد امین صاحب زبیری، مرزا محمد عسکری اور مولنا حالی کے خیالات کے اقتباسات علی الترتیب مکاتیب شبلی، مکاتیب، ادبی خطوط غالب، اور مکاتیب امیر مینائی سے ماخوذ ہیں۔ پھر "عرضداشت مؤلف" کے عنوان سے جناب مؤلف فرماتے ہیں"...... میں نے دیکھا کہ جس طرح مشاہیر اردو کے منتخب مضامین کا مجموعہ درس و تدریس کے حق میں بکار آمد ہے، اسی طرح چیدہ چیدہ خطوط بھی کچھ کم سودمند نہیں ہونگے"۔

امید ہے کتاب بچوں کے لئے "سودمند" ثابت ہوگی، جناب مؤلف کو خطوط کے انتخاب میں ذرا اور وقت نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔

کتابت اچھی، کاغذ عمدہ، طباعت صاف، قیمت ۱۰؍ ملنے کا پتہ: "کے۔ بی۔ اگروالا، شانتی پریس، الہ آباد"۔

۱۔ رہبر حجاج۔ | چھوٹی تقطیع ۸۰ صفحے غالباً مفت۔ ملنے کا پتہ "ہند پریس کلکتہ"۔

۲۔ ہدایات بابتہ حج ۱۹۳۳ء | حکومت نجد و حجاز کی جانب سے ہر سال حاجیوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ایک پمفلٹ

شائع ہوتا ہے جس میں حج کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہوتی ہیں۔ حسب معمول اس سال بھی یہ پمفلٹ عربی میں شائع ہوا تھا۔ ہند پریس کلکتہ نے اس کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے اور جلالۃ الملک سلطان عبدالعزیز کی ان دو تقریروں کا اضافہ کر دیا ہے جو دو مختلف موقعوں پر سلطان نے کی ہیں۔ یہ رسالہ ضرورت مند اصحاب کو مندرجہ بالا پتہ پر مفت مل سکتا ہے۔

اسی قسم اور سائز کا ایک اور رسالہ دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ترتیب میں کچھ فرق ہوگا ورنہ مضامین وہی ہیں البتہ لکھائی چھپائی اور کاغذ نسبتہً بہتر ہے۔ ملنے کا پتہ: "محمد بن حمد السمری، جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ، دہلی"۔

آرسی (مصنفہ نثار حسین خاں صاحب شیدا، حجم ۲۴۰ صفحہ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶، لکھائی چھپائی اوسط درجے کی، کاغذ نفیس چکنا۔ قیمت فی نسخہ مجلد عا۔ ملنے کا پتہ مقبول حسین خاں، دریاباد، الہ آباد)۔

یہ حضرت شیدا الہ آبادی کے ریختی کلام کا مجموعہ ہے۔ ریختی ہمارے ہندوستانی تمدن کے دور تنزل کی یادگار ہے۔ اس زمانے میں کم سے کم ادب اور شاعری کے میدان میں ایجاد اور اختراع کی کمی نہیں تھی لیکن معاشرت کا ذہن اخلاقی پستی کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اس لئے جو چیز نکلی اس رنگ میں رنگی ہوئی نکلی۔ ریختی کا موضوع یہ تھا کہ عورتوں کے خیالات عورتوں ہی کی زبان میں ادا کئے جائیں۔ یہ بجائے خود بہت اچھا خیال تھا لیکن زمانے کی زہریلی آب و ہوا کے اثر سے جو درخت اس بیج سے اگا اس کا پھل پکنے سے پہلے سڑ گیا جس سے اخلاق ایک طرف ذوق شعر بھی پناہ مانگتا ہے۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ اس عہد کی معاشرت کی سچی تصویر ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس شاعری میں ہماری پست معاشرت کا رنگ ہی نہیں جسے دیکھ کر عبرت ہو بلکہ اس کی بو بھی ہے جسے سونگھ کر دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ حضرت شیدا کی ریختی جان صاحب اور میاں رنگین کی ریختی سے غنیمت ہے لیکن اسے پڑھنے میں بھی اکثر ناک پر رومال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال جن لوگوں کو "ارباب نشاط" کی زبان، خیالات اور طرز زندگی سے دلچسپی ہو وہ آرسی میں اپنا منہ دیکھیں اور شرمائیں یا اترائیں یا جو حضرات آجکل کے بازاری نظریۂ جمالیات کے قائل ہوں وہ یہ سمجھ کر اس کا مطالعہ کریں

تو سرمہ بیں و ورق در نورد و دم درکش　　　مبیں کہ سحر نگاہاں سیاہ کارانند

ہمیں تو حضرت شیدا کے ایک شعر سے بڑی تسکین ہوئی۔ خدا کرے ان کی پیش گوئی پوری ہو۔

ریختی گوئی اب آکر ختم شیدا پر ہوئی　　　جان صاحب نے کبھی رنگین نے ایجاد کی

اخبارات و رسائل

سالنامۂ نیرنگ خیال ۱۹۳۳ء - ہمایوں سالگرہ نمبر جنوری ۱۹۳۳ء - نیرنگ سالگرہ نمبر ۱۹۳۳ء - خاص نمبر عالمگیر ۱۹۳۳ء - پیشوا قرآن نمبر - آئینہ - امہات - نوید -

سالنامۂ نیرنگ خیال ۱۹۳۳ء (قیمت عمہ - حجم ۲۰۰ صفحہ - لکھائی چھپائی کاغذ حسب معمول رنگین اور سادہ تصاویر متعدد - سرورق خوشنما - ملنے کا پتہ شاہی محلہ لاہور)

نیرنگ خیال اور اس کا سالنامہ تعارف کا محتاج نہیں - اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ اس پرچے میں قدیم معیار قائم رکھا گیا ہے بلکہ اور ترقی ہوئی ہے - نیرنگ کے پرانے قلمی معاونین کے علاوہ جن میں اردو کے اکثر مشہور مصنف اور مضمون نگار شامل ہیں اس بار نواب نصیر حسین صاحب خیال اور مولوی عنایت اللہ صاحب کے مضامین اور محمود خاں صاحب شیرانی کی ایک نظم بھی ہے - تصویروں کا انتخاب خاص طور پر قابل تعریف ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں کے فوٹو کم ہیں - بعض مضامین ایسے بھی ہیں کہ اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا لیکن اس عیب سے تو اردو کا کوئی رسالہ خالی نہیں -

---

ہمایوں سال گرہ نمبر جنوری ۱۹۳۳ء ایڈیٹر بشیر احمد بی - اے (آکسن) و حامد علی خاں - ضخامت ۱۵۲ صفحات قیمت ایک روپیہ، قیمت سالانہ للعہ مقام اشاعت لاہور -

ہمایوں لاہور کا ایک وقیع، سنجیدہ اور متین رسالہ ہے اور نہایت خاموشی سے علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے - نئے سال کی خوشی میں اس نے بھی ایک خاص نمبر نکالا ہے اور اپنی علمی متانت کے اعتبار سے سال کے تمام خاص نمبروں پر بھاری ہے - اس نمبر کی ضخامت ۱۵۲ صفحات ہے اور کل مضامین نظم و نثر کی تعداد ۳۰ ہے - مضامین ویسے تو سبھی بہت اچھے ہیں لیکن 'خوشی کی تسخیر' (بشیر احمد) 'میرا سخت ترین نقاد' (فلک پیما) 'آزاد نگارستان' اور 'داداجان' (مرزا فرحت اللہ بیگ) 'سکینہ' (فیاض محمود) 'دوست یا دشمن' (پریم چند) خاص طور پر پڑھنے کی چیزیں ہیں - نثر کے ساتھ نظم کا حصہ بھی بہت بہتر ہے - خود بشیر احمد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں - ان کے علاوہ حضرت جوش ملیح آبادی، آزاد انصاری، فراق گورکھپوری، اثر صہبائی، امجد حیدرآبادی جیسے مشہور شعراء کا کلام بھی موجود ہے - تصاویر دس ہیں اور ہر ایک کسی نہ کسی خاص مقصد کی حامل ہے - ٹائٹل بھی بہت خوشنما اور شاندار ہے، غرض مجموعی حیثیت سے یہ نمبر قابل قدر ہے اور اس کے مرتب لائق مبارکباد -

---

نیرنگ سال گرہ نمبر ۱۹۳۲ء | ایڈیٹر عشرت رحمانی قیمت ۸؍ سالانہ چندہ ۳؍ مقام اشاعت دہلی۔

نیرنگ نے رام پور سے دہلی میں منتقل ہونے کے بعد روحانی اور جسمانی ہر اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ منتظمین رسالہ کو ترقی دینے میں بہت عرق ریزی اور جانکاہی سے کام لے رہے ہیں اور موجودہ نمبر اس کا بہترین ثبوت ہے۔

اس خاص نمبر کی ضخامت اشتہارات کے علاوہ ۱۴۰ صفحات ہے۔ مضامین نظم و نثر کی تعداد تقریباً ۴۰ ہو گی۔ مضمون نگاروں میں جناب محمد حسین صاحب ادیب، ایم اسلم، عیش امروہوی، سلطان حیدر جوش، سرفراز حسین قاری، علی عباس حسینی اور شعراء میں مولانا حسرت موہانی، حضرت جلیل، آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی۔ یگانہ لکھنوی، جگر مراد آبادی، محوی لکھنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ "تبرکات غالب" کے زیر عنوان غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل ہے جس نے رسالہ کی وقعت دوبالا کر دی ہے۔ تصویریں کل ۲۰ ہیں اور سب کی سب جاذب نظر۔ اکثر تصاویر پر خاص طور سے نظمیں لکھوائی گئی ہیں۔ ٹائٹل بہت خوبصورت، کاغذ، کتابت وطباعت اور صفائی ستھرائی کے اعتبار سے اس سال کا کوئی خاص نمبر شاید ہی اس کا مقابلہ کر سکے۔

خاص نمبر عالم گیر ۱۹۳۲ء | ضخامت ۱۹۴ صفحات، قیمت ۸؍، چندہ سالانہ للعہ، مقام اشاعت لاہور۔

عالمگیر نے اپنے خاص نمبروں کے اعتبار سے خاص شہرت حاصل کر لی ہے۔ سال میں اس کے تین چار خاص نمبر ضرور نکل جاتے ہیں۔ موجودہ نمبر بھی بہت سی خوبیوں کا حامل ہے۔ بڑا سائز ہے اور ۱۹۴ صفحات کا حجم ہے۔ تقریباً ۱۰ مضامین نظم و نثر ہیں۔ نثر میں علی عباس حسینی، مرزا فرحت اللہ بیگ، اعظمی اجمیری، مولینا احمد ایم۔ اے، ایم اسلم، فہیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی کے مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ حصہ نظم میں دوسرے شعرائے کے علاوہ حضرت جلیل، مولانا محوی، حضرت صفی، حضرت عزیز، ظریف لکھنوی اور یگانہ لکھنوی کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں۔ تصاویر کل ۱۴ ہیں۔ ان میں آٹھ سہ رنگی ہیں۔ ان میں سے اکثر تصویروں پر مشہور شاعروں سے نظمیں لکھوائی گئی ہیں۔ کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط، ٹائٹل خوبصورت اور شوخ۔

پیشوا قرآن نمبر | ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ۶؍، مقام اشاعت دہلی۔

ایڈیٹر صاحب رسالہ پیشوا کا یہ عمل خیر شکریہ کا مستحق ہے کہ انھوں نے اس مقدس مہینہ کی مناسبت سے

ایک ضخیم نمبر نکال کر قرآنی علوم و فنون سے متعلق بہت سے قیمتی مضامین یک جا فراہم کر دئے۔ اس نمبر میں کل ۲۰ مضامین نظم و نثر ہیں اور سب کے سب مقدس و محترم کلام پاک سے متعلق ہیں۔ یہ مضامین عام مسلمانوں کے لئے خاص طور پر بہت مفید ہیں اور انھیں قرآن کے فہم میں یقیناً بہت مدد دیں گے۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب، مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی، کے اسمائے گرامی بھی نظر آتے ہیں۔

ان خوبیوں کے علاوہ رسالہ میں دس تصویریں بھی ہیں اور اکثر دنیا کی مشہور مساجد جامع قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ وغیرہ کی ہیں۔ غرض یہ رسالہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپی نیز اضافۂ معلومات کا موجب ہے۔

ویسے بھی یہ رسالہ ہر ماہ مفید مذہبی معلومات پیش کرتا رہتا ہے۔ باوجود اس کے عام افادہ کے خیال سے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے یعنی قسم اول کی (جو اعلیٰ چکنے کاغذ پر چھپتا ہے اور چار صفحے فوٹو بلاک کے ہوتے ہیں) عا ہے اور قسم دوم کی (جس کا کاغذ معمولی ہوتا ہے اور تصاویر بھی نہیں ہوتیں) عہ۔ ضخامت دونوں پرچوں کی اسی صفحے ہوتی ہے اور باوجودیکہ قیمت اس قدر کم ہے ایڈیٹر صاحب جنوری میں ڈیڑھ سو صفحے کا قرآن نمبر اور جولائی میں ڈھائی سو صفحے کا رسول نمبر بھی اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

آئینہ | ماہوار مصور رسالہ سائز ۲۲×۲۰/۱۶ ایڈیٹر سید ابن الحسن صاحب فکر ایم اے۔ قیمت سالانہ عہ، مقام اشاعت دہلی۔

سید ابن الحسن صاحب اردو کے مشہور اور مشاق اخبار نویس ہیں۔ عرصے تک الہلال مرحوم (کلکتہ) میں کام کر چکے ہیں۔ ان کی نگرانی اور ادارت میں جو چیز بھی نکلے گی وہ قابل قدر اور لائق اطمینان ہوگی۔

اس وقت ہمارے سامنے آئینہ کا پہلا پرچہ ہے۔ اس میں علمی ادبی سبھی طرح کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں خود جناب فکر، خواجہ عبدالرؤف عشرت، مولوی عبدالمالک آروی، حضرت ملا رموزی، حضرت احسن مارہروی، اور جناب وحشت کلکتوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے ساتھ قیمت بہت کم رکھی ہے اور اسی لئے امید ہے کہ رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرے گا۔

امہات | ہفتہ وار، مدیر خصوصی قمر النساء بیگم، چندہ سالانہ سے، فی پرچہ ۱، مقام اشاعت بھوپال۔

یہ مفید اخبار جناب محمود الحسن صاحب صدیقی سابق ایڈیٹر کے زیر انتظام و نگرانی اور قمر النساء بیگم صاحب کی ادارت میں بھوپال سے نکلا ہے۔ پہلا اور تیسرا نمبر اس وقت پیش نظر ہیں تمام مضامین طبقۂ نسواں کے لئے مفید اور لائق مطالعہ ہیں۔ ترتیب میں بھی خاص صفائی اور سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔ محمود الحسن صاحب سے امید ہے کہ وہ کتابت و طباعت کی جانب خاص طور پر توجہ کریں گے۔

نوید | ہفتہ وار، ایڈیٹر سید حسن ریاض، چندہ سالانہ للعہ فی پرچہ ار مقام اشاعت گھسیاری منڈی لکھنؤ۔

مرحوم روزنامۂ ہمت کے بند ہو جانے کے بعد لکھنؤ میں ایک سنجیدہ مسلمان روزنامہ کی کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اور سید حسن ریاض صاحب سابق ایڈیٹر ہمت برابر اس کوشش میں مصروف تھے کہ ہمت کو دوبارہ زندہ کیا جائے لیکن ان کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں اور اب اس طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ایک اردو پریس ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی ہے جس کے زیر انتظام روزانہ اور ہفتہ وار اخبار شائع کئے جائیں گے۔ سردست ہفتہ وار اخبار نوید کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے۔ روزانہ اخبار کچھ دنوں بعد نکلے گا۔

ہفتہ وار نوید کے مدیر و مرتب جناب سید حسن ریاض ہیں۔ اخبار کی ضخامت ۱۶ صفحے ہے۔ اس کی ترتیب کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے صفحہ پر اقتباسات ہیں، تیسرے پر واقعات حاضرہ پر سرسری نظر کے عنوان سے مختصر نوٹ ہیں، چوتھے پر افتتاحیہ، اس کے بعد مفید سیاسی پھر علمی، ادبی اور مذہبی مضامین، علاوہ بریں نظمیں بھی ہیں۔ ایک افسانہ بھی ہے۔ غرض وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ہفتہ وار پرچہ میں ہونی چاہئیں۔ پالیسی ابھی تک "مرنجاں مرنج" ہے۔ ترتیب میں سلیقہ اور مضامین میں سنجیدگی ہے۔ توقع ہے کہ اخبار آیندہ مزید ترقی کرے گا اور ایسوسی ایشن مذکور روزانہ اخبار نکالنے میں بہت جلد کامیاب ہو گا۔

دنیا کی رفتار

اسلامی ممالک

ترکی | ترکی حکومت نے سمسون سے لے کر سیواس تک تقریباً ڈھائی سو میل لمبی ریل کی پٹڑی مکمل کر لی ہے اور اس طرح بحر اسود کو وسط اناطولیہ سے ملا دیا ہے۔ قیصری کے راستے سے انقرہ سے لے کر سیواس تک تو ریل ۱۹۳۰ء میں ہی مکمل ہو چکی تھی اس لئے اب استامبول سے سمسون تک انقرہ ہو کر ریل کا سفر ممکن ہو گیا ہے۔ وسطی اور مغربی ریلوے لائنوں کو ملانے کا کام جو توطاہیہ سے بالقیسر تک ہو رہا تھا اب قریب ختم ہے اور صرف ایک سرنگ نکالنے کی اور ضرورت ہے۔ قیصری سے الوق الیشلا تک کام جاری ہے جو تقریباً دو برس میں ختم ہو جائے گا۔ اس طرح بحر اسود سے بحر ایجین تک مسلسل ریل ہو جائے گی۔ انقرہ اور فلیوس کے درمیان کی لائن کا افتتاح بھی غالباً ۳۴ء میں ہو سکے گا۔ یوں بحر اسود کے کنارے جو کوئلے کی کانیں ہیں ان کا تعلق براہ راست انقرہ اور ملک کے اندرونی حصے سے ہو جائیگا۔ بغداد ریلوے کا اضافہ دیار بکر تک بھی اس وقت تک ہو جائیگا۔ یہ تمام کام حکومت کی موجودہ آمدنی سے ہو رہا ہے اور بہت جلد ترکی میں ریلوں کا ایک ایسا جال بچھ جائے گا جو نہ صرف معاشی ترقی کے لئے بلکہ ملک کی حفاظت کے لئے بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

... ...

ترکی زبان کو خارجی خصوصاً عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کرنے کی تحریک میں خود مصطفےٰ کمال پاشا سب سے زیادہ حصہ لے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے حال میں کاظم پاشا صدر مجلس کو ایک تار دیا ہے جس میں کوئی لفظ عربی یا فارسی کا نہیں لکھا ہے۔

... ...

۲۰ اگست کو درآمد پر جو پابندیاں حکومت کی طرف سے عائد کی گئی تھیں ان سے تاجروں میں ایسی بے چینی پھیلی کہ مصطفےٰ شریف بے وزیر اقتصاد کو استعفا دینا پڑا۔ ان کی جگہ پر جلال بے کا تقرر ہوا جنھوں نے فوراً درآمد اور برآمد کے ضوابط میں اہم تبدیلیاں کیں۔ اب ترکی صنعتوں کے لئے جن خام اجناس کی ضرورت ہے ان کا داخلہ بغیر کسی

پابندی سے ہو رہا ہے۔

مصر | وزیراعظم صدقی پاشا نے ابھی یورپ کا سفر کیا تھا اور اپنے قیام کو اس لئے ذرا طویل کر دیا کہ وہ اطالوی اور فرانسیسی حکومتوں سے مصری قرضے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ مصری قرضۂ عامہ کی قسطیں سونے کے ذریعے ادا کی جائیں یا پاؤنڈ اسٹرلنگ کے ذریعے۔ سنا جاتا ہے کہ صدقی پاشا کی اس خواہش کو کہ ادائیگی اسٹرلنگ کے ذریعے ہو اطالوی حکومت نے نظر قبول سے دیکھا ہے۔

... ...

روئی کا نرخ گر جانے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب اس رقبے میں جس میں روئی کی کاشت ہوتی تھی بہت کمی ہو گئی ہے۔ حکومت کے احکام سے تو صرف ایک تہائی رقبے کی کمی لازمی تھی مگر فلاحین نے خود اس سے زیادہ تخفیف کی اور اب مشکل سے نصف رقبے میں روئی کی کاشت ہوتی ہے۔ زیادہ تر تو روئی کی جگہ گیہوں نے لے لی ہے۔ اب اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلے کا نرخ بھی بہت گر گیا۔ حکومت نے گیہوں اور آٹے کی درآمد پر محصول بڑھا دیا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ مصر کو کم از کم ان اجناس کے لئے کافی بالذات بنا دے۔ اب تک پچاس لاکھ ڈالر کا گیہوں بالخصوص آسٹریلیا سے ملک میں آیا ہے۔ حکومت نے فلاحین کو فصل کی ضمانت پر جو قرضے دئے تھے ان کی ادائیگی بالکل نہیں ہو رہی ہے۔ اب صرف دو صورتیں رہ گئی ہیں یا تو یہ کثیر رقم معاف کر دی جائے اور یوں حکومت کا نقصان ہو یا غریب فلاحین کے چھوٹے چھوٹے قطعات اراضی ضبط کر لئے جائیں۔

شام | کچھ روز ہوئے دمشق میں مجلس وزرار کا ایک جلسہ ہوا جس میں اقتصاد کا مسئلہ پیش تھا۔ پنشن کی مد میں سرکاری ملازموں کی تنخواہ میں سے اب تک ۷ فی صدی وضع ہوتا تھا۔ اب یہ رقم بڑھا کر ۱۰ فی صدی کر دی گئی ہے۔ تاوان، انعامات اور زائدات کی ادائیگی بالکل بند کر دی گئی۔ موٹر الاؤنس نسوخ کر دیا گیا۔ اخراجات سفر میں ۲۵ فی صدی کی تخفیف کی گئی اور دفتری اخراجات میں ۲۰ فی صدی کی۔ یہ تجویز بھی منظور ہوئی کہ ساٹھ سال کی عمر کے عہدہ دار یا وہ لوگ جو چالیس سال ملازم رہ چکے ہیں وظیفہ دے کر علیحدہ کر دئے جائیں۔ بعض کمیشن منسوخ کر دئے گئے اور اگلے سال کے لئے رفاہ عامہ کی مد میں صرف ایک لاکھ پینتالیس ہزار شامی پاؤنڈ کی منظوری دی گئی۔

افغانستان | افغانستان پر حکومت کرنا آسان نہیں۔ باشندوں کا اختلاف، دشوار گذار گھاٹیاں اور سرداران قبائل کی سرکشی ایسے عناصر ہیں کہ مشکل سے کوئی بادشاہ اس ملک میں امن چین سے اپنی حکومت کے دن گذار سکتا ہے۔ امیر امان اللہ خاں کی حکومت کا جو انجام ہوا اس سے شاید ہی کوئی بے خبر ہو۔ خیال تھا کہ اب نادر خاں کے عہد میں امن و امان رہے گا۔ مبصرین کہتے تھے کہ انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کرلی ہیں اور اب کم ازکم ان کی زندگی میں کوئی خطرہ نہیں لیکن یک بیک خبر آئی کہ ایک مشہور سردار کو اس جرم میں سزائے موت دی گئی کہ انھوں نے حکومت کے خلاف سازش کی تھی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ نادر شاہ کے بھائی سردار شاہ ولی خاں کے ساتھ سردار غلام نبی خاں بھی کابل جاتے ہوئے ہندوستان سے گذرے تھے۔ کون یہ خیال کرسکتا تھا کہ چند ہی روز کے بعد ان کو سزائے موت ملے گی۔ سردار غلام نبی خاں امیر عبدالرحمٰن خاں کے مشہور سپہ سالار غلام حیدر خاں کے لڑکے اور یوسف زئی قبیلے کے سردار تھے۔ ان کا اثر نہ صرف افغانستان ہی میں بہت تھا بلکہ روس کے ارباب حل وعقد کو ان سے ایک زمانے میں بہت توقعات تھیں۔ یہ ایک عرصے تک روس میں افغانستان کے سفیر بھی رہ چکے تھے اور ۱۹۲۹ء کے اوائل میں امان اللہ خاں کی مدد کے لئے روسی علاقے کے باشندوں کی ایک فوج لے کر افغانستان پہنچے تھے۔ جب امان اللہ خاں جنگ سے دست بردار ہوگئے تو غلام نبی خاں نے خود حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی، اسی وجہ سے ان سے اور نادر شاہ سے مخالفت چلی آتی تھی لیکن نادر شاہ نے غلام نبی خاں کے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور جب یہ خبر آئی کہ غلام نبی خاں شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل واپس جارہے ہیں تو یہ امید بندھی تھی کہ اس ناگوار مخالفت کا دور اب ختم ہو جائے گا اور غلام نبی خاں نادر شاہ کی موافقت میں اپنے اثر کو کام میں لائیں گے

اسی دوران میں جنوبی افغانستان میں ایک بغاوت رونما ہوئی جس کے ابھارنے والے امیر امان اللہ خاں کے قریبی رشتے دار تھے اور جن میں سے ایک نے اپنے آپ کو عنایت اللہ صبی مشہور کر دیا تھا۔ حکومت اس بغاوت کو جلد دبا دینے میں کامیاب ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی سلسلے میں کچھ ایسے کاغذات ملے جن سے یہ بات یقین کے درجے تک پہنچ گئی کہ غلام نبی خاں بھی اس سازش میں شریک تھے۔ چنانچہ ان کو فوراً گرفتار کرکے بغاوت کے الزام میں قومی جرگے کے سامنے پیش کیا گیا۔ جرگے نے تمام واقعات پر غور کرنے کے بعد سزائے موت تجویز کی اور گرفتاری کے چار ہی دن کے اندر ان کو پھانسی دیدی گئی۔ اس بااثر سردار کے افسوسناک انجام کا افغانستان پر کیا اثر ہوگا؟ ممکن ہے کہ یوسف زئی قبیلہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اتنے بڑے سردار کا قتل لوگوں کی ہمت پست کردے۔ بہرحال اس وقت تو نادر شاہ کو بغاوت کے اس آسانی سے فرو ہو جانے

کی وجہ سے بہت تقویت پہنچی ہے اور کچھ دنوں تک غالباً کسی کو ہتھیار اٹھانے کی جرأت نہیں ہوگی۔

ایران | ایران میں اینگلو پرشین آئل کمپنی کو جو مراعات حاصل تھیں ان سے انگریزوں کو اب تک بہت فائدہ پہنچا ہے لیکن جب سے رضا شاہ کی حکومت قائم ہوئی ہے ایرانیوں کو یہ بات بہت گراں گذر رہی تھی اور حکومت آہستہ آہستہ اس کمپنی کے اقتدار کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ادھر دو تین سال سے کمپنی نے یہ اور ستم کیا کہ طرح طرح کے بہانے بنا کر اس رقم کو کم کرنا شروع کیا جو ایرانی حکومت کو سالانہ ملنی چاہیئے تھی۔ حکومت نے جب شکایت کی تو کہا یہ گیا کہ آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس پر حکومت نے اس محصول کی تعداد دریافت کی جو گذشتہ زمانے میں کمپنی نے انگلستان میں ادا کیا ہے تاکہ اس سے آمدنی کا پتہ چل سکے کمپنی نے اپنے حسابات کے پیش کرنے سے انکار کیا۔ اب حکومت کو موقع ملا اور اس نے مراعات کے منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کمپنی نے حکومت کو اطلاع دی کہ وہ یہ مسئلہ ہاگ کی بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کرے گی۔ حکومت ایران نے جواب دیا اگر یہ قضیہ مجلس اقوام کے سامنے پیش ہو تو اسے کوئی عذر نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک کمیٹی مجلس اقوام نے اس مسئلے کی تحقیقات کے لئے مقرر کر دی ہے۔ حکومت ایران کا دعویٰ ہے کہ جو مراعات دستوری حکومت کے قیام سے پہلے کسی کو بھی حاصل تھیں وہ اس حکومت کی طرف سے نہیں کبھی جا سکتیں اور اس حکومت کو ان کے منسوخ کرنے کا پورا حق ہے۔ انگلستان میں منسوخی کی خبر سے بہت تشویش پھیل گئی ہے اور حکومت انگلستان کی طرف سے ایک بہت ہی سخت تحریر ایران کی حکومت کے پاس پہنچی ہے لیکن ایران کی حکومت اپنی بات پر اڑی ہوئی ہے۔ ایران میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو تمام ملک میں خوشی منائی گئی اور چراغاں کیا گیا۔ اس مسئلے کا قانونی پہلو کچھ بھی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب کسی قوم میں احساس خودداری پیدا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے ملک میں کسی قسم کی خارجی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتی اور ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت ایران کی بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اگر یہ کمپنی وہاں سے علیحدہ ہو جائے تو ایرانی خود مٹی کے تیل کے کارخانوں کا اچھا انتظام نہ کر سکیں مگر یہ بات خارج از بحث ہے۔ یہ مسئلہ معاشی یا اقتصادی نہیں ہے بلکہ نفسیات قومی سے تعلق ہے اور اسے اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

انگلستان | ۱۰ نومبر کو پارلیمنٹ کا ایک اجلاس ختم ہوا اور ۲۲ نومبر کو دوسرا اجلاس شروع ہو گیا۔ حسب معمول دونوں موقع

پر ملک معظم کی تقریریں ہوئیں۔ شاید کم ایسا ہوا ہو گا کہ بادشاہ کی طرف سے پارلیمنٹ میں اتنے کم فصل سے دو تقریریں ہوئی ہوں۔ پہلی تقریر میں حکومت کے کاموں پر تبصرہ تھا اور دوسری میں ان کارروائیوں کی طرف اشارہ جو پیش نظر ہیں۔ دونوں تقریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت انگلستان کے سامنے سب سے اہم مسئلہ اپنی تجارت اور ملکی معیشت کو درست کرنے کا ہے۔ ملک معظم نے پہلی تقریر میں فرمایا کہ "میں بہت خوش ہوں کہ اوٹاوا کی معاشی کانفرنس نہایت کامیابی سے ختم ہوئی۔ اس کانفرنس میں میری سلطنت کے مختلف حصوں کے نمائندے موجود تھے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی وجہ سے میری سلطنت کی مختلف اقوام میں روابط باہمی اور مضبوط ہو جائیں گے اور سلطنت کی تجارت کو فروغ ہو گا۔"

اس کے بعد آئرلینڈ کا سرسری سا ذکر تھا، اور ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنے وزیر اعظم کے تصفیہ کی تعریف اور اس بات پر اظہار مسرت کہ قومی صرف اور آمدنی میں توازن قائم ہو گیا ہے اور قرضوں کو ادا کرنے اور دوسرے نئے قرضوں میں تبدیل کرنے کی کارروائیاں نہایت کامیابی سے انجام پا چکی ہیں۔ "توازن تجارت کو جو ہمارے مخالف تھا قانون محاصل درآمد کے ذریعے درست کر لیا گیا ہے۔ اس وسیلے سے خاصی آمدنی کا انتظام بھی ہو گیا ہے اور ایک غیر جانبدار مجلس شوریٰ کی ہدایت میں برطانوی صنعتوں کے لئے معقول تامین کی تدبیر بھی نکل آئی ہے۔"

دوسری تقریر میں تخفیف اسلحہ اور ہندوستانی گول میز کانفرنس کا ذکر بھی تھا، لیکن خاص زور اس میں بھی تجارت کو فروغ دینے کے وسائل پر ہی تھا۔ ملک معظم نے فرمایا کہ "میری حکومت تجارت کو روبراہ لانے کے لئے ہر طرح کی کوششیں جاری رکھے گی۔ قیمتوں کے گرنے سے زراعت کا حال ایک مدت سے بہت زبوں ہے، میرے وزراء کو پورا احساس ہے کہ ہر چند کہ جو کارروائیاں انھوں نے حال میں گوشت اور دوسری زرعی پیداوار کے سلسلے میں کی ہیں ان سے واقعی مدد پہونچی ہے پھر بھی اس مقصد کے لئے کہ زراعت کو ہماری قومی معیشت میں اس کی واجبی جگہ دی جا سکے مزید تدابیر ضروری ہیں۔"

تقریر میں بے کاری کے بیمہ کے متعلق ایک قانون کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، نیز لگان پر کچھ پابندیاں عاید کرنے کے لئے ایک قانون کا۔ جن لوگوں کو توقع تھی کہ پارلیمنٹ کے ایوان اعلیٰ کی اصلاح کے متعلق بھی ان تقریروں میں کچھ ارشاد ہو گا وہ ضرور مایوس ہوئے ہوں گے۔

ایک اہم تقریر اور ممالک کی طرح برطانیہ کے لئے بھی بے کاری کا مسئلہ بہت تشویشناک ہے۔ ہر ستر مزدوروں میں تقریباً ۱۴ بے کار ہیں۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں ۴ نومبر کو اس مسئلہ پر جو مباحثہ شروع ہوا وہ برابر تین روز تک جاری رہا۔

حکومت کی طرف سے کوئی نئی دلیل یا نئی تجویز پیش نہیں کی گئی۔ وزرار کی تقریروں کا لب لباب بس یہ تھا کہ ہم نے ہرممکن کوشش کی ہے کہ برطانوی صنعت کو تباہی سے بچالیں اور اگر ہماری کوششیں کامیاب نہ ہوتیں تو معاملات ابتک بہت نازک ہو چکے ہوتے۔ یہ صحیح بھی ہے لیکن بہرحال بے کاری کا مسئلہ موجود ہے اور اس کے حل کی اور تدبیریں سوچنا اور ان پر عمل کرنا حکومت وقت کا اولین فرض ہے۔ اس ضمن میں سر رابرٹ ہارن کی تقریر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ حکومت جہاز بنانے والی کمپنیوں کو کم شرح سود پر روپیہ قرض دے جس طرح ۲۰سال پہلے کونارڈ کمپنی کو دیا گیا تھا۔ سر رابرٹ نے قیمت کے متعلق کہا "ہم نے جب پچھلی دفعہ اس مسئلہ پر بحث کی تھی اس وقت سے بجائے اس کے کہ قیمتیں بڑھتیں سونے کے اعتبار سے تو قیمتیں کچھ گھٹی ہی ہیں۔ پونڈ اسٹرلنگ میں قیمتیں تقریباً وہی ہیں جو اس وقت تھیں جب ہم نے معیار طلائی کو ترک کیا تھا اگرچہ پونڈ مقابلۃً گرا ہے اور واقعہ ہے کہ آج پونڈ سے ہم اس سے زیادہ اجناس خرید سکتے ہیں جتنی ۱۹۲۷ء میں خریدتے تھے۔"

پھر سر رابرٹ نے یہ سادہ معاشی اصول بیان فرمایا کہ "قیمتیں یا تو اس طرح بڑھ سکتی ہیں کہ اجناس کی مقدار کم کی جائے یا اس طرح کہ زر کی مقدار بڑھائی جائے" پہلی کوشش کی جاچکی ہے اور سب دیکھ سکتے ہیں کہ ناکام رہی۔ اب دوسری تدبیر کو کیوں نہ آزمایا جائے۔ انھوں نے بتلایا کہ سونا دنیا میں کم ہے لہذا زر رائج میں اضافہ سونے کی بنا پر تو ہو نہ سکے گا۔ لہذا ان کی رائے ہے کہ چاندی کو پھر بطور زر کام میں لانا چاہیے۔ اس تجویز میں بہت سے باثر امریکن اور فرانسیسی مدبر بھی سر رابرٹ کے ہمنوا ہیں اور معاشی معاملات پر خود ان کی رائے بہت توجہ کی مستحق سمجھی جاتی ہے؛ اس لیے ممکن ہے کہ یہ تجویز عمل کا جامہ پہنے اور چاندی کا بازار جلد تیز ہو جائے۔

دنیا میں بے کاری ذیل میں ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اکثر مغربی ممالک میں کیسی بیکاری پھیلی ہوئی ہے۔

دنیا کے بیکار

ملک	مزدوروں میں فی صدی	کل آبادی میں فی صدی
ریاست ہائے متحدہ	۲۱،۹	۸،۶
جرمنی	۱۸	۹،۲
کینیڈا	۱۳،۹	۵
آسٹریلیا	۱۳،۱	۷،۲
انگلستان	۱۲،۷	۵،۸
چیکوسلوویکیا	۱۲،۲	۵،۴
ہالینڈ	۹،۶	۳،۸
اٹلی	۵،۴	۲،۶
فرانس	۴،۶	۲،۴
سویڈن	۳،۹	۱،۶

جرمن پارلیمنٹ | ہم پچھلے پرچے میں جرمنی کے جدید انتخابات کا ذکر کر چکے ہیں۔ ذیل کے نقشے سے قابل ذکر سیاسی جماعتوں کی قوت کا اندازہ ہوسکے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان میں دو سوا دو برس کے اندر کیا تغیر ہوا ہے۔

خان شلائشر | گذشتہ اشاعتوں میں ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ اس وقت جرمنی میں سب سے زیادہ بااثر آدمی جنرل خان شلائشر ہیں۔

اور جرمن سیاست میں ایک عرصہ سے پس پردہ ان کی قوت کارفرما ہے۔ حالات نے رفتہ رفتہ انھیں سامنے آنے پر بھی مجبور کر ہی دیا اور اب یہ جدید جرمن حکومت میں وزیراعظم ہیں۔ جرمن پارلیمنٹ میں سیاسی جماعتوں کی تقسیم کچھ ایسی ہے کہ صحیح جمہوری طرز کی حکومت کا قیام ممکن نہیں۔ لہذا ایسے شخص کی تلاش تھی جس کا ساتھ کچھ عرصے تک تو اکثریت دے سکے۔ چنانچہ صدر جمہوریہ نے فان شلائشر کے سپرد وزارت بنانے کا کام کر دیا اور غالباً موجودہ حالات میں اس سے بہتر انتخاب مشکل تھا۔

فان شلائشر کے وزیراعظم ہونے سے ظاہر ہے کہ فرانس میں تشویش پیدا ہوگی۔ اس لئے کہ یہ حال ہی میں وزیر جنگ کی حیثیت سے جرمن فوج کی تنظیم نو کی دھمکی دے چکے ہیں۔ لیکن فان شلائشر کو نرا فوجی سپہ سالار سمجھ لینا غلطی ہے۔ یہ سیاست کی گتھیوں سے خوب واقف ہیں اور ابھی وزیراعظم ہونے سے پہلے مختلف جماعتوں سے جو گفتگو ہوتی رہی اس میں اپنی سیاسی صلاحیت کا اچھا ثبوت دے چکے ہیں اور توقع کی جاسکتی ہے کہ دوسری دول سے سیاسی معاملات میں ان کا رویہ ہر چند کہ ذرا سخت ہوگا لیکن ایسا نہیں کہ مفاہمت کی راہ مسدود ہو جائے۔

ہندوستان

اسمبلی کا خاص اجلاس | اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کا خاص اجلاس پچھلے ہفتہ ختم ہو گیا۔ موجودہ دستور اساسی کے نفاذ کے بعد مرکزی مجالس کا یہ تیسرا خاص اجلاس تھا جو منعقد کیا گیا ہے۔ پہلا خاص اجلاس ٹاٹا کمپنی کی مصنوعات کی تامین منظور کرنے کی غرض سے شملہ میں ہوا تھا، دوسرا اجلاس گذشتہ سال حکومت ہند کے ضمنی میزانیہ کی منظوری کے لئے منعقد ہوا اور یہ تیسرا خاص اجلاس معاہدۂ اوٹاوا کی تصدیق اور قانون فوجداری کی ترمیم یعنی آرڈیننس بل کی منظوری کے لئے منعقد ہوا تھا۔ معاہدۂ اٹاوا تجارتی نقطۂ نظر سے اور آرڈیننس بل سیاسی حیثیت سے ہندوستان کی رائے عامہ کے نزدیک خاص اہمیت رکھتے تھے جس کا اظہار ہر ممکن طریقہ سے کیا جا چکا ہے لیکن بڑی رد و قدح اور بحث و تمحیص کے بعد بالآخر جو فیصلہ ہوا وہ ہر چند کہ توقعات کے خلاف نہیں ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رائے عامہ کے خلاف ضرور ہے۔

... ...

معاہدۂ اوٹاوہ کے مختلف پہلوؤں پر رسالہ جامعہ کی گذشتہ دو اشاعتوں میں بحث کی جا چکی ہے آرڈیننس

شذرات

ملک کے مشہور مصنف اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی ہند قدیم کی ایک مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں۔ اس کا مقدمہ مکمل ہو چکا ہے اور ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع ہونے والا ہے جس کا حجم تین سو صفحے سے کم نہ ہوگا۔ اس میں چالیس عنوانات قائم کئے گئے ہیں جو حسب ذیل مطالب پر مشتمل ہیں:۔

۱۔ علم تاریخ کی تعریف، اس کے موضوع کا تعین اور اس کی اہمیت کی بحث۔

۲۔ اقوام عالم کی ابتدائی زندگی، ان کی تقسیم نسل، مذہب اور تمدن کے اعتبار سے اختلاف مذاہب کی حقیقت، مذہب اور تمدن کی فضیلت کا معیار۔

۳۔ آریا قوم کے قدیم وطن اور قدیم تمدن کی تحقیق، آریوں اور ایرانیوں کی مذہبی مماثلت۔ اور فارسی اور سنسکرت کے تعلق پر تبصرہ۔

۴۔ تاریخ ہند قدیم کے ماخذ۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابیں، مہابھارت، رامائن اور دوسرے تاریخی پوران۔

۵۔ دوسری اقوام کے مورخوں کی تحقیق تاریخ ہند قدیم کے متعلق، یونانی واقعہ نگاروں اور چینی سیاحوں کی روایات۔ قدیم ایرانی نوشتوں اور شاہنامۂ فردوسی کی شہادت مسلم مورخین اور یورپی مورخوں کی تحقیقات۔

۶۔ زمانے کا تعین اور سن وسال کا استعمال۔

اس کتاب کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ' ہندو اور آریہ کی وجہ تسمیہ ' کے عنوان سے ' جامعہ ' کے جنوری نمبر میں شائع ہو رہا ہے اور کچھ حصے دوسرے رسالوں میں چھپیں گے۔ اس کے بعد جلد سے جلد مکمل کتاب طبع ہو جائے گی۔ اصل تاریخ ترتیب پانے کے بعد کئی حصوں میں شائع کی جائے گی۔

... ...

اس کتاب کی تالیف میں مصنف نے جتنا وقت صرف کیا ہوگا اور جس محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہوگا اس کی پوری پوری قدر تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں خود علمی تحقیق کی کٹھن راہ پر چلنے کا تجربہ ہے

لیکن تھوڑا بہت اندازہ ہر پڑھے لکھے آدمی کو نمونہ دیکھنے سے ہوسکتا ہے جو اس پرچے میں موجود ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ ملک کی اقتصادی حالت اور علم کی بے قدری کی بدولت کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کتاب کا چھپوانا ہے۔ یہ مشکل اب تاریخ ہند قدیم کے مؤلف کو بھی پیش آرہی ہے۔ وہ علم دوست حلقوں سے مدد چاہتے ہیں مگر صرف اتنی مدد کہ جو حضرات یہ کتاب خریدنا چاہتے ہوں وہ اپنا نام خریداروں کی فہرست میں لکھوالیں تاکہ اس کے چھپنے کے ساتھ ہی ان کے نام وی۔ پی بھیج دیا جائے۔ صحیح قیمت ابھی متعین نہیں ہوئی لیکن غالباً مؤلف سے دریافت کرنے سے تخمینی قیمت معلوم ہو جائے گی۔ ہمارے خیال میں یہ ذراسی زحمت گوارا کرنے میں ارباب ذوق کو تامل نہ ہوگا اور وہ فوراً مؤلف کے پاس نجیب آباد ضلع بجنور کے پتے سے فرمائش بھیج دیں گے۔ کم سے کم اتنی اعانت تو مؤلف کا حق اور ہر علم دوست کا فرض ہے۔

جامعہ ملیہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو اخباروں میں یہ خبر پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی ہوگی کہ جناب ڈاکٹر انصاری مدظلہ العالی کو یورپ کے قیام اور اطبائے یورپ کے علاج سے بہت فائدہ ہوا اور اب موصوف کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن اس بات سے ابھی کسی قدر تردد ہے کہ انھیں قلب کی کمزوری کی شکایت بدستور باقی ہے۔ معالجوں نے انھیں یہ مشورہ دیا ہے کہ حتی الامکان ان عملی سیاسی کاموں میں شرکت سے پرہیز کریں جن سے قلب پر مضر اثر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات ملک کی سیاست خصوصاً اتحاد اور مصالحت کی تحریکوں سے اس حد تک وابستہ ہے اور خود موصوف کے ایثار اور جوش عمل کا یہ عالم ہے کہ اس مشورے پر پوری طرح عمل کرنا بہت مشکل ہے لیکن ان کے مخلص دوست جن میں ہر خیال اور ہر طبقے کے لوگ خصوصاً ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی رہنما شامل ہیں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ ان کی واپسی پر ان سے درخواست کی جائے کہ کم سے کم چند سال تک اپنی صحت کے خیال سے عملی سیاسی مشاغل سے علیحدہ رہیں۔ اب دیکھنا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

... ...

بہرحال ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ قیام یورپ کے زمانے میں ان کا وقت زیادہ تر علمی تصنیف و تالیف میں گذرا اور قومی تعلیم سے جو دلچسپی انھیں ہمیشہ سے ہے وہ اب اور بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان معدودے چند ارباب فکر اور ارباب عمل میں سے ہیں جنھیں اس کا پورا احساس ہے

کہ ملک اور قوم کی ترقی بلکہ قومیت کی تعمیر کے لئے ایک صحیح تعلیمی پالیسی ناگزیر ہے اور یہ مسئلہ اور سب چیزوں سے بڑھ کر توجہ کا مستحق ہے۔ خدا کرے اب ان کو تعلیمی کاموں میں حصہ لینا اور خصوصاً اپنی عزیز تعلیم گاہ جامعہ ملیہ کی خدمت کرنے کی فرصت پہلے سے زیادہ ملے۔

فرہ ٔلائن فلیسبورن ایک جرمن خاتون ہیں جن کا ایک عرصے سے یہ فیصلہ تھا کہ ہندوستان آکر وہ اپنی زندگی جامعہ ملیہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ ایک عرصے تک وہ جناب شیخ الجامعہ سے خط و کتابت کر کے جامعہ کے مفصل حالات معلوم کرتی رہیں اس کے بعد انھیں پروانہ راہداری حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ سب مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد اب وہ یہاں پہنچ گئی ہیں اور جامعہ کی برادری میں شامل ہو کر انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ان کے سپرد چھوٹے بچوں کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے کودنے کی نگرانی ہے اور انھیں انگریزی بھی پڑھاتی ہیں۔ بعض کالج کے طلبہ ان سے جرمن زبان میں درس حاصل کرتے ہیں۔ موصوفہ نے برلن یونیورسٹی میں کچھ عرصے تعلیم پائی ہے اس کے بعد جرمنی کے مشہور پستالوتسی انسٹی ٹیوٹ میں بچوں کی تعلیم اور تربیت کا طریقہ اصولی اور عملی طور پر سیکھا ہے۔ مدت تک انگلستان میں قیام کر چکی ہیں اور انگریزی زبان پر پوری قدرت رکھتی ہیں۔ اب اردو بھی سیکھ رہی ہیں اور امید ہے کہ بہت جلد جامعہ کے بچوں سے ان کی مادری زبان میں گفتگو کرنے لگیں گی۔ ہم ان خاتون کا سب جامعہ والوں کی طرف سے بہت گرم جوشی سے استقبال کرتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں ہندوستان کی آب و ہوا اور جامعہ کی زندگی راس آئے اور وہ اس تعلیم گاہ کی وہ مفید خدمات انجام دے سکیں جن کی خاطر وہ اپنا گھر بار چھوڑ کے اور انتہائی ایثار کر کے تشریف لائی ہیں۔ انھیں دیکھ کر ان لوگوں کے دل کو جو پہلے سے جامعہ کی خدمت کر رہے ہیں بہت تقویت پہنچتی ہے اور ان کے عزم میں استقامت پیدا ہوتی ہے کہ جب ایک غیر ملک غیر قوم کی خاتون کو ہندوستانی مسلمانوں کے اس ادارے کے مقاصد اس قدر پسند آئے اور ان کے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی کہ انھوں نے سمندر پار سے آکر برائے نام معاوضے کے بدلے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تو ہم اسے جتنا عزیز رکھیں اور اس کی خاطر جو کچھ برداشت کریں وہ کم ہے۔

رمضان مبارک میں اردو اکادمی کا کوئی جلسہ نہیں ہو سکے گا۔ امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ کی

تحریک پر ترکی کے مشہور مدبّر رؤف پاشا صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ فروری میں جب وہ ہندوستان تشریف لائیں گے تو پہلے دہلی آکر جامعہ ملیہ میں چند خطبے غالباً قدیم اور جدید ترکی کے متعلق دیں گے۔ ان خطبوں کے صحیح عنوان اور تاریخ اور وقت کی اطلاع ہم آیندہ پرچے میں دے سکیں گے اور مقامی ممبران اکادمی کی خدمت میں حسب معمول دعوت نامے روانہ کئے جائیں گے۔

اعلان

رسالہ جامعہ کا ایک مکمل فائل یعنی جنوری سنہ ۱۹۲۳ء سے جب سے کہ وہ نکلا ہے آج تک یعنی دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء تک دس سال کا فروخت کیلئے موجود ہے اس میں نہ کوئی پرچہ کم ہے نہ کوئی پرچہ خراب ہے۔ قیمت بجائے پچاس روپے کے تیس روپے محصول بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی

رجسٹرڈ
نمبر ۱۰۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۲۰
بابت ماہ مارچ ۱۹۳۳ء
نمبر ۳
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۰ | بابتہ ماہ مارچ سنہ ۳۳ء | نمبر ۳

فہرست مضامین — صفحہ

(محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ قرولباغ سے شائع کیا)

روح تہذیب

تہذیب کا ایک نظریہ وہ ہے جو مذہب اور اخلاق کی تعلیم سے متاثر ہو کر ان لوگوں نے پیش کیا ہے جو انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کو مقدم اہمیت دیتے ہیں اور انسان کی اخلاقی اور مذہبی سیرت کو پختہ اور مستحکم بنانا چاہتے ہیں اس نظریے کے مطابق سیرت انسانی کی تہذیب کیلئے اس قسم کی صفات لازم ہیں جیسے صداقت ایمانداری عقیدے کی پختگی، ایثار اور خلوص۔ اگر ان کے مطمح نظر کو ایک لفظ میں ادا کیا جا سکے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان کو مجاہد بنانا چاہتے ہیں۔ جو ایمان اور عقیدے کا پکا ہو شکوک و شبہات سے محفوظ ہو۔ اپنے عقائد پر سختی سے عامل ہو اور ان کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے لئے تیار ہو۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ تمام لوگ جو مذہبی ہونے کا یا مذہبی سرگرمی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ان اوصاف سے متصف ہوتے ہیں یا ان سب کی تائید کرتے ہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مذہب کی تعلیم کے اثر سے بہت سے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ان صفات کا اظہار کیا ہے اور جریدۂ عالم پر اپنا سکہ دوام ثبت کر دیا ہے۔

تہذیب کا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے جو انسانی زندگی کے اجتماعی اور تمدنی پہلو کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی میل جول، داد و ستد، مراسم اور تعلقات میں لطف اور خوشگواری پیدا کریں۔ اس معنی میں مہذب شخص وہ کہلاتا ہے جس کو آداب محفل سے بخوبی واقفیت ہو، لوگوں کے ساتھ شائستگی اور مروت سے پیش آئے ان کے جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہ لگائے اور کم از کم ظاہراً ان کا احترام کرے۔ اس سے ان کی مراد صرف اتنی ہی نہیں کہ روزمرہ کے میل ملاقات میں ناگواری پیدا نہ ہو بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے انسان اپنے حقوق و فرائض کو پہچانے اور اپنے اقوال و اعمال کی حدود سے واقف ہو کر زندگی بسر کرے جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے وہ نہ صرف

دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بلکہ انجام کار خود بھی زک اٹھاتے ہیں۔

تہذیب کا تیسرا مفہوم جو صدیوں تک تعلیم کی بحثوں اور تعلیم کے عمل پر مسلط رہا ہے یہ ہے کہ انسان میں بہت سی قوتیں اور صلاحیتیں ایسی ہیں جو تربیت کی محتاج اور اظہار کے لئے بے چین ہیں۔ ان کی ایک قدر مستقل ہے خصوصًا ان قوتوں کی جن کا تعلق ادب اور فنون لطیفہ کی تحصیل اور تخلیق و تحسین سے ہے۔ تہذیب یافتہ ہونے کے معنی ہیں ان قوتوں کی تربیت اور ابھار۔ انسان کی زندگی محض حیوانی خواہشات تک محدود نہیں بلکہ اس کو تلاش حق اور مشاہدۂ جمال کی کاوش بھی رہتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے کیٹس کے لئے ہر حسین مرقع مسرت دائمی کا سرمایہ دار تھا۔ اس کی طرح ہر تہذیب یافتہ انسان میں یہ صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ حسین مناظر اور اشیاء سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس میں حسن شناسی کی قابلیت ہو۔ وہ ادب، موسیقی، مصوری اور شاعری کی تخلیق و تحسین کا ذوق رکھتا ہو۔ اس مفہوم کے مطابق آرٹسٹ کے انہاک میں ہمیں تہذیب کی شان نظر آتی ہے اور آرٹ کی نیرنگیوں میں ایک مہذب انسان کے لئے زندگی کا مشغلہ موجود ہے لیکن کام، محنت، مزدوری، دست کاری وغیرہ جس کے ذریعہ عام لوگ اپنی روزی کماتے ہیں مقابلتہً حقیر اور کم درجے کے مشاغل ہیں جن کو نہ صرف یہ کہ تہذیب سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ ان لوگوں کے تہذیب حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدت تک بلکہ اب بھی آزاد یا لبرل تعلیم سے دماغی تعلیم یا فنون لطیفہ کی تعلیم مراد لی جاتی ہے اور جسمانی محنت اور مشاغل کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔

ان تینوں نظریوں میں سے ہر ایک میں بعض قابل قدر عناصر ایسے ہیں جن کے امتزاج سے تہذیب نفس کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بجائے خود اس کے پورے اور صحیح مفہوم پر حاوی نہیں بلکہ اگر ان میں سے کسی ایک پر بھی شدت اور مبالغہ کے ساتھ عمل کیا جائے تو انسان کی تہذیب و تربیت ناقص رہ جائے گی۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ تم مکمل تہذیب یافتہ انسان کی تصویر پیش کرو تو اس کے خد و خال بنانے میں شاید سب سے پہلے میں رواداری کی صفت کو پیش کروں۔ ممکن ہے آج کل کے زمانے

میں جب ہر جماعت بلکہ ہر فرد اپنے اپنے مخصوص اور بظاہر جداگانہ مفاد کے لئے جد و جہد کر رہا ہے اور جماعتی وفاداری اور تعصب کو تقریباً ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے یہ کہنا بے وقت کی راگنی معلوم ہو لیکن میرا پرخلوص عقیدہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کے لئے رواداری کی صفت پیدا کئے بغیر تہذیب کی منزل تک پہنچنا ممکن نہیں بہت سے نیک نیت اور نیک نفس لوگوں کی خوبیوں پر محض اس وجہ سے پانی پھر جاتا ہے کہ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی وہ اپنی زندگی کو خود اپنے اور دوسروں کے لئے ایک عذاب مستقل بنا لیتے ہیں۔ انھیں یہ خیال نہیں گذرتا کہ حکمت الٰہی اس امر کی مقتضی ہے کہ انسانوں میں اختلافات ہوں اور وہ ان کا احترام کریں۔ سائنس اور جمہوریت کے اس دور میں جب انفرادیت کی تکمیل کے بغیر قومی ترقی ناممکن ہے، تنگ نظری اور تعصب خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔ دماغی بیداری اور نشوونما اسی جماعت میں ممکن ہے جس کے افراد میں ذہنی کشادگی ہو جن کی دلچسپیاں متنوع ہوں جو علاوہ اپنے تنگ اور محدود ذاتی اغراض و مقاصد کے دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی دلچسپی کے ساتھ شرکت کریں۔ ہندوستانی تہذیب کی تباہی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں بھی شدت کے ساتھ تعصب اور تنگ نظری سرایت کر گئی ہے جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اس بیسویں صدی میں جب کہ ہندو مذہب پانچ ہزار سال پرانا ہو چکا ہے۔ مہاتما گاندھی کو اچھوتوں کی آزادی کے لئے اپنا نقد حیات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میرے عقیدے کے مطابق، باوجود ہر قسم کی علمی اور فنی ترقی کے۔ باوجود ان تمام کارناموں کے جو ہند و تمدن کے امتیاز کا باعث ہیں ایسی سوسائٹی جو اس طرح انسانی حقوق اور رواداری کا خون کرے سراسر نفی تہذیب کرتی ہے یہی حکم ان تمام قدیم تمدنوں اور معاشروں پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے مختلف صورتوں میں اپنے بعض افراد کی حق تلفی کی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان پر ظلم کو روا رکھا خواہ وہ غلامی کی رسم ہو یا عورتوں کی حق تلفی ہو یا کمزور اقوام کے حقوق پر دست درازی ہو بے شک اس اصول کو قائم کرنے سے ہمیں افلاطون کے زمانے کی سوسائٹی سے لیکر امریکہ جیسے متمدن اور مہذب ملک تک کی شان میں گستاخی کرنی پڑیگی اور خود ہندوستانیوں کے احساس خودی کو ٹھیس لگے گی لیکن ہم کسی طرح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ صحیح انسانی تہذیب کا تقاضا یہ ہے

کہ ہم تمام انسانوں سے رواداری اور عدل کا برتاؤ کریں۔ جو فرد یا جماعت اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتی ہے وہ تہذیب سے عاری ہے خواہ اسکی سطحی تہذیب کیسی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو۔

رواداری کے مفہوم میں ایک طرف تو یہ داخل ہے کہ انسان دوسروں کے جذبات اور خیالات کو سمجھے اور انکا احترام کرے اور اپنی ذات میں اس درجہ وسعت پیدا کرے کہ اس میں دوسروں کا دکھ درد بھی سما سکے دوسری طرف اسمیں یہ صفت شامل ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں اور قصوروں کو فیاضی کیساتھ جانچے اور ایک سخت گیر قاضی کیطرح ان پر حکم لگانے کے بجائے ایک اہل دل انسان کیطرح ان کی وجہ اور علت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے یعنی اسے چور کو پکڑنے اور سزا دینے سے زیادہ اس بات کی فکر اور کاوش ہو کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے اس شخص کو سیدھے راستے سے ہٹا کر اس راستے پر ڈال دیا۔ جو شخص ہمیشہ دوسروں کے لئے محتسب بنا رہتا ہے ان کی عیب جوئی کرتا رہتا ہے انکی لغزشوں کو معاف کرنیکے لئے تیار نہیں بلکہ ان پر سختی کرنا اور انھیں عذاب الیم کا مزہ چکھانا اپنا فرض سمجھتا ہے وہ ممکن ہے ایک اعلیٰ اخلاقی سیرت کا مالک ہو لیکن وہ تہذیب کے ایک نہایت لازمی اور شیریں عنصر سے محروم ہے اسمیں وہ فراخدلی اور رواداری نہیں ہے جو مجرم اور جرم میں امتیاز کرتی ہے جسکی وجہ سے ہمارے دل میں ایک بدبخت مجرم کو دیکھکر بھی یہ خیال گذرتا ہے کہ اگر توفیق الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو کیا عجب ہے کہ آج ہم بھی اسی حالت میں ہوتے یعنی وہ صفت جسکی بدولت عارضی اور اتفاقی فرق کی بنا پر ہم اپنی مشترک انسانیت کا احساس نہیں کھونے پاتے۔ یہ وہ حقیقی انسانی ہمدردی رحم اور انکسار ہے جو بعض لوگوں میں فطرتاً ودیعت ہوتا ہے اور بعض میں بہت سے تجربے اور آزمائشیں اٹھانیکے بعد پیدا ہوتا ہے اور بعض پر اس کا ذرا سا پرتو بھی نہیں پڑتا۔ ایسی ہمدردی اور فراخدلی کی مثالیں ہمیں ادب میں بھی ملتی ہیں اور اگر ہم خوش قسمت ہوں تو عملی زندگی میں بھی کبھی کبھی ایسے انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ جو اس تہذیب حقیقی کے حامل اور شمع بردار ہیں۔ جو باوجود اپنے مواقع کے تنگ اور محدود ہونے کے باوجود جاہل اور ناواقف اور ناتجربکار رہنے کے اپنی فطرت کی گہرائیوں میں ایثار، محبت، ہمدردی اور رواداری، سمجھنے اور معاف کرنیکے ایسے خزانے رکھتے ہیں جنکے مقابلے میں حقیقت میں نظروں کے سامنے علم اور تجربے کی بھی کوئی وقعت نہیں بیشک علمی مشاغل اور مذاق کی مناسبت اور اتحاد بہت قابل قدر چیزیں ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنکو اپنے دوستوں اور عزیزوں میں یہ نعمت میسر ہو لیکن ان سے زیادہ وقیع ہیں محبت اور ہمدردی کے وہ رشتے جن کو موت بھی نہیں توڑ سکتی کس کام آئینگی آخری ساعت

میں دماغی مناسبت اور اتحاد اور وہ ذہنی رشتے جن کو قائم کرنیکا لوگوں کو شوق ہوتا ہے۔ اسوقت انسان کو یہ چیزیں اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی ہیں یعنی یہ کہ وہ زندگی کی محض بیرونی نمائش ہیں۔ بچہ جب تاریکی کے بھوتوں سے ڈرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ دوسرے بھی اس کے خوف میں شریک ہوں یا اس خوف کی نفسی وجہ اس کو سمجھائیں" وہ اس گرم اور محبت بھری آغوش کی تلاش کرتا ہے جس میں پناہ لے کر اپنے ڈر کو بھلا سکے۔ اسے اس شفیق اور تسکین بخش ہاتھ کی تلاش ہوتی ہے جس کو تھام کر وہ اس خوف کا مقابلہ کر سکے۔ بے شک امید، ایمان اور صداقت ضروری ہیں لیکن ضرورت ہے انسانیت کے لئے سب سے زیادہ بعض ہندوستانی ماؤں کی سی محبت کی جس میں انتہائی بے نفسی ہو، صبر ہو، ان تھک تحمل ہو، ایسی محبت جس کو خطائیں اور لغزشیں کم نہ کر سکیں، جو کسی معاوضہ کی طالب نہ ہو، جس میں محبت الٰہی کی جھلک ہو۔ اس کے مقابلے میں اور تمام انسانی تجربے اور جذبات ہیچ اور پوچ ہیں۔

رواداری کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے دو باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اخلاقی عیوب اور برائیوں کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے اور جرم اور گناہ کے ساتھ رواداری برتے۔ نہیں! اسے جرم اور مجرم میں، گناہ اور گناہ کرنے والے میں تمیز کرنی چاہئیے بحیثیت ایک با اخلاق آدمی کے اس کا فرض ہے کہ وہ جرم کے تدارک کی کوشش کرے اور اس کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کرے لیکن بحیثیت ایک انسان کے اسے مجرموں کے ساتھ ہمدردی رکھنی چاہئیے اور انھیں راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرنی چاہئیے۔ جب حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں نے جنکو دعوائے تقدس تھا اور اپنے متعلق بہت خوش فہمی تھی، میری مگڈلین پر لعنت ملامت کی بوچھار کی اور اس کو سنگسار کرنا چاہا تو اس عارف ربانی نے جس کی نظر اوروں سے زیادہ گہری اور دل اوروں سے زیادہ فراخ اور روادار تھا، اپنی آواز بلند کی: "پہلا پتھر وہی شخص پھینکے جس نے خود کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو" نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ جو پتھر پھینکنے کے لئے اٹھے تھے اپنی اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گئے اور کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ دل کے چور کو فراموش کر کے نظر کے سامنے والے چور پر ہاتھ اٹھائے۔ اسی طرح جب رسالتمآب بحیثیت ایک فاتح کے دوبارہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے جہاں انھوں نے اہل مکہ

ہاتھوں ہر طرح کی ایذائیں اور بے حرمتی اٹھائی تھی جہاں لوگوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کا خاتمہ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا تھا۔ تو آپ کی زبان پر یہی اعلان تھا کہ لاتثریب علیکم الیوم اور دل میں یہ دعا تھی کہ بارالہٰا تو میری قوم کی خطاؤں سے در گذر کر کیونکہ وہ لاعلمی اور جہالت میں گرفتار ہیں اسی طرح اس جلیل القدر پیغمبر کے برگزیدہ نواسے نے جو تاریخ عالم کا سب سے بڑا مجاہد تھا خلق اور رواداری کی یہی شان کربلا کے میدان میں دکھائی جب کہ وہ ایسی مصیبتوں اور آزمائشوں میں گھرا ہوا تھا جن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کی تمام عمر عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں بسر ہوئی ہے۔ اس کے مخالف وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ صرف اسلام اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے بلکہ شقاوت اور ظلم میں درندوں سے بھی کہیں بدتر ہیں لیکن یہ خدا کا محبوب بندہ باوجود اپنے زبردست تقدس اور عظمت کے اپنی انسانی ہمدردی کو زندہ رکھتا ہے اور قاتل کے خنجر کے نیچے بھی سجدے میں پڑا ہوا ان ظالموں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے! یہ ہے تہذیب اور انسانیت کا انتہائی کمال جسکی پیروی کرنے کی کوشش اور آرزو ہر انسان کو کرنی چاہیئے خصوصاً ان لوگوں کو جنھیں اسلام سے توسل کا دعویٰ اور اس پر فخر ہے۔ کیونکہ خود پیغمبر اسلام نے اپنی وجہ بعثت یہی بتائی تھی کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) اور لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ تخلقوا باخلاق اللہ (خود کو اخلاق الٰہی سے متصف کرو) اخلاق کا یہ تقاضا نہیں کہ انسان ذرا سی نیکی کر کے اوچھے برتن کی طرح چھلک پڑے۔ نہ خطاکاروں کے حالات پر غور کرے۔ نہ ان کی نیت معلوم کرنے کی کوشش کرے بلکہ ایک بلند مقام سے اُن پر حکم لگانا شروع کر دے۔ خدائے تعالیٰ کی نظر میں عزت اس شخص کی ہے جس کو تقویٰ یعنی خوف خدا ہو۔ "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" اور سب سے بڑا گناہ غرور اور تکبر ہے جس نے ابلیس کو جو فرشتوں کا سردار تھا ہمیشہ کے لئے ذلیل و خوار کر دیا۔ جو زاہد اپنے زہد اور اتقا پر نازاں ہے اس کی عبادت گذاری کا پیشکش بھی درگاہ الٰہی میں قبول نہیں لیکن ممکن ہے کہ وہ نکتہ نواز اس رند کو سرفراز کر دے جو نیازمندی کی شان سے اس کے سامنے جھکتا ہے۔

زاہد غرور کرد و ملامت نہ برد راہ   رند از رہ نیاز بدار السلام رفت!

دراصل تہذیب کا مسئلہ عدل اور توازن کا مسئلہ ہے یعنی ہیں مختلف قوتوں اور مطالبات کے درمیان

بلکہ مختلف اچھی اور مستحسن صفات کے درمیان ایک خاص تناسب قائم کرنا ہے ہم نے ابھی غرور اور نیازمندی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں سچی تہذیب ہمسے بیک وقت دو ایسی صفات کی طالب ہے جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں ایک طرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کو بحیثیت انسان ہونیکے اپنی حقیقی وقعت اور عظمت کا احساس ہو اور وہ یہ جانے کہ وہ بیشمار امکانات کا مالک اور حامل ہے جن کو عمل میں لانا اور ان کے ذریعے عالم فطرت کو تسخیر کرنا اس کا فرض ہے۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی عقل کو بڑی حد تک توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور اسے اس کے فطرتی ماحول پر بہت بڑی قدرت حاصل ہوگئی ہے جو شخص عاجزانہ تقدیر پرستی کا شکار ہوجائے اور اس دنیا میں جو عالم اسباب ہے ہاتھ باندھ کر منتظر رہے وہ کوئی مفید کام انجام نہیں دے سکتا۔ ہمارے نزدیک وہ نہ تہذیب یافتہ ہے نہ بن سکتا ہے کیونکہ ہم تہذیب کے فعالی مفہوم کے قائل ہیں اس کو ایک جامد اور مجہول چیز بنانے کیلئے تیار نہیں۔ جب اس میں اس احساس کی بدولت صحیح عزت نفس پیدا ہوتی ہے تو وہ نظام عالم میں اپنی اہمیت کو پہچانتا ہے اور یہ خود شناسی معرفت الٰہی کا زینہ ہے۔ یہ پاس نفس اسی شخص میں پیدا ہو سکتا ہے جس کے اعمال و افعال کی محرک خود اس کی ذات ہو، دوسروں کی تقلید یا خواہش تحسین یا خوف ملامت اس کا راہبر نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تنگ نظر یا خودغرض یا نفس پرست ہو بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کے خیالات اور عقائد اس کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ ہوں اور وہ یہ جانے کہ بحیثیت انسان کے اسے ایسی آزادی فکر و عمل حاصل ہے جس سے کوئی قوت اسے محروم نہیں کر سکتی۔ جن لوگوں کے جذبات و خیالات اور اعمال و افعال دوسروں کا عکس ہوتے ہیں وہ محض رسم و رواج یا فیشن کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں نہ حقیقی جرأت پیدا ہوتی ہے نہ عزت نفس۔ ایسے شخص کو ہم اپنے نظریے کے مطابق مہذب کہنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

اس عزت نفس کے ساتھ ساتھ جو انسان سے اس کے امکانات کا احترام کراتی ہے، اسے یہ بھی احساس ہونا چاہیئے کہ عالم کائنات کی بے اندازہ وسعت کے مقابلے میں اس کی ہستی بہت چھوٹی اور کمزور ہے اور باوجود اسکی علمی اور عملی ترقی اور انکشافات کے اس کا علم و قدرت دونوں محدود ہیں۔ یہ خیال اس کے دل میں سچا عجز اور انکسار پیدا کرتا ہے جو غلط اور جھوٹی خاکساری سے بہت مختلف ہے اس کی شناخت یہ ہے کہ اس عجز کی وجہ سے انسان کے قوائے عمل معطل نہیں ہوجاتے بلکہ ان کو جد و جہد کی دعوت ملتی ہے لیکن وہ اپنی کامیابی پر غرور نہیں

کرتا۔ نیوٹن جیسے عالم متبحر کا یہ قول کہ "علم کے بحر ذخار کے سامنے میری واقفیت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بچہ سمندر کے کنارے بیٹھا ہوا کنکریوں سے کھیل رہا ہو" تہذیب نفس اور مذہبی جذبے پر دلالت کرتا ہے اور سچے عجز کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ دنیا میں جس قدر صحیح معنوں میں بڑے آدمی گذرے ہیں ان سب میں یہ بات مشترک تھی کہ انھوں نے اپنی ذات کے متعلق کبھی غرور یا تکبر نہیں کیا، انھوں نے کبھی دوسرے انسانوں کو ذلیل نہیں سمجھا اور ان کے مقابلے میں اپنی فوقیت نہیں جتائی۔ یہ تہذیب اور شرافت کی بہت بڑی پہچان ہے۔ ہر انسان بحیثیت ایک انسان ہونے کے ایک قدر مستقل کا مالک ہے اس لئے کسی کو اپنے علم یا وجاہت یا پرہیزگاری کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو حقیر سمجھے۔ ایسے لوگ خواہ وہ جلیل القدر پیغمبر ہوں جیسے حضرت عیسیٰ، آنحضرتؐ، یا معاشرتی اور سیاسی رہنما جیسے مہاتما گاندھی، ہمیشہ انسانوں سے ان جیسے انسان بنکر ملتے ان کے پاس آنے، ان سے ملنے جلنے، اپنا دکھ درد اور اپنی کمی اور کمزوری ان کو بتانے میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی باک نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ مثلاً بعض انتخاب کے امیدواروں کی طرح مصنوعی اور جھوٹے انکسار سے کام لے کر اپنی بلندی سے اتر کر دوسروں کی سطح پر آئیں بلکہ وہ قدرتاً اور خود بخود دوسروں کو اپنی سطح تک بلند کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی انسانیت مصلحت وقت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ ان کے دلی جذبات اور فطری احساسات کا اظہار ہوتی ہے۔ میں کسی ایسے شخص کو مہذب انسان ماننے کے لئے تیار نہیں جو انسانیت کی حرمت کو نہ پہچانے اور تنگ نظری کی وجہ سے خود کو ہمیشہ دوسروں سے بلند تر اور بزرگ تر سمجھے۔ جو شخص تقدس کا دعویٰ کرتا ہے یا اپنی دولت، علمیت، یا وجاہت نسبی کی بنا پر غریبوں، جاہلوں، کم حیثیت لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے وہ نہ صرف تہذیب سے عاری ہے بلکہ اس میں احساس تناسب اور ذوق ظرافت بھی مفقود ہے کیونکہ وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ خدا کی کائنات کس قدر وسیع ہے اور اس کے مقابلے میں اس کے بلند آہنگ دعاوی کیسے مضحک اور مہمل معلوم ہوتے ہیں۔ مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ اس قادر مطلق کی نظر میں ہر قسم کی خدمت کی وقعت اور اہمیت یکساں ہے بشرطیکہ وہ خلوص سے کی جائے، خواہ وہ کسی ملک کی سیاست کا چلانا ہو یا زمین کا کھودنا، مذہب کی تبلیغ کرنا ہو یا سڑکوں اور مکانوں کی غلاظت کو دور کر کے ان کی صفائی کرنا۔ ہم اس بات کی وجہ اور مصلحت نہیں سمجھ سکتے کہ کیوں ایک شخص کے حصہ میں شہرت اور عزت و افتخار کی زندگی

آتی ہے یا کسی مہتم بالشان مقصد کے لئے شہرت اور ناموری کے ساتھ جان دینا اور دوسرے کے حصّہ میں
ایک ایسی زندگی جو شروع سے آخر تک اندھیرے میں ٹٹولنے کے مانند ہو اور جس کا انجام گمنامی اور ذلّت
ہو۔ ہم یہ نہیں جانتے۔ لیکن ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ جو مفید کام بھی خلوص کے ساتھ کیا جائے وہ مقبول ہے اور
اس کی وقعت مسلّم۔

لہٰذا ہم تہذیب کے لئے ایک شرط لازم یہ قرار دیتے ہیں کہ ہر انسان اس مشترک انسانیت کے رشتے
کا احترام کرے جو اسے دوسروں سے ملاتا ہے اور کسی خارجی یا نمائشی فرق کی وجہ سے خود کو دوسروں سے
برتر اور اعلیٰ تر نہ سمجھے۔ نہ ہی اسے کسی شخص کو اس بنا پر حقیر سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ اس کے کام کی نوعیت
بہت معمولی ہے یعنی یہ کہ مثلاً وہ چمار یا خاکروب یا کمہار ہے۔ ان کاموں کی ضرورت مستقل ہے اور ان کو
تہذیب کا مخالف یا اس سے بے تعلق سمجھنا ہمارے نظریہ تہذیب کی رو سے کسی طرح جائز نہیں بے شک یہ
نقطۂ نظر تہذیب کے قدیم اور مستند مفہوم کے بالکل خلاف ہے لیکن موجودہ اخلاقی اور فلسفیانہ تحریکات اور بہترین
قدیم تعلیمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ محنت، مزدوری اور تہذیب میں کوئی
لازمی تناقص نہیں۔ گذشتہ زمانوں میں گرچہ لوگوں نے تہذیب کے مفہوم کو ان چند مشاغل تک محدود کر دیا تھا
جن میں وہ اپنے ذاتی شوقوں، مثلاً علم کی تحصیل، عبادت گذاری، فنون لطیفہ کی تخلیق و تحسین کی تشفی کرتے
تھے اور اس کو دنیاوی مکروہات اور عملی زندگی کی کشمکش سے گریز کرنے کیلئے ایک جائے پناہ سمجھتے تھے
لیکن تہذیب کا یہ مفہوم نہایت سطحی، نہایت ناقص اور اوچھا ہے اس میں زندگی کا جو شیلا خون بالکل
ندارد ہے۔ یہ ایک قسم کی دماغی اور روحانی خود غرضی کا مرادف ہے اور اصلیت کے بجائے بیرونی جلا
اور نمائش پر زور دیتا ہے۔ اس مفہوم کی رو سے تہذیب کا سرچشمہ کتابیں اور درسی علوم ہیں اور اس کا مقصد
ہے تنہائی میں انفرادی قوتوں کی تربیت کرنا۔ لیکن ہم تہذیب کو بیکار یا کار معلومات کا مجموعہ ماننے کیلئے
تیار نہیں اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ جو شخص مخزن علوم ہو وہ مہذب انسان بھی ہو بلکہ گمان غالب
یہ ہے کہ وہ تہذیب سے بے بہرہ رہیگا کیونکہ اس کی دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوگی یا کتابیں نہ کہ انسانی
زندگی اور اس کے وہ تلخ و شیریں تجربات جن کی چاشنی چکھنے کے بعد آدمی انسان بنتا ہے ہمیں بارہا ایسے

لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو باوجود عالم اجل ہونے کے تہذیب سے محروم ہوتے ہیں پروفیسر اشپرانگر نے اپنے نظریہ نفسیات میں انسانوں کی جو قسمیں قرار دی ہیں ان میں ایک قسم Der akademische Mensch یعنی نظری انسان کی بھی ہے جو تلاش حق اور طلب علم کو اپنا مقصد حیات سمجھتا ہے اور اس میں بالکل محو اور فنا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا آدمی قابل قدر ہے اور اپنے نتیجہ کار کی رو سے خدمت خلق کر رہا ہے لیکن بحیثیت ایک معاشرتی فرد کے اگر اس کو اپنے گرد و پیش کے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اگر وہ ان کے دکھ درد اور مشاغل میں شریک نہ ہو، علاوہ علمی معاملات کے اور تمام معاملات کی طرف سے بے اعتنائی کرے، اس کی قوت عمل معطل ہو جائے، وہ انسانی جذبات کا احترام نہ کرے تو ہم اسکو بحیثیت انسان کے بہت ناقص اور تہذیب سے عاری سمجھیں گے۔ تہذیب کا جدید نظریہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد کام اور خدمت اور عملی تجربے پر رکھنی چاہئیے نہ کہ کتاب اور نظری علوم پر وہ تہذیب جو افراد میں حقیقی شرافت اور انسانیت کی روح پیدا کرتی ہے محض مطالعہ یا عبادت گذاری یا آرٹ میں انہماک کا نتیجہ نہیں بلکہ خدمت خلق سے، محنت سے، دوسرے انسانوں کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے، ان کے جذبات و خیالات کو سمجھنے ان سے ہمدردی اور محبت کرنے اور ان کے رنج و راحت میں شریک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ تجربات دل کو نرم اور دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ کارلائل کا یہ قول مشہور ہے کہ "کام عبادت ہے۔ ہر کام جو خلوص سے کیا جائے برکت کا باعث ہے جس شخص کو یہ برکت نصیب ہے اسے اور کوئی برکت طلب کرنیکی ضرورت نہیں" خدمت بشرطیکہ وہ خلوص اور دانشمندی کے ساتھ کی جائے رحم کی صفت کی طرح "دو چند متبرک ہے" وہ اس کیلئے بھی برکت ہے جو خدمت کرے اور اس کے لئے بھی جس کی خدمت کیجائے اس خدمت کے طفیل علمی کام کرنے والوں میں وہ برتری کا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا جو انھیں محنت مزدوری کرنے والوں سے جدا رکھتا ہے اور بسا اوقات معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے ہر وہ تحریک جو "تحریک خاکساراں" کی طرح لوگوں میں محنت اور خدمت کے شوق اور صلاحیت کو بڑھائے تہذیب کی اشاعت میں براہ راست مدد دیتی ہے۔

لیکن یہ خیال رکھنا چاہئیے کہ رواداری کا ایک غلط مفہوم وہ بھی ہے جو آج کل رائج ہو گیا ہے اور جو اسکو تقریباً بے اعتنائی کا مرادف قرار دیتا ہے تعلیم یافتہ گروہ میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو رہا ہے جن کے نزدیک کسی

اصول یا عقیدہ کی کوئی اہمیت نہیں نہ تو خود ان کے کوئی پختہ اصول اور عقائد ہیں نہ وہ دوسروں سے ان کے اصول اور عقائد پر اختلاف یا جھگڑا کرتے ہیں ان کے نزدیک سب برابر ہیں اس لئے وہ سب کی طرف سے یکساں بے پروائی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ابنائے جنس پر محتسب بنا کر نہیں بھیجے گئے ہم اپنے بھائیوں کے رکھوالے نہیں ہیں چنانچہ جن امور کے متعلق ارباب فکر شدت کیساتھ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا ہے یا نہیں۔ سیاست میں فلاں مسلک صحیح ہے یا کوئی اور اچھوتوں کو حقوق دئے جائیں یا نہیں۔ عورتوں کا نظام معاشرت میں کیا مرتبہ ہے' انسان کی زندگی کا منشا جلب منفعت ہے یا خدمت خلق۔ ان سب مسائل کی ان کے نزدیک کوئی خاص وقعت نہیں۔ ان کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی زندگی اپنے خیال کے مطابق بسر کرنی چاہیئے دوسروں سے بحث و مباحثہ کرنا مناسب نہیں لیکن یہ حقیقی رواداری نہیں۔ یہ ذہنی رویہ فلسفۂ تشکیک پر مبنی ہے جس کو بعض مفکرین نے بہت وقعت دی ہے۔ مگر اس کو عقلی آزادی اور آزاد خیالی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اس رویے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اس نام نہاد متشکک نے کوئی خاص نظام اقدار، کوئی معیار زندگی قائم نہیں کیا اس کی زندگی کسی زبردست مقصد کے ساتھ وابستہ نہیں۔ ہم جس رواداری کے خواہاں ہیں وہ عقائد کی پختگی کے منافی نہیں۔ اس کیلئے صرف یہی شرط ہے کہ وہ عقائد ہماری ذہنی آزادی اور غور و فکر معطل نہ کریں۔ اس شرط کے ساتھ عقائد کی پختگی تشکیل و تنظیم حیات کے لئے لازم ہے۔ یہی رواداری کی تعریف یہ ہے کہ ہم زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اپنے مخصوص خیالات اور عقائد رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ ان پر کاربند ہیں لیکن عقلاً اور عملاً دوسروں کا اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہم سے بالکل مخالف خیالات اور عقائد رکھتے ہوں ہم اپنی رائے کو جوش اور قوت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کرتے اور انھیں اپنا ہم رائے بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم خندہ پیشانی اور بردباری کے ساتھ ان کی بالکل مخالف رائے کو سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں اور اس اختلاف رائے کی وجہ سے ہمارے باہمی تعلقات میں تلخی یا ناگواری پیدا نہیں ہوتی۔ اس ذہنیت کی تربیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ہم افراد میں تجسس کا مادہ اور شوق کی وہ تازگی اور بیداری قائم رکھیں جو بچپن کا خاصہ ہے لیکن ناسازگار ماحول کی وجہ سے ابتدائی عمر میں

دب جاتی ہے اور لوگوں پر قبل از وقت کہولت طاری کر دیتی ہے جس طرح یہ بات تہذیب کے مطالبات کے خلاف ہے کہ ہم بجبر اپنے خیالات دوسروں پر عائد کریں اسی طرح یہ بھی تہذیب کے منافی ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے خیالات اور عقائد کے بوجھ میں دب کر نئے خیالات اور نئے حقائق کا استقبال نہ کر سکیں۔ ہندوستانیوں پر تو خاص کر کے قبل از وقت کہولت طاری ہو جاتی ہے اور دماغی جدت اور جولانی کا مادہ باقی نہیں رہتا۔ جس طرح نوعمری کی شادی یا ملازمت جسمانی شباب کی موت ہے اسی طرح عقائد اور خیالات کا اس طرح جامد ہو جانا کہ انسان میں سوچنے اور غور کرنے کا مادّہ نہ رہے اور وہ ہر نئی بات سے گھبرائے ذہنی شباب کا خاتمہ ہے۔ ایمان اور عقیدے کی اہمیت تسلیم۔ لیکن انسان کو کسی طرح یہ مناسب نہیں کہ وہ آنکھوں پر اندھیریاں لگا کر زندگی بسر کرے، اسے تو شہید جستجو ہونا چاہئیے۔

ہمہ ساز ناتمامیم ہمہ سوز آرزوئیم بگماں دہیم یقیں را کہ شہید جستجوئیم

ہم نے تہذیب کا جو مفہوم مندرجہ بالا صفحات میں پیش کیا ہے اس کے ضمن میں ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک پرجوش اور سرگرم مجاہد تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مجاہد سے یہاں ہماری مراد وہ شخص ہے جو کسی خاص مقصد کی حمایت یا تحصیل میں اس درجہ منہمک ہو جائے کہ اس کے لئے اور تمام چیزوں کو قربان کرنے کو تیار ہو اور اسے اس انہماک میں اتنا غلو ہو کہ وہ اور تمام مفاد اور اغراض کو نظر انداز کر دے۔ اس ذیل میں صرف جنگجو سپاہی ہی شامل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ بھی جو کسی نیک اور مفید کام میں مثلاً علم کی تحصیل یا مذہب کی اشاعت اور حمایت یا سیاسی مقاصد کیلئے اپنا تن من دھن نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ یقیناً قابل احترام ہیں اور دنیا میں اکثر بڑے بڑے کاموں کو ایسے ہی لوگوں نے انجام دیا ہے جن کو کسی ایک خیال کی دھن ہو جاتی ہے کسی ایک چیز سے اس درجہ شغف ہو جاتا کہ وہ جنون کی حد تک پہنچ جائے۔ کامیابی کے لئے اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔ مجاہد کی بعض خوبیاں ایسی ہیں جنکا ہم اعتراف کرتے ہیں اور ان کو تہذیب کا لازم جزو سمجھتے ہیں اس میں عقیدہ کی پختگی ہوتی ہے جب اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ایک معاملہ میں حق پہ ہے تو وہ اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار رہتا ہے ہم اس کے ایثار اور یک جہتی کی قدر کرتے ہیں۔ اس کے لئے اعلیٰ جرأت درکار ہے جس میں

جسمانی، دماغی اور اخلاقی جرأت تینوں شامل ہیں۔ اس کو تکلیفوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اکثر سوسائٹی کی ناپسندیدگی اپنے سر لینی پڑتی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے جو آدمی بزدل اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ جسمانی تکلیف یا معاشرتی مخالفت یا ذہنی تنہائی کے خوف سے اپنے مستحکم عقیدوں کو ترک کر دیتا ہے۔ اس شخص میں تہذیب کی صفات پیدا ہونی بہت مشکل ہیں۔ لہٰذا جرأت کو ہم تہذیب کیلئے ایک شرط لازم قرار دیتے ہیں بشرطیکہ اس میں اخلاقی جرأت کی یہ شان بھی ہو کہ جب انسان اپنی کوئی غلطی محسوس کرے یا دوسرا اس کی غلطی محسوس کرائے تو وہ بے کم و کاست ، اپنی غلطی کا اقرار کرے اور جھوٹی شرم سے مغلوب نہ ہو جائے۔ یہ جرأت کی سب سے اعلیٰ شکل ہے جو گویا انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف دکھانی پڑتی ہے۔ اس کے لئے بڑے دل اور جگر کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر لوگ عزت نفس کا ایک غلط مفہوم اپنے ذہن میں قائم کرکے اس کے غلام ہو جاتے ہیں اور اپنی جگہ سے ہٹنے یا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو کسر شان سمجھتے ہیں خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے جن کو عام طور پر بڑا آدمی سمجھا جاتا ہے اور جنکی تمام حرکات اور افعال عوام کی نظر میں رہتے ہیں۔ بہرحال اس جرأت کا اپنے میں پیدا کرنا، ہر کام کو جوش، خلوص اور انہماک کے ساتھ انجام دینا، مشکلات کے سامنے ہتیار نہ ڈالنا، مجاہد کی صفات ہیں اور ان کی ہمیں دل سے عزت کرنی چاہیئے۔

لیکن یہ مجاہدانہ صفات بجائے خود ایک شخص کو ہمارے خیال میں مہذب نہیں بنا سکتیں تہذیب کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے تمام پہلوؤں پر ایک ہمہ گیر نظر ڈال سکے، اس کی طبیعت میں توازن ہو۔ جب اس کے سامنے کوئی معاملہ درپیش ہو تو وہ اس کے تمام رخوں پر غور کرنے اور تمام متعلقہ اشخاص اور واقعات کو جانچنے کے بعد کوئی طریقۂ عمل اختیار کرے۔ حقوق اور مطالبات کے اسی توازن کو مذہب اور فلسفہ نے عدل کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ "اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ"۔ مجاہد اکثر معاملہ کا ایک ہی رخ دیکھتا ہے اور یہ وہ رخ ہوتا ہے جس سے اس کو بہت گہری ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نظر کی یک جہتی سے اس کی قوت عمل دو چند بلکہ چہار چند ہو جاتی ہے لیکن وہ عقل سلیم سے کام نہیں لیتا اور اکثر انجام کار نقصان اٹھاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں اپنے تجربے میں اکثر ملتی رہتی ہیں۔ علم کے مجاہد کا ذکر

اوپر آچکا ہے جو طلب علم میں اس درجہ محو ہو جاتا ہے کہ انسانی حقوق کی اس کو شناخت نہیں رہتی اور وہ اپنے معاشرتی فرائض کو ادا نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض مذہبی مجاہد ہوتے ہیں جو اپنے خیالات کی تبلیغ اور انکی حمایت میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان میں احساس تناسب باقی نہیں رہتا وہ ہر ہر نقطے اور شوشے کی غلطی کو کفر کا مرادف سمجھتے ہیں کسی قسم کے اختلاف کے روادار نہیں ہوتے جو شخص ان سے اختلاف کرتا ہے اسے عذاب ابدی کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مذاہب اور ان کے پیرووں کی بے حرمتی اور دل آزاری کرتے ہیں اور اس کو باعث ثواب سمجھتے ہیں ان میں محبت ہمدردی اور رواداری کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ نیک نیتی کے ساتھ یہ سب کچھ کرتے ہوں لیکن اس قدر غلو اور تعصب اور آنکھوں کو تقریباً بند کر لینا نہ صرف تہذیب اور انسانیت کے منافی ہے بلکہ روح مذہب کے بھی خلاف ہے۔ بیشک حق پر ہونا بہت اچھا ہے، اس کی اشاعت نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے ایثار اور قربانی کرنا بہت بڑی قابل تعریف بات ہے لیکن انسان کے دل میں جو خطا اور نسیان کا پتلا ہے کبھی یہ خیال بھی تو آئے کہ ممکن ہے وہ غلطی پر ہو یا اگر غلطی پر نہیں تو ممکن ہے وہ بھی راستی پر ہو اور دوسرے لوگ بھی کیونکہ خدا کی وسیع خدائی میں اکثر ایک ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے ایک سے زیادہ راستے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مکمل تہذیب یافتہ انسان میں مجاہد کا سا عزم اور حوصلہ اور جرأت اور ایثار اور قوت عمل ہو، وہ اپنے مشاغل اور فرائض کو جوش اور انہماک کے ساتھ انجام دے لیکن اپنے احساس تناسب اور اپنے توازن کو قائم رکھے اور عقل اور جذبات کے تقاضوں کو عمل کی یورش میں نظر انداز نہ کرے۔ کسی ایک خیال کے اوٹ میں تمام دنیا اس کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مجاہدوں کے لئے بہترین مثال تاریخ اسلام کے مجاہد اعظم امام حسین علیہ السلام کی ہے جنھوں نے باوجود اپنے شوقِ شہادت کے، باوجود راہ خدا میں سرفروشی کرنے کے، باوجود انتہائی مظالم اور تکالیف برداشت کرنے کے حقوق العباد کو بھی کما حقہٗ ادا کیا اور عدل و تہذیب اور انسانیت کی ایک ایسی مثال قائم کر دی جو ہمیشہ دنیا کے لئے شمع ہدایت بنی رہے گی۔

یونان قدیم کے مفکرین نے ان صفات کو جو تہذیب کے کمال کے لئے لازمی ہیں ایک لفظ Sophrosyne سے ادا کیا ہے۔ اس لفظ کی بالکل ٹھیک تشریح کرنی مشکل ہے" اعتدال" اس کا

ایک جزو ضرور ہی لیکن اس صفت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتا۔" حیا اور خاکساری، جس حد تک بیجا بتھوڑا اور ادعائے خودی اور خود نمائی کو روکتی ہیں اس میں شامل ہیں لیکن اس کے مکمل مفہوم پر محیط نہیں۔ یہ سکون سے بھی بڑھ کر ہے اگرچہ سکون اس کا ایک جزو ضرور ہے۔ اس میں بے نفسی بھی شامل ہی اور ایک ایسا معیار اقدار جو گھٹیا درجے کی خوشیوں اور فائدوں کو حقیر سمجھے۔ اس میں اعتدال اور ضبط نفس کی جو شان مضمر ہی وہ کسی بیرونی جبر یا دباؤ سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ آزادی اور اس کے صحیح استعمال کا ثمر ہوتی ہی۔ سر آرتھر کوئلر کوچ نے اپنے ایک لکچر میں اس کا ترجمہ "Assured mental grace" کیا ہے۔ ان کی رائے ہی کہ جس شخص میں یہ صفت ہوتی ہی وہ اپنی قابلیت کی حدود سے واقف ہوتا ہی۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہی کہ دنیا ہر قسم کے لوگوں سے مل کر بنتی ہی۔ اس کو اپنی جگہ پر خاموشی اور اطمینان کے ساتھ اس بات کا یقین ہوتا ہی کہ وہ اپنی علمی تربیت کی بدولت ہر علم دوست حلقے میں شریک ہوکر مستفید ہوسکتا ہی۔ لیکن جب وہ وہاں سے گھر جاتا ہی تو وہ عقل مند ترین لوگوں کے قول کو بھی فیصلے کے لئے اپنے ضمیر کے سامنے پیش کرتا ہی کیونکہ اس کا ضمیر اور اس کے دل و دماغ اپنے ہیں جن میں صلاحیت اور سمجھ ہی اور وہ جانتا ہی کہ خواہ وہ اپنی صلاحیتوں کو کتنی ہی کسر نفسی کے ساتھ جانچے اس کا فرض ہی کہ وہ معاملات کو خود سمجھے اور ان پر غور کرے۔ اس بیان سے یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ تہذیب کے مفہوم میں ہمہ گیری، سکون اور عزت نفس شامل ہیں اور ہر قسم کا اوچھا پن، جھوٹی شیخی اور جھوٹی کسر نفسی تہذیب حقیقی کے منافی ہیں۔ اس مفہوم کی ایک عملی اور شخصی مثال حالی کے لاثانی اور غیر فانی مرثیہ غالب میں مل سکتی ہے۔

بلبل ہند مرگیا ہیہات　　جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس　　پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج　　رند اور مرجع کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اسکا ایک ٹھٹول　　سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

خاکساروں سے خاکساری تھی　　سر بلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ　　دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے　　زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

تہذیب یافتہ انسان کی ایک اور امتیازی صفت یہ ہے کہ اس کے لئے ہر نیا تجربہ علم و حکمت کا ایک خزانہ ہوتا ہے جس سے اس کی دانشمندی، اس کی بردباری، اس کی انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے اس کے لئے تجربات کی مثال ایسی نہیں جیسے کسی فائل میں بہت سے کاغذات شامل کر دئے جائیں بلکہ وہ اس کی وسعت پذیر شخصیت میں زیادہ گہرائی اور معنویت پیدا کرتے ہیں وہ ناگوار تجربات پر بھی چیں بجبیں نہیں ہوتا، نظام عالم اور خالق عالم کو الزام نہیں دیتا بلکہ ان سے بھی سبق اور استحکام حاصل کرتا ہے اس کے لئے دکھ سکھ سے زیادہ سبق آموز بن جاتا ہے کیونکہ مصیبت اور رنج کی آزمائش میں سے نکل کر اس کی طبیعت میں زیادہ نرمی، زیادہ ہمدردی اور زیادہ سمجھ پیدا ہو جاتی ہے۔

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے　　ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

اس لئے انسان کی تہذیب اور تربیت میں ہر تجربہ خواہ وہ ناگوار ہو یا خوشگوار معین ہوتا ہے مرغ اور ہدہد کے قصے میں جس کو اقبال نے نظم کیا ہے اسی طرف اشارہ ہے:

مرغے ز آشیانہ بسیر چمن پرید　　خارے ز شاخ گل بہ تن نازکش خلید
بدگفت فطرت چمن روزگار را　　ہم سوز خود و ہم ز غم دیگراں تپید
گفت اندریں سرا کہ بنایش فتادہ کج　　صبحے کجا کہ چرخ در وشامہا نچید

یہ مرغ تہذیب سے عاری تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دکھ درد مصیبت کو کس طرح معین کار بنایا جا سکتا ہے۔ ایک تجربہ کار اور رمز شناس ہدہد نے اس کی نالہ و زاری کو سن کر اس پر رحم کھایا اور کانٹے کو نکال دیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ زریں نصیحت بھی کی جو غور کے قابل ہے:

گفتا کہ سود خویش ز جیب زیاں بیار　　گل از شگاف سینہ زر ناب آفرید

درماں زدرد ساز اگر خستہ تن شوی   خوگر بخار شو کہ سراپا چمن شوی

عام لوگوں کی زندگی تو ذرا ذرا سی آزمائشوں اور تکلیفوں سے تلخ اور بے کیف ہوجاتی ہے
لیکن وہ اہل دل اور اہل نظر جن کو قدرت کی طرف سے نفس مطمئنہ ملا ہے اور جنھوں نے اصلی تہذیب کو
حاصل کیا ہے انھیں تجربات کی بنا پر بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تہذیب کوئی ایسی چیز
نہیں ہے جو ایک مکان یا زمین کی طرح کسی شخص کی ملکیت ہوسکے۔ وہ تو ایک خاص انداز سے
زندگی بسر کرنے کا نام ہے جس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام تجربوں کی مسلسل تنظیم و
تشکیل کرتا رہے اور ان کی مدد سے پرانی چیزوں سے بھی نیا لطف اور کیف حاصل کرے بقول امریکہ
کے معلم اعظم ڈیوی (Dewey) کے تہذیب کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں یہ صلاحیت ہمیشہ بڑھتی رہے
کہ وہ ہر چیز سے زیادہ وسیع اور زیادہ گہرے معانی حاصل کرسکے یہی وجہ ہے کہ اگر ایک تہذیب یافتہ شخص
جس کے ذوق جمال کی تربیت ہوئی ہے تاج محل کو دیکھتا ہے تو اسے اس عمارت میں ایک ایسا
جہان حسن وجمال دکھائی دیتا ہے جو ایک ناواقف بچے یا ایک جاہل بالغ کے حاشیہ خیال میں بھی
نہیں آسکتا۔ یہی حالت ہر قسم کی تحسین اور لطف اندوزی کی ہے۔ تہذیب خود انسان کی ذات
اور اس کے مذاق میں ایسی معنویت پیدا کردیتی ہے کہ بہت سی چیزیں جو دوسروں کو معمولی نظر آتی
ہیں اس کے لئے سرمایہ مسرت وتحسین ہوتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا قول ہے کہ ہرے بھرے جنگل کی ہوا کا ایک
جھونکا ہمیں انسان اور خیر وشر کے متعلق وہ باتیں سکھا سکتا ہے جو دنیا کے تمام دانشمند مل کر بھی
نہیں بتا سکتے لیکن اس جھونکے کے پیغام کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں اس کے لئے صاحب دل اور
صاحب نظر ہونا شرط ہے۔ اس لئے سعدی نے اپنے شعر میں "نظر ہوشیار" کی شرط لگادی ہے

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار   ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن جس طرح یہ تہذیب یافتہ انسان ایک طرف معمولی چیزوں میں معنویت اور دل
آویزی ڈھونڈھ نکالتا ہے اسی طرح وہ معیار اقدار کی رو سے بہت سی ان چیزوں کو حقیر سمجھتا
ہے جو عوام الناس کے لئے بہت وقیع ہیں اور جن کے لئے وہ تمام عمر جد وجہد کرتے ہیں اور حق تلفی اور ظلم کے

مرتکب ہوتے رہتے ہیں مثلاً دولت شہرت، اعزاز و خطابات۔ وہ ان کے لئے اپنا سکون قلب اور قناعت کھونے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ لوگوں کی مجنونانہ جد وجہد پر ہنستا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ دنیا وی قوت اور عزت کے ایک حد تک جد وجہد کرے کیونکہ ہم تہذیب کو ترک دنیا کا مرادف نہیں سمجھتے لیکن وہ اس کشمکش میں ہ اس درجہ منہمک نہیں ہوتا کہ اپنے احساس تناسب اور ذوق ظرافت کو کھو بیٹھے اور جن چیزوں کی حیثیت محض ذرائع کی ہے ان کو مقصد زندگی بنالے۔

آخر میں ہمیں اس مسئلہ سے بحث کرنی چاہیئے کہ ہمارے نقطۂ خیال کے مطابق منشائے حیات کی ہے اور ہمارے نزدیک تہذیب یافتہ انسان کا رویہ اس بارے میں کیا ہونا چاہیئے۔ جن لوگوں کی تمام امیدیں اسی دنیا کے ساتھ وابستہ ہیں، جن کا خیال ہے کہ چراغ حیات گل ہو جانے سے انسان کی روح او شعور و احساس بھی فنا ہو جاتے ہیں ان کا تو اعتقاد لازماً یہی ہونا چاہیئے کہ مدت حیات کو غنیمت جان ک انسان کو جو کچھ لینا، حاصل کرنا اپنے قبضہ اور تصرف میں لانا ہے اس کو لے لے۔ اس لحاظ سے انسان کا فر اور مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دنیا کی جس قدر نعمتوں پر قبضہ کر سکے کرے اور کنجوسوں کی طرح جب تک ممکن ہو ان پر قبضہ کئے بیٹھا رہے اور ان کو صرف نہ کرے۔ زندگی کے اس نظریہ کی مختلف مثالیں ہمارے چار طرف موجود ہیں۔ معاشی زندگی میں سرمایہ داری کا نظام، سیاست میں ملک گیری اور اقلیم رانی کی ہوس معاشرتی تعلقات میں تنگ نظری اور خود غرضی یہ سب اس مفروضے پر قائم ہیں کہ انسان بالطبع خود غرض ہے وہ لینا چاہتا ہے، ذخیرہ کرنا چاہتا ہے۔ اس کو دینا، خرچ کرنا ناگوار ہوتا ہے۔ ملکیت اس کی جبلت ہے اس کی فطرت کا جزو ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا نظریہ زندگی وہ ہے جو بہترین انسانوں کا ہمیشہ رہا ہے اس کی رو سے زندگی امانت الٰہی ہے جس کو خدا کی راہ میں فیاضی کے ساتھ بسر کرنا چاہیئے انسان کو مختلف قوتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ وہ انھیں اعلیٰ انسانی مقاصد کی خدمت میں صرف کرے یہ نظریہ نفس پرستی اور عیش پسندی کے بجائے خدمت اور ایثار کی تعلیم دیتا ہے اور لوگوں کو یہ سکھاتا ہے کہ و اپنی ذات کو اور اپنی تمام قوتوں کو ایک کنجوس دولتمند کی طرح مقفل کر کے نہ رکھیں بلکہ ان کو بیدریغ رفاہ عام کے لئے صرف کریں کیونکہ جس طرح علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے اسی طرح انسا

کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو خدمت کے ذریعے اور زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے جو لوگ اپنے نفس کو رضائے الہی کی خاطر بیچ ڈالتے ہیں وہی اس کی اصلی قیمت حاصل کرتے ہیں کیونکہ بقول حضرت عیسیٰ کے "وہی شخص اپنی روح کو پائے گا جو اسے کھو دینے کے لئے تیار ہو"۔ اس لحاظ سے اسلامی تعلیم قدیم اور جدید مغربی تعلیم اور فلسفہ پر بہت نمایاں فوقیت رکھتی ہے خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے عصر جدید' میں ایک مضمون "تعلیم کی ظاہری غرض اور انتہائی مقصد" کے عنوان سے لکھا تھا جس میں انھوں نے اس امر سے بحث کی ہے کہ منشائے حیات اور منتہائے تعلیم کے بارے میں مغربی اور اسلامی نقطۂ نظر میں کیا فرق ہے؟" جدید تعلیم یا مغربی فلسفہ قرار دیتا ہے کہ اعلیٰ خود غرضی اخلاق کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ عقل و اندیش اپنی غرض اور مصلحت کو سمجھے۔ یہ نہیں کہ جس بات سے آج آرام و آسائش معلوم ہوتی ہے اور کل کو اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے اس سے ضرر ہو اس کو انسان اچھا سمجھ کر کرنے لگے۔ یہ تو ادنیٰ غرض ہے اسلامی تعلیم یہ کہتی ہے کہ شخصی اور نوعی غرض بالکل جائز اور بجا ہے مگر وہ ادنیٰ درجہ کی ہے۔ اصلی انسانیت کا معیار یہ ہے کہ ذاتی خواہشوں کو مشیت ایزدی اور قوانین کل کے تابع کر دے۔ یا ایھا الذین آمنوا انفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ ط۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی کل قوتوں اور دولت کو یہاں خرچ کرے کہ یہ زندگی اسے اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنے عمل، سعی اور ایثار سے حیات ابدی حاصل کرے۔ جو لوگ اس اصول کو نہیں سمجھتے اور خدا کی دی ہوئی قوتوں اور نعمتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ کافر یعنی ناشکرے اور ظالم ہیں اور تاریکی میں ہیں..... جدید تعلیم سکھاتی ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو کیونکہ کل تم مرجاؤ گے۔

نوروز و نوبہار و مے و دلبر خوش است ‌ ‌ ‌ ‌ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسلامی تعلیم کہتی ہے کہ کھاؤ پیو مگر حالت اعتدال سے نہ نکلو کیونکہ بے اعتدالی اور بیجا کام انسانیت کی موت ہے" (عصر جدید جلد ۹) ہم نے جس تہذیب کی تعریف اور تشریح اس مضمون میں کی ہے وہ قطعی طور پر تنگ نظری، خود غرضی اور خود پسندی کے منافی ہے اور انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بہترین اور بلند ترین مقاصد انسانی کے لئے صرف کرے اور اُن کی تحصیل کے لئے مزدوروں کی

طرح کام کرے۔ ہم تہذیب کو عیش نصیب اور فرصت پسند لوگوں کا مشغلہ تفریح بنانے کے لئے تیار نہیں ہمیں ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو عقل سلیم اور سلامت روی کے ساتھ اپنے تمام حقوق و فرائض پر ہمہ گیر نظر ڈال سکیں اور ان کو خلوص اور انہماک کے ساتھ پورا کریں۔

میں اس مضمون کو ختم کرکے اس پر نظر ڈالتا ہوں تو میرے دل میں دو مختلف خیالات پیدا ہوتے ہیں کبھی تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب نفس کیلئے جن صفات کو لازم قرار دیا ہے وہ سب متفق علیہ ہیں میں نے کوئی بات ایسی نہیں کہی جس پر کسی قدامت پسند شخص کو بھی اعتراض ہو۔ رواداری، عدل، ذہنی آزادی، دلچسپیوں کی بیداری، زندگی کو امانت الٰہی سمجھنا، کام کو خدا کی نعمت خیال کرنا، اس کو عار نہ سمجھنا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جنکو کم از کم نظری طور پر ہر زمانہ میں لوگوں نے تسلیم کیا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ میں نے تہذیب کے مروجہ مفہوم کا کماحقہ، احترام نہیں کیا میں نے تہذیب یافتہ لوگوں کی شان میں بہت سی گستاخیاں کی ہیں ان سے کام اور محنت کا مطالبہ کیا ہے ان کے احساس خودی کو ٹھیس لگائی ہے اور انھیں انکے مقام علیین سے اتار کر معمولی جاہل اور ناشائستہ مزدوروں اور کسانوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے ان کے دل میں یہ شک پیدا کرنیکی کوشش کی ہے کہ وہ بالکل معصوم اور بے خطا نہیں ہیں بلکہ ممکن ہے وہ کسی معاملے میں غلطی پر ہوں۔ میں نے فنون لطیفہ، علمیت، مذہبیت اور شائستگی پر زیادہ زور دینے کے بجائے انسانیت پر زیادہ زور دیا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تمام بیان سے تہذیب یافتہ انسان کی جو تصویر مرتب ہوتی ہیں وہ اتنی دلکش اور نظر فریب ہے یا نہیں جیسی اس کی روایتی تصویر۔ لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ تہذیب کا یہ مفہوم زیادہ مفید زیادہ پائیدار اور زیادہ عملی ہے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ انسان خاص طور پر خوش نصیب ہو اور اس کے حالات غیر معمولی ہوں بلکہ اس تہذیب کی شان ہر شخص اپنے اندر پیدا کرسکتا ہے۔ جو خلوص اور ہمت کے ساتھ اس پر آمادہ ہو۔

معاہدۂ عمرانی[1]

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابزنجیر ہے" ان الفاظ کے ساتھ روسو اپنی کتاب "معاہدہ عمرانی" شروع کرتا ہے۔ آزادی، مساوات، حکومت عوام، ایسے تخیلات نہیں جن سے دنیا روسو سے پہلے آشنا نہ ہو۔ روسو کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انھیں انسان کا "حق" ثابت کیا اور کسی چیز کو خیرات کے طور پر مانگنے اور حق کے طور پر طلب کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

روسو کو فرانسیسی انقلاب کا "روحانی باپ" کہا جاتا ہے۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ یہ انقلاب نتیجہ تھا محض روسو (یا دوسرے فلسفیوں) کے سیاسی نظریوں کا تو اس میں بلا شبہ مبالغے کو دخل ہے۔ اس طرح کے انقلاب کتابوں کے ذریعہ رونما نہیں ہوا کرتے۔ وہ نتیجہ ہوتے ہیں حقیقی آلام و مصائب کا اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ فرانس میں انقلاب سے پہلے معاشی اعتبار سے جمہور انتہائی افلاس اور سیاسی نقطۂ نظر سے حد درجہ کی غلامی کا شکار تھے۔ البتہ روسو نے اپنے عہد کی نبض کو خوب پہچانا جو کچھ لوگوں کے دلوں میں تھا وہ روسو کی زبان قلم پر آیا۔ قوم اپنے آپ کو بے بس اور لاچار خیال کرتی تھی۔ روسو نے اُسے یقین دلایا کہ وہ تو خود تمام تر دنیاوی اقتدار کا منبع ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو کی تصنیف "معاہدہ عمرانی" فرانسیسی انقلاب کے علمبرداروں کے لئے آسمانی کتاب بنی اور انھوں نے "حقوق انسانی" کے تخیل سے فرانسیسی بادشاہت مطلقہ اور نظام جاگیرداری کا قلع قمع کرنے میں انمول مدد لی۔

روسو زندگی اور سوسائٹی کو مظلوم، کمزور اور فاقہ کش انسان کی نظر سے دیکھتا ہے سیاسی

---

[1] ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے روسو کے Contrat Social کا ترجمہ اردو میں کیا ہے یہ مضمون اس کا مقدمہ ہے۔ ترجمہ اردو اکادمی سے شائع ہونے والا ہے۔ (مدیر)

عدم مساوات ہی نہیں، معاشرتی عدم مساوات بھی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک بڑا جاگیردار جو لوگوں کا پیٹ کاٹ کر انھیں مفلس بنائے اسی قدر قابل نفرین ہے جتنا ایک مطلق العنان بادشاہ جو ان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈالے۔

روسو جن حالات اور جس گردوپیش میں پیدا ہوا اور جن جن مصیبتوں، دشواریوں اور ناکامیوں سے اُسے اپنی زندگی میں بچپن ہی سے دوچار ہونا پڑا، ان کا پورا پورا عکس اس کے خیالات میں نظر آتا ہے۔ اور اس وجہ سے خاص طور پر ضروری ہے کہ روسو کے فلسفے پر غور کرنے سے پہلے اس کے سوانح حیات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

زندگی | ژاں ژاک روسو کا تعلق ایک ایسے فرانسیسی خاندان سے تھا جس کے ارکان کو سولھویں صدی کے وسط میں پیرس سے جینوا ہجرت کرنی پڑی۔ وہ اپنے پروٹسٹنٹ مذہب کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہ تھے اور اس صورت میں ان کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ جینوا چلے جائیں جو اس وقت پروٹسٹنٹ تحریک کا بڑا بھاری مرکز تھا۔ سوئیٹان کے اس چھوٹے سے آزاد، جمہوری شہر میں پیدا ہونے اور وہاں بچپن کا زمانہ گذارنے کا روسو پر نمایاں اثر ہوا۔ روسو کے خاندان کے اکثر لوگ گھڑیاں بنا کر روزی کماتے تھے۔ روسو کا باپ بھی گھڑی ساز تھا۔ اس کا تعلق شہر کے پانچ طبقوں میں سے اس بیچ کے طبقے سے تھا جو گو سب سے بلند مرتبہ تو نہ تھا مگر جسے شہری حقوق حاصل تھے۔ اور یہی تھا وہ طبقہ جو اٹھارہویں صدی کے شروع سے بلند ترین سر کو نیچا کر کے اپنے لئے حقوق حاصل کرنا چاہتا تھا۔

روسو کے باپ کے مزاج میں حد سے زیادہ آزادپسندی تھی، اور طبیعت میں جھگڑالو پن۔ سیر و سیاحت پر وہ حد درجہ فریفتہ تھا (یہ تمام اوصاف ہیں جو بیٹے میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے) شادی کے چند ہی سال بعد بچوں کو خدا پر چھوڑ اس نے قسطنطنیہ کا رخ کیا۔ غالباً یہ سفر اسے مالی مشکلات کی وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا۔ وہ جب وہاں سے واپس آیا تو اس کا منجھلا بیٹا ژان ژاک پیدا ہوا۔ (۲۸ جون ۱۷۱۲ء) ابھی یہ بچہ آٹھ ہی دن کا ہوا تھا کہ ماں اس دنیا سے رخصت ہو گئی اور اس کی پوری تربیت کا بوجھ باپ کے سر پڑا۔

ژاں ژاک کی تربیت جس ڈھب کی ہوئی اس کا یہی تقاضا تھا کہ وہ جذبات واحساسات کا بندہ ہو، اس کے دل میں امنگیں، طبیعت میں بے چینی اور مزاج میں تلوّن ہو۔ اس کی عمر ابھی کوئی سات آٹھ سال کی ہوگی کہ باپ نے اس کے ساتھ ایسے قصّے کہانیاں اور تاریخی کتابیں پڑھنا شروع کیں جو توسن خیال کے لئے چابک کا کام دیں۔ باپ اور بیٹا مل کر اس انہماک کے ساتھ کتابیں پڑھتے اور ان پر گفتگو کرتے رہتے تھے کہ بعض اوقات ساری ساری رات بیٹھے ہی گذر جاتی تھی حتیٰ کہ چڑیوں کے چہچہوں سے انھیں یہ پتہ چلتا تھا کہ صبح ہوگئی۔ اور باپ کو بیٹے سے یہ کہنے کا موقع ملتا تھا کہ "لڑکے! مجھ میں تو تجھ سے بھی زیادہ بچپن ہے!"

روسو دس برس کا ہونے پایا تھا کہ اس کے باپ کو ایک جھگڑے کی وجہ سے جنیوا چھوڑنا پڑا اب روسو بے ماں باپ کا رہ گیا اور جنیوا کے پاس ایک گاؤں میں اپنے ایک عزیز کے ہاں جو پادری تھا رہنے لگا خود روسو کا خیال ہے کہ دنیائے فطرت سے اس کا دلی لگاؤ اسی زمانہ سے شروع ہوا بچپن ہی میں بے انصافی سے نفرت کے جذبے نے اس کے دل میں گہری جگہ کرلی تھی اور یہ جذبہ پیدا کرنے کی فوری وجہ وہ سزائیں تھیں جو بعض اوقات بلا قصور اُس کے حصّے میں آتی تھیں۔ دوسری چیز جس کا اس دو برس کے عرصہ میں روسو کو تجربہ ہوا وہ اس میں وقت سے پہلے جذبۂ شہوانی کے آثار تھے۔ زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس کے متعلق عموماً لوگ خاموشی اختیار کرتے ہیں مگر روسو نے اپنے "اعترافات" میں ہر چیز کا اعتراف کرلیا ہے!

روسو دو برس اسی طرح گذار کر پھر جنیوا آگیا۔ اب اس کا قیام اپنے چچا کے ہاں رہتا تھا۔ دو تین برس اس نے یوں کہنا چاہیئے کہ ضائع کئے۔ البتہ اس عرصے میں تھوڑی بہت نقاشی اور اقلیدس سیکھی۔ اب پیشے سے متعلق روسو کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔ گھڑی سازی، وکالت اور مذہبی امامت (تنوع قابل داد ہے!) روسو کو جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ان میں سے آخری کام سے دلچسپی تھی روسو اُن بدقسمت لوگوں میں سے ہے جنھیں بچپن ہی سے اپنی روزی آپ کمانے کی فکر کرنی پڑتی ہے چنانچہ باپ کے جنیوا سے رخصت ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد جب کہ اس کی عمر مشکل سے

گیارہ برس کی ہوگی اس نے ایک سرکاری وکیل کے ہاں دفتر میں کام شروع کیا مگر وکیل اس کے کام سے
ذرا بھی مطمئن نہ تھا۔ وہ روسو کو نہایت کند ذہن اور ناکارہ سمجھتا تھا اور آخر کار اس کو برطرف کر دیا۔
اب روسو ایک کندہ کار کے پاس کام سیکھنے لگا۔ اس مشغلہ سے اسے خاصی دلچسپی تھی مگر سلوک بے چارے
کے ساتھ یہاں بھی بہت برا ہوتا تھا۔ یہ آزاد منش انسان اپنے اوپر پابندی مشکل سے عاید کر سکتا تھا اور
تھوڑے ہی دنوں میں اس کا جی کام سے اکتا گیا۔ اس دوران میں روسو کی خوشی کا دن اتوار ہوتا
تھا جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شہر سے دور جنگل میں سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا
تھا کہ یہ لڑکے سیر سے اتنی دیر میں واپس آتے تھے کہ رات کے وقت شہر کے دروازے بند ہو جاتے
تھے۔ دو مرتبہ روسو کو اسی بات پر سخت سزا دی جا چکی تھی۔ ایک مرتبہ (۱۷۲۸ء میں) جب پھر ایسا اتفاق
ہوا کہ روسو کو شہر کے دروازے بند ملے تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ سزا نہیں بھگتے گا۔ وہ گھر بار چھوڑنے
پر آمادہ ہو گیا اور اس نے ایک دوسری سمت کا رخ کیا جو کچھ بھی ہو کیسی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے
لیکن اس نے اپنے جی میں ٹھان لی کہ اب وہ ذرا اس دنیا کی ہوا کھائے گا جس کے اب تک وہ محض خواب
دیکھا کرتا تھا۔ کیا عجب ہے کہ وہ ہر طرح کی پابندی سے آزاد رہ کر بھی خوش اور خرم زندگی
بسر کر سکے۔ اس آوارہ گردی میں روسو کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی دنیا آئی، گو اس میں شبہ ہے
کہ یہ دنیا وہی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ بہرحال اس واقعہ سے یہ پتا ضرور چلتا ہے کہ روسو
پر فوری جذبات کس قدر حاوی ہو جاتے تھے۔ کسی ایک ذرا سے واقعہ سے اس کی زندگی کا رخ
سرے سے بدل جانا معمولی بات تھی۔

جنیوا سے فرار ہو کر روسو سوائے (Savoy) کے حدود میں پہنچا۔ سوائے کے کیتھولک ڈیوک
اور جنیوا کے پروٹسٹنٹ پیشواؤں کی آپس میں خوب چلی ہوئی تھی۔ روسو ایک کیتھولک پادری کے
ہاتھ پڑا۔ اس نے نوجوان لڑکے کی خوب خاطر مدارات کی اور اسے اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ گو
اُس نے روسو کو اپنے مذہب کی خوبیاں سمجھانے کی پوری کوشش کی مگر روسو کے لئے اس وقت
کیتھولک مذہب کی تائید میں سب سے بڑی دلیل شراب سرخ کا جام تھا جو پادری نے لذیذ کھانوں

کے ساتھ اس کے سامنے پیش کیا!

اب روسو ایک خاتون مدام دے وارین کے پاس بھیجا گیا، جس نے ایسے نوجوانوں کی خدمت اپنا پیشہ بنایا تھا جو کیتھولک مذہب میں نئے نئے داخل ہوتے تھے۔ مدام دے وارین کی بھی عجیب شخصیت تھی، روسو کی طرح اس نے بھی اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کیا تھا۔ مگر کیتھولک مذہب قبول کرنے کے بعد بھی مذہبی معاملات میں بہت آزاد خیال اور نوجوانوں کیساتھ تعلقات میں شاید اور بھی آزاد تھی۔ تصوف سے اسے دلچسپی تھی۔ کیمیا بنانے کا اسے شوق تھا اور تجارتی سٹے بازی کا اسے مرض۔ نیک اور بد دونوں قسم کے خیالات اور جذبات اس میں یکجا پائے جاتے تھے۔ روسو کی فطرت بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس عورت کی صحبت میں روسو کے بُرے اور بھلے دونوں قسم کے رجحانات کو بڑی تقویت پہنچی۔ مدام دے وارین نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے حُسنِ اخلاق سے روسو کا من موہ لیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے ایک ایسی ذات ہاتھ آئی ہو جو ماں کی طرح اس کی خبر گیری کرے، معشوقہ کی طرح اس پر جان دے، استاد کی طرح اس کے ذہنی نشوونما میں مدد دے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہو، مگر روسو کا قیام چند ہی روز وہاں رہ سکا اور وہ تورین بھیج دیا گیا۔

روسو نے تورین تک کا سفر پیدل کیا۔ یہی سفر تھا جس کے بعد سے روسو مناظرِ فطرت اور پاپیادہ سفر پر جان دینے لگا۔ پہاڑ اور وادیاں، سبزہ زار اور چشمے اس کے لئے جاندار، بولتی چالتی چیزیں بن گئیں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ روسو نے بعد میں دنیا کو تمدن سے ہٹ کر فطرت کی طرف پلٹنے کا سبق دیا۔

تورین میں روسو نے پہلے ایک مسیحی خانقاہ میں تعلیم حاصل کرنا شروع کیا، پھر وہ وہاں کے قدیم گرجا میں رہنے لگا۔ کچھ دنوں بعد وہاں سے اسے تھوڑا سا روپیہ دے کر رخصت کر دیا گیا۔ اب اس نے طرح طرح سے روزی کمانے کی کوشش کی، کچھ دن محرر رہا، کچھ دن معمولی خدمتگار۔ اس زمانہ میں اس کے اخلاق پر بہت برا اثر ہوا اور اسی زمانہ میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی یاد ہمیشہ اس کے

لئے سخت تکلیف کا باعث ہوتی تھی، یعنی اس نے اپنے مالک کے ہاں ایک چھوٹی سی چوری کی اور جب اس پر شبہ کیا گیا تو اس نے اپنے اوپر سے الزام ہٹانے کے لئے ایک غریب لڑکی کا نام لے دیا جو اُسی کی طرح گھر میں ملازم تھی بے قصور لڑکی مصیبت میں پڑ گئی۔ اپنی یہ ذلیل حرکت روسو مرتے دم تک نہ بھولا۔

کچھ عرصہ بعد روسو خدمتگاری سے ترقی کر کے سکریٹری بن گیا۔ گھر والوں کو اب اس کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چلا تھا۔ اور وہ اس فکر میں تھے کہ جلد اسے ترقی دیں۔ مگر آوارہ گردی کا جذبہ روسو میں پھر عود کر آیا وہ پھر پہاڑوں، دریاؤں، سبزہ زاروں اور مادام دے وارین کے خواب دیکھنے لگا چنانچہ اس نے پھر اس خاتون کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں اس کا بہت اچھی طرح خیر مقدم ہوا۔ روسو نے کچھ دن اطمینان کی زندگی گذاری۔ اسے پیسے کمانے کی فکر سے نجات مل گئی اور اس نے مذہبی تعلیم حاصل کرنا شروع کی، تھوڑے دنوں میں اس تعلیم سے بھی اس کا جی سیر ہو گیا۔ اب اسے موسیقی کا شوق ہوا اور اس نے اسی سلسلہ میں سوئٹیان کے مختلف حصوں کا پیدل سفر کیا۔ سفر کے دوران میں ایک فرانسیسی سفارت خانہ تک اس کی رسائی ہو گئی۔ سفارت خانہ کے بعض اراکین کے مشورہ سے فوج میں داخل ہونے کی غرض سے پیرس گیا مگر وہاں پہنچ کر جب اُس نے دیکھا کہ اسے افسر کی حیثیت سے نہیں بلکہ معمولی سپاہی کے طور پر بھرتی کیا جائے گا تو وہ مادام دے وارین کے پاس واپس آ گیا۔ کچھ دنوں ایک دفتر میں کام کیا، مگر ایسا شخص جو تخلیقی دماغ لے کر پیدا ہوا ہو بھلا دفتر کا کام کب تک کر سکتا تھا۔ اُس نے پھر موسیقی کی طرف توجہ کی اور اپنے قصبے کی بعض لڑکیوں کو سبق دینے لگا۔ روسو کا خیال ہے کہ وہ سب کی سب نہایت حسین تھیں فطرتاً روسو کو اس مشغلے سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی، مگر جب مادام دے وارین نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو اس خیال سے کہ کہیں روسو پر کسی اور کا جادو نہ چل جائے خود روسو کے ساتھ سلسلۂ عشق شروع کر دیا! عشق کی یہ کہانی بھی بڑی عجیب ہے۔ جسے وہ اب تک "ماں" کہکر پکارا کرتا تھا وہ اس کی محبوب نظر بن گئی اور پھر ستم یہ کہ "محبوبہ" کی نظر التفات ایک روسو ہی پر نہیں تھی۔ اس اجمال کی تفصیل چنداں ضروری نہیں۔

ہمارے لئے اس قصہ سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں روسو کی راہ ورسم اپنے طبیب ڈاکٹر سالومون سے بڑھی۔ یہ ایک جیّد عالم تھا اور دیکارٹی[1] مذہب فلسفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے روسو کو فلسفہ اور علوم فطریّہ کی طرف توجہ دلائی۔ اسی کے کہنے پر اس نے والتیر[2] کی ایک کتاب کا مطالعہ کیا، اور اسی کے بعد سے فلسفہ سے اسے بڑی رغبت ہوگئی۔ لاک اور نیوٹن کے فلسفہ سے بھی وہ آشنا ہوا۔ روسو پر دیکارت اور لاک دونوں کا گہرا اثر ہے۔ اسے لاک کا بھی شاگرد کہا جا سکتا ہے اور دیکارت کا بھی۔ جب اُسے فلسفہ کے مختلف مذاہب میں اختلاف نظر آتا تھا تو اسے خود سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا تھا۔ فلسفہ کے علاوہ ریاضی، لاطینی، اور تاریخ کے مطالعہ سے بھی اسی زمانہ میں روسو کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ مگر ان تمام علوم کی تحصیل کا مقصد صرف اپنی دماغی نشو ونما نہ تھا بلکہ روسو کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس طرح ممکن ہے اسے کوئی اعلیٰ خاندان اپنے ہاں استاد یا سکرٹیری کے طور پر رکھ لے۔

۱۷۴۰ء تک روسو اسی طرح مدام دے وارین کے پاس رہا۔ کبھی جب کوئی نیا رقیب پیدا ہو جاتا تھا، یا اسے سیر وسیاحت کا شوق چرّاتا تھا تو وہ کچھ دنوں کے لئے کہیں چلا جاتا تھا۔ مگر تھوڑے کے بعد مدام موصوفہ کی کشش اسے پھر وہیں کھینچ لاتی تھی۔ البتہ جب مدام دے وارین کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تو روسو نے فیصلہ کیا کہ وہ پیرس جاکر موسیقی کی تحریریں بیچ بیچ کر اپنی روزی کمائیگا اور اگر ممکن ہوگا تو مصیبت کے وقت اپنی محسنہ کی بھی مدد کرے گا۔ مگر پیرس میں روزی کمانا کچھ بہت آسان نہ تھا۔ البتہ اس سلسلہ میں اس کی ملاقات پیرس کے علمی اور ادبی حلقوں کے مشہور مشہور لوگوں سے ہوگئی۔ انھیں میں سے بعض کی عنایت سے روسو کو چند سال بعد وینس کے فرانسیسی سفیر کے ہاں سکرٹیری کا عہدہ مل گیا۔ اس مشہور اور قدیم جمہوریہ میں قیام روسو کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ یہاں اس کی تاریخی معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا۔ نیز وینس کے قانون دستوری سے اُسے بڑی دلچسپی پیدا

---

[1] دیکارت، (Descartes) فرانسیسی فلسفی اور ریاضی کا علامہ (۱۵۹۶ء تا ۱۶۵۰ء)

[2] والتیر مشہور فرانسیسی فلسفی، ادیب اور مورخ، روسو کا ہمعصر (۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء)

ہوگئی۔ اور یہیں دستور پر کتاب لکھنے کا خیال اسے پہلی مرتبہ آیا۔ اطالوی موسیقی اسے بہت پسند آئی اور بعد میں پیرس جاکر فرانسیسی موسیقی کے مقابلہ میں اطالوی موسیقی کو رواج دینے کی اس نے سرگرم کوشش کی مگر وینس میں اس کا قدم بہت دنوں نہ ٹک سکا۔ وہاں سے جی اکھڑنے کی بڑی وجہ فرانسیسی سفیر کا غرور و تکبر تھا۔

وہ پیرس واپس آگیا اور ایک اوپرا opera میں کام کرنے لگا۔ اب وہ جس ہوٹل میں رہتا تھا اس میں ایک نوجوان لڑکی بھی ملازم تھی۔ روسو کو رفتہ رفتہ اس سے بڑی محبت ہوگئی۔ اگر اطالیہ اور سوئٹیان کے اکّے دکّے واقعات سے قطع نظر کرلی جائے جب عاشقی طور پر روسو کے قدم ڈگمگا گئے تو روسو کا مادام دے وارین کے بعد یہ دوسرا عشق تھا۔ روسو نے بعد میں کہا ہے کہ اصل میں اسے اس لڑکی (تھریسے واسیور) سے عشق نہ تھا۔ اسے تلاش تھی ایک ہستی کی جو اس سے ہمدردی کرے اور جس کے سامنے وہ اپنے دل کی کہانی سنا سکے۔ اس "بت دہقان" میں اسے ایسی ہستی دستیاب ہوگئی۔ اس لڑکی کے دماغی نشو ونما کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ باوجود روسو کی جانکاہ کوشش کے پڑھنا عمر بھر نہ سیکھ سکی اسے چار اور چار کو صحیح جوڑنا تک نہیں آیا۔ گھڑی دیکھ کر وقت وہ نہیں بتاسکتی تھی۔ مہینوں کے نام سلسلہ وار اسے یاد نہیں تھے ظاہر ہے کہ یہ تعلق جو پچیس برس تک قائم رہا روسو کے لئے بہت خوشگوار نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے روسو کے علمی کام سے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ ہوسکتی تھی۔ روسو کا روزانہ میلوں ٹہلنا اسے پسند نہ تھا۔ پھر روسو کی پریشانی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس کا پورا گھرانا روسو کے سر کھاتا تھا۔ مگر جب روسو کی اس سے اولادیں ہوئیں اور اس نے اپنے پانچوں بچوں کو یتیم خانہ میں بھیج دیا تو پھر دونوں کے تعلقات بہت کشیدہ رہنے لگے۔ بچوں کا یتیم خانہ میں بھیجنا روسو کے سیاہ ترین اعمال میں سے ہے اور گو اس نے بعد میں طرح طرح کے عذر اور حیلے تلاش کرلئے مگر اسے اپنے اس فعل کی برائی کا اچھی طرح احساس تھا چنانچہ "ایمیل" میں لکھتا ہے: "جو باپ کے فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہو اسے اس کا کوئی حق نہیں کہ باپ بنے۔ نہ غربت، نہ کام کی زیادتی اور نہ لوگوں کا خوف اسے اس فرض سے بری کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی پرورش آپ کرے اور خود انھیں تعلیم دے۔ میری کتاب کے پڑھنے والو! میری بات پر یقین کرو۔ میں ہر اس شخص کو بتائے دیتا ہوں

جس کے سینے میں دل ہے۔ اور جو پھر بھی ان مقدس فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہتا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اس گناہ پر خون کے آنسو روئے گا اور اس کے دل کو کبھی تسلی نہ ہو پائے گی۔"

روسو اور اس کے حامیوں نے اس فعل کی بہت سی توجیہیں کی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو ہماری تشفی کر سکے۔ روسو کی زیادتی ہے جب وہ اپنے اس طرز عمل کو غریب افلاطون کے سر تھوپتا ہے کہ اس نے اپنی "ریاست" میں اسی کا مشورہ دیا ہے! روسو کا یہ خیال بھی محض بہانہ ہے کہ یتیم خانہ میں بچے گھر سے بہتر تعلیم پا کر نہایت محنتی کاشتکار بنیں گے اور ایمانداری کیساتھ روزی کما سکینگے واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسے اداروں سے جو بچے پڑھ کر باہر نکلتے تھے وہ جرائم پیشہ اور کسبیوں کے طبقے میں شامل ہوتے تھے۔ روسو کے وکلا کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ روسو ایسا کرنے میں اس وجہ سے حق بجانب تھا کہ وہ بچے دراصل اس کے تھے ہی نہیں اوّلاً اگر ایسا ہوتا تو روسو کے "اعترافات" میں جہاں اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا ہے، اس کی طرف بھی اشارہ ضرور ہوتا۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ایسا ہی تھا تو اس عورت سے قطع تعلق کے لئے یہ معقول اور کافی وجہ ہو سکتی تھی۔ مگر غریب بچوں کا بھلا اس میں کیا قصور تھا؟ مگر روسو بچوں کی ماں کو تو ان تمام واقعات کے بعد بھی اپنے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا رہا۔

روسو کو پیرس میں پھر ایک ایسا موقع ہاتھ آیا کہ اگر وہ چاہتا تو چین سے زندگی گذار سکتا تھا، وہ ایک بڑے عہدہ دار کا سکریٹری ہو گیا۔ مگر اسی زمانہ میں (۱۷۵۰ء) اس کی پہلی تصنیف شائع ہوئی جس کا ہم اس کی تصانیف کے تحت میں مفصل ذکر کریں گے کتاب جس قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اس نے روسو کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے آرام اور اطمینان کو قربان کرے اور اپنا علمی مشغلہ جاری رکھے۔ اس نے اپنی ضروریات زندگی کو بہت محدود کر لیا اور پھر اپنی روزی موسیقی کی تحریریں نقل کر کر کے کمانے لگا۔

۱۷۵۴ء میں روسو نے تھریسے کے ساتھ اپنے آبائی وطن، جینوا کا سفر کیا۔ اب روسو کوئی آوارہ گرد نہ تھا وہ ادبی دنیا میں کافی نام پیدا کر چکا تھا۔ جینوا میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ مگر کیتھولک مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے روسو اپنا حق شہریت کھو چکا تھا۔ اس حق کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے روسو پھر پروٹسٹنٹ مذہب میں داخل ہو گیا! اگرچہ وہ عرصہ تک پکا کیتھولک رہا تھا مگر اس مذہب کی ظاہری رسوم

اور پابندیوں پر اس کا اعتقاد ذرا مشکل سے جم سکتا تھا۔ اس نے آسانی سے اپنا آبائی مذہب دوبارہ قبول کر لیا۔ اس کے بعد سے مرتے دم تک اسے جینوا کی شہریت پر بڑا ناز رہا جینوا میں اس دفعہ اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی ہوئی جو ریاست کے دستوری مسائل سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ اور اسی قیام کے دوران میں اس نے پھر ایک ایسی کتاب تصنیف کرنے کا ارادہ کیا جس کا خیال پہلے پہل اسے وینس میں آیا تھا۔

پیرس واپس آکر جب اس کی ایک اور کتاب "عدم مساوات" پر شائع ہوئی تو اس کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگ گئے۔ ایک خاتون کی نوازش سے اسے پیرس کے پاس نہایت خوشنما علاقہ میں ایک آرام دہ مکان رہنے کو مل گیا۔ جہاں وہ کوئی چھ سال رہا۔ علمی اور ادبی کام کے اعتبار سے روسو کی زندگی کا یہ بہترین زمانہ تھا۔

پیرس کے پندرہ سال کے قیام میں وہاں کے بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں سے روسو کے گہرے تعلقات ہو گئے تھے مشہور فرانسیسی۔ انسائیکلوپیڈیا[1] کے تیار کرنے والوں۔ دیدرو، گرِم اور اولباک (ہولباخ)[2] سے اس کی اچھی طرح شناسائی ہوگئی۔ انسائیکلوپیڈیا کے لئے روسو نے موسیقی پر مختلف مضامین لکھنے کے علاوہ "معاشیات" پر بھی ایک مقالہ تحریر کیا۔

انسائیکلوپیڈیا والوں سے روسو کی دوستی تو ہوگئی مگر ان میں اختلاف کا پیدا ہونا بھی بالکل قدرتی امر تھا۔ اس گروہ کے خیالات اور روسو کے فلسفے میں بڑا فرق تھا۔ روسو نے اپنے ان تمام احباب اور خصوصاً والیٹر[3] سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اپنے خیالات میں شائستگی، اپنی نظر میں وسعت اور اپنے کلام میں ادبی چاشنی کے لئے بڑی حد تک انھیں کا رہینِ منت ہے یہ سب اس وقت اپنے اپنے فن کے

---

[1] یعنی وہ انسائیکلوپیڈیا جو اٹھارہویں صدی میں تیار ہوئی۔ لاک کے فلسفہ اور جدید علوم نظریہ کی مدد سے پرانے علمی اور مذہبی خیالات پر اس میں سخت نکتہ چینی کی گئی تھی شائع ہونے پر خصوصاً مذہبی حلقوں میں اس کے خلاف بہت شورش برپا ہوئی۔

[2] گرم اور اولباک (دراصل ہولباخ) دونوں المانی النسل تھے، مگر پیرس میں عمر گذاری۔

[3] والیٹر سے روسو کی ذاتی ملاقات نہ تھی۔ صرف تصانیف کے ذریعہ شناسائی ہوئی۔

مسلمہ استاد تھے۔ روسو نے ان سے پورا پورا استفادہ کیا۔ انھوں نے بھی کسی طرح مدد سے دریغ نہیں کیا۔ مگر یہ دوستی بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکی۔ قصوروار تھی کچھ تو روسو کی اپنی غیر معاشرتی طبیعت۔ کچھ روسو کا نیا اور ناکام عشق، جس کی یہ لوگ ہنسی اڑاتے تھے اور سب سے بڑھ کر روسو اور اس گروہ کے خیالات میں بنیادی اختلاف۔ روسو کے یہ احباب اس کی غربت پر ترس کھا کر جس قدر اس کی مدد کرتے تھے اُسے ان سے اسی قدر چڑھ ہوتی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اس کی آزادی میں بیجا مخل ہیں۔ روسو کی باتوں پر بعض اوقات وہ ہنستے تھے، اسے ناگوار ہوتا تھا۔ مگر اصل سبب جس کی طرف ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہ ان کے اور روسو کے فلسفۂ زندگی کا فرق تھا۔ روسو اپنے خیالات پر ایک کٹر مذہبی آدمی کی طرح قایم تھا، والٹیر سے گو اس کے ذاتی تعلقات نہ تھے مگر ان دونوں کے خیالات کے درمیان ایک زبردست خلیج حائل تھی اور روسو کی جھگڑالو طبیعت کے لئے یہ بہت کافی تھا۔ غرض روسو کی والٹیر، دیدرو، گرم اور اولباک سب سے ایسی چلی کہ خدا کی پناہ۔ ایک دوسرے کے خلاف تُو تُو میں میں پر اُتر آئے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب روسو نے اپنی دونوں مشہور کتابیں "معاہدۂ عمرانی" اور "ایمل" تیار کیں۔ "ایمل" کا شائع ہونا تھا (جون ۱۷۶۲ء) کہ کتاب کو نذرِ آتش کرنے اور اس کے مصنف کو گرفتار کرنے کا حکم حکومت کی طرف سے صادر ہوا۔ روسو کو اپنے دوستوں کے ذریعہ اس کی اطلاع پہلے سے مل گئی تھی اور سپاہیوں کے پہنچنے سے بس ذرا پہلے، رات کی تاریکی میں روسو نے سوئیٹان کا رخ کیا۔ مگر اس آزادی کے گھر میں بھی روسو کو آزادی نصیب نہ ہوئی۔ جنیوا میں "معاہدۂ عمرانی" اور "ایمل" دونوں ممنوع قرار دی گئیں اور روسو کے خلاف وارنٹ جاری ہو گیا۔ وہ وہاں سے بھی فرار ہوا۔ چند سال اس نے نیوخاتل میں گذارے جو اس وقت فریڈرک اعظم کے زیرِ حکومت تھا۔ مگر روسو کے مذہبی خیالات کی وجہ سے جن کا اس نے مباحثوں وغیرہ میں اظہار کیا، وہاں کے دینی پیشواؤں کے غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور اُسے یہ جگہ بھی چھوڑنی پڑی۔ کچھ دنوں اس کا قیام ایک پُرفضا جزیرہ "سیں پیر" میں رہا، یہ جگہ اسے بہت پسند تھی، اس جزیرہ پر بھی سوئیٹانی ریاست برن کی حکومت تھی۔ وہاں سے بھی اسے نکال باہر کیا گیا۔ اب اس نے اپنے جی میں کارسیکا جانے کی ٹھان لی، مگر پیشتر اس کے وہ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا ہو تھوڑ

انگریز فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اسے انگلستان آنے کی دعوت دی، اور روسو نے بہت تکلف کے بعد اسے قبول کرلیا ہیوم اور روسو بھی بالکل مختلف طبیعتیں لیکر پیدا ہوئے تھے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہیوم کو روسو کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی، وہ اسے انگلستان لے گیا اور جو کچھ اس سے ہوسکتا تھا اس نے روسو کیلئے کیا اس کا وظیفہ بھی مقرر کرادیا۔ کچھ دنوں تعلقات اچھے رہے۔ مگر روسو بھلا ایک مقام پر کب رہ سکتا تھا ادھر اسکی صحت بھی بہت خراب رہنے لگی۔ بیماری کبھی کبھی جنون کی حدتک پہنچ جاتی تھی وہ یکایک انگلستان سے فرانس واپس چلا آیا۔ اب بھی اس کا کوئی مستقل مسکن نہ تھا۔ ہر شخص سے ہیوم کی برائی کرتا۔ اس خیال نے اب اس کے دماغ میں اچھی طرح جگہ کرلی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے اسے نقصان پہنچانیوالے سایہ کی طرح اس کے ساتھ ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اسی نیم جنون کی حالت میں اس نے اپنے "اعترافات" اختتام کو پہنچائے۔

زندگی کے اخیر دن روسو نے پیرس کے پاس ایک گاؤں میں گذارے اور ۲ جولائی ۱۷۷۸ء کو یکایک اس کی روح عالم بالا کو پرواز کرگئی۔ یہ خیال بعد کی تحقیق سے بے بنیاد ثابت ہوا کہ اس نے خود کشی کرلی تھی جس طرح عمر بھر اسے چین نصیب نہ ہوا تھا۔ اسی طرح موت کے بعد اس کی ہڈیوں کو چین نہ ملا سولہ برس کے بعد ۱۷۹۴ء میں وہ پانتھیوں میں لاکر دفن کی گئیں ۱۸۲۱ء میں انھیں اوپر سے ہٹا کر نیچے تہ خانہ میں گاڑا گیا اور نو سال بعد پھر اوپر لے جائی گئیں مگر یہ تھا سب کچھ اعزاز کے سلسلہ میں!

یہ تھی مختصر سی داستان اس غیر معمولی شخص کی زندگی کی جس کا دل نیک اور جس کے تخیلات اخلاق اور مذہب کی انتہائی بلندیوں تک پہنچنے والے مگر جس کی زندگی کھوٹی اور جس کی سیرت ناقابل اعتبار تھی لیکن اگر جان بوجھ کر ان حالات کو نظر انداز نہ کیا جائے جنہوں نے روسو کو بگاڑنے میں تو بہت مدد دی اور سنوارنے میں ذرا بھی نہیں۔ تو روسو اس کا مستحق نہ معلوم ہوگا کہ اُسے برا کہا جائے، اس پر ترس کھانے کو جی چاہے گا۔

تصانیف ۱۷۴۹ء میں ایک دن روسو دیدرو سے ملنے کی غرض سے پیرس سے ونسین جا رہا تھا کہ اس

لہ۔ روسو کی تصانیف بہت سی ہیں اور ان کا تعلق کسی ایک علم یا فن سے نہیں۔ موسیقی اور ادب کے علاوہ بہت سے علوم سے ہے یہاں پر روسو کی صرف مشہور اور اہم تصانیف کا ذکر ہے۔

نے اخبار میں دیژون کی اکادمی کی طرف سے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان دیکھا جس میں اس سوال کا جواب طلب کیا گیا تھا کہ علوم و فنون کے احیائے اخلاق کو سدھارنے میں مدد دی ہے کہ بگاڑنے میں؟ اس سوال نے روسو کے تخیل کی دنیا میں ہلچل برپا کر دی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ سوتے سے چونک پڑا ہو ابھی منزل مقصود تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس نے اس سوال کا جواب لکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سائنس کی نئی نئی روشنی سے دنیا کی آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں نشأۃ ثانیہ کے ادبی کارنامے اور فنون لطیفہ، علوم فطری کی معرکہ آرا ایجادیں اور لاک کا فلسفہ ان سب نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ خیال تھا کہ اب وہ وقت دور نہیں جب کائنات کے تمام رموز انسان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ فرانس میں وہ مشہور انسائیکلو پیڈیا تیار ہو رہی تھی جس کا مقصد نہ صرف عالموں بلکہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کو بھی نئی علمی اور ادبی تحریکات سے آشنا کرانا تھا۔ ایسے وقت میں سائنس کی شان میں گستاخی ہمت کا کام تھا۔ جہاں کسی کی زبان پر ایک حرف بھی سائنس کے خلاف آیا اور "علما" نے اس کے خلاف "جہالت" کا فتویٰ دیا۔ مگر روسو ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو بہاؤ کے ساتھ بہتے ہیں اس نے اپنے لئے دھارے کے خلاف تیرنا پسند کیا۔

اکادمی کے اس سوال کی وجہ سے روسو کے دماغ میں جو خیال پیدا ہوا اور جس کا شاید اکادمی کو اعلان کرتے وقت گمان بھی نہ ہوگا۔ وہ انسانی فطرت اور تہذیب و تمدن کا تضاد تھا۔ روسو کے نزدیک فطرت کے معنی تھے سادگی، بھلائی، مساوات اور سب سے بڑھ کر آزادی۔ برخلاف اس کے تہذیب و تمدن کے لوازمات تھے۔ تعیش، بداخلاقی، غلامی اور ایمان و یقین کی کمزوری۔

روسو نے اپنی اس پہلی تصنیف میں جس پر اُسے دیژون کی اکادمی کی طرف سے انعام ملا اس خیال کو نہایت اصرار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جس قدر ہمارے علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اسی قدر ہماری روحیں برباد ہوتی جاتی ہیں۔ انسان اس وقت تک بڑی اچھی زندگی گذارتا ہے جب تک اُسے اشیاء کا علم نہیں ہوتا۔ مگر اس لاعلمی کو چھوڑ کر وہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ وہ اخلاق کھو بیٹھتا ہے اور غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے اس میں نہ تو ایمان ویقین کی حرارت باقی رہتی ہے اور نہ سچے عشق کا جذبہ اور دہریت کا الگ شکار ہو جاتا ہے۔

اس تصنیف میں روسو اپنے تمام دعوؤں کے لئے کافی دلائل فراہم نہیں کر سکا ہے۔ عبارت آرائی اور لفاظی نے بھی مقالہ کی علمیت کو صدمہ پہنچایا ہے مگر باوجود ان باتوں کے اس کے شائع ہوتے ہی فرانس کی علمی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔ اور کیوں نہ مچتی۔ عبارت کا ہر لفظ دہکتا ہوا انگارہ ہے مصنف دیکھتے دیکھتے غیر معمولی شہرت کا مالک ہو گیا۔ کتاب کا مقصد لا مذہبوں کے علاوہ ارباب انسائیکلوپیڈیا کی مخالفت بھی تھا اور اگرچہ روسو خود انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگاروں میں سے تھا مگر وہ جس نہج پر تیار کی جا رہی تھی اس سے روسو متفق نہ تھا۔ اس مقالہ کے شائع ہوتے ہی انسائیکلوپیڈیا والوں اور خاص طور پر والیٹر اور دالمبر کے کان کھڑے ہو گئے اور آخر میں اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ہم روسو کی زندگی کے حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

ڈیژون کی اکادمی کی طرف سے ۱۷۵۳ء میں پھر ایک تحریری مقابلہ کا اعلان ہوا۔ ایک موضوع مقرر کیا گیا تھا۔ "انسانی عدم مساوات کی ابتدا، اور بنیادی اسباب" روسو نے اس موضوع پر بھی ایک مقالہ تیار کیا۔ مگر اس دفعہ وہ انعام حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

بغیر کسی شک وشبہ کے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ روسو کی تصانیف میں یہ مقالہ سب سے زیادہ انتہا پسندانہ ہے مرکزی خیال وہی ہے جو پہلی تصنیف کا تھا۔ روسو فطری زندگی کی وکالت کرتا ہے مگر یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ واقعی کبھی ایسی صورت حال موجود تھی۔ تمام مصائب اور تکالیف جو آج انسانوں کو اٹھانی پڑتی ہیں وہ دراصل ان کا اپنا قصور ہیں۔ انسان نے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری جب اس نے فطری زندگی کو خیرباد کہا۔ اس زندگی میں انسان کی ضروریات کم تھیں۔ کام کی تقسیم ایسی نہ تھی۔ کہ غلامی اور عدم مساوات ناگزیر ہو۔ عقل کی جگہ انسانی طبیعت اعمال میں رہنمائی کرتی تھی۔ مگر باوجود ان سب خوبیوں کے روسو لوگوں کو جنگلوں میں بسنے اور درندوں کی طرح زندگی گذارنے کا مشورہ نہیں دیتا جیسا کہ بعض لوگ غلط فہمی کی وجہ سے اور بعض طنز کے طور پر کہتے آئے

ہیں :

روسوؔ کی تیسری اہم تصنیف ایک ناول ہے۔ (Nouvelle Heloise)
اس کتاب میں روسو کا مقصد سچے عشق کی تصویر کھینچنا ہے۔ اور عشق سے روسو کی مراد اس انسان کی بے غرضانہ محبت ہے جو ابھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہو۔

روسو کی ہیروئن ژولی نہایت ہی نیک نفس لڑکی ہے وہ اپنے دل کی آواز کے سامنے عقل کی بات نہیں سنتی۔ تن من دھن سب کچھ وہ اپنے منظورِ نظر پر نثار کرنے کو آمادہ ہے۔ مگر ژولی کے عالی خاندان والدین کو یہ گوارا نہیں ہے کہ ان کی بیٹی ایک معمولی گھرانے کے نوجوان کے ساتھ بیاہی جائے۔ اب ژولی کو دو صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یا وہ اپنے والدین کی دل دکھانے والی نافرمانی کرے اور یا اپنے محبوب سے عمر بھر کے لئے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ژولی نے دوسری صورت اپنے لئے منتخب کی۔ اس کی شادی والد کی مرضی کے مطابق ایک دوسرے شخص سے ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جانے کے بعد فرض کا احساس عشق کے جذبہ کو دبا لیتا ہے۔ روسو کا مقصود عشق کے خلوص اور حق کو جتانا ہی نہ تھا۔ وہ نکاح کے احترام اور میاں بیوی کی باہمی وفاداری پر زور دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں فرانس کے اچھے تعلیم یافتہ خاندانوں میں نوجوان لڑکیوں کے ساتھ تو سختی برتی جاتی تھی مگر شادی شدہ عورتوں کو بہت آزادی حاصل تھی۔ روسو اس ذہنیت کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے۔ مگر ان دونوں تخیلات یعنی حق محبت اور احترام نکاح کو یکجا پیش کرنا ذرا مشکل ہے۔ اور ژولی کی شخصیت میں گو روسو نے دونوں رجحانات جمع کئے ہیں مگر یہ یکجائی بالکل ظاہری اور بہت سطحی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ ایک موقع پر جسے کتاب کا "بیت الغزل" کہنا چاہئیے ژولی کے سینے کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اور جب وہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے تو کہتی ہے کہ دراصل عشق اُسے اپنے شوہر سے نہیں بلکہ پہلے محبوب ہی سے تھا۔ وہ نوجوانی ہی کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور اس سوال کا جواب ہمیں اس کتاب سے نہیں ملتا کہ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو کیا پیش آتا!

روسو نے اس ناول میں نہ صرف سچے عشق کی تصویر کھینچی ہے بلکہ اپنے بہت سے معاشرتی تعلیمی اور مذہبی خیالات بھی پیش کئے ہیں اور اس وجہ سے کہیں کہیں "آورد" کا شبہ ہوتا ہے اس زبردست مذہبی کشمکش پر جو روسو کی زندگی میں انسائیکلوپیڈیا والوں اور ان کے مخالفین میں جاری تھی اس نے اپنے خیالات کا اظہار اس ناول میں تفصیل کیساتھ کیا ہے، اور دونوں کے تضاد کو کم حقیقت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ژولی اور اس کا شوہر دونوں شریف خصلت انسان ہیں۔ مگر ان میں سے ایک "مومن" ہے اور ایک "کافر"۔ البتہ ژولی کی مذہبیت پادریوں والی مذہبیت نہیں خود روسو کی مذہبیت ہے جس میں تصوف کا رنگ اور نکھر آیا ہے۔

۱۷۶۲ء میں دنیا کے سامنے روسو کی وہ معرکۃ الآرا کتاب آئی جس کا ترجمہ اس وقت اردو میں پیش کیا جارہا ہے۔ "معاہدۂ عمرانی" اگرچہ روسو کے خیال میں ایک ناتمام تصنیف ہے اور نظر ثانی کی محتاج۔ لیکن روسو کے تمام سیاسی تخیلات اس میں کامل پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ اس تصنیف میں روسو کے نظریوں کی اساس قانونِ فطرت ہے۔ اور روسو شروع سے آخر تک اس حقیقت پر نہایت سختی کے ساتھ مصر ہے کہ طاقت کو حق (قانون) نہیں کہا جاسکتا۔ قوت کا ہر استعمال صرف اس صورت میں جائز ٹھہر سکتا ہے جب وہ ارادۂ اجتماعی اور قوم کی مرضی کے مطابق ہو۔ ارادۂ اجتماعی (Volonte generale) سے مراد کسی خاص وقت میں تمام افراد کے ارادوں کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ ارادہ مراد ہے جس پر نسلاً بعد نسل قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی خاص زمانے

ؔ۵۔ فرانسیسی زبان میں Contrat Social کا بہترین ایڈیشن M. Dreyfus - Brisac کا ہے۔ تمام مہذب قوموں کی زبانوں میں اس کے ترجمے موجود ہیں انگریزی میں اس کے متعدد ترجمے ہیں سب سے پہلے ۱۷۶۴ء میں اس کا ایک ترجمہ شائع ہوا تھا۔ بعد میں R. M. Harrington، H. J. Tozer ٹوذر، G. D. H. Cole کول اور ایکلر P. Eckler نے ترجمے کئے ہیں۔ ٹوذر کی زبان بہت شگفتہ ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی غالباً کول کا ترجمہ بہترین ہے۔

کے لوگ ایک بات طے کر کے دوسرے زمانے کے لوگوں کو اپنے ارادہ کا پابند بناسکیں، پھر زمانوں کی تقسیم بھی تو ناممکن ہے۔ قوموں کی زندگی میں اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ کب ایک پیڑھی ختم ہوئی اور دوسری شروع۔

یہ خیال کہ قوم خود اپنے بُرے بھلے کی مختار (Sovereignty of the People) ہونی چاہیئے روسو نے پہلی مرتبہ پیش نہیں کیا۔ عہد اوسط کے آواخر میں اس خیال کے بہت سے حامی تھے مگر عہد جدید میں بلاشبہ روسو اس کا پیغمبر ہے اور اس پر عہد اوسط کے تخیلات کا اتنا اثر نہیں معلوم ہوتا جتنا خود اس کے وطن جینوا[1] کے دستور کا۔ روسو کا کمال خیالات کی ندرت میں نہیں خیالات کو اس طرح پیش کرنے میں مضمر ہے کہ اس کی بات کو لوگ کان لگا کر سنیں۔ ناممکن ہے کہ آپ معاہدۂ عمرانی کو شروع سے آخر تک پڑھیں اور کوئی اثر قبول نہ کریں۔ اس کتاب پر کبھی کبھی یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ تکرار کتاب کا عیب نہیں ہنر ہے۔ اسلیے کہ روسو کو تو اپنی بات دلنشین کرانا مقصود ہے۔ اور تکرار اس کا بہترین ذریعہ ہے۔

فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں روسو کی یہ تصنیف انقلابیوں کی انجیل تھی۔ ان کے لئے دنیا کے تمام سیاسی حقائق اس کے اندر موجود تھے۔ ایسے حقائق جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں یکساں طور پر صحیح ہوں۔ اُن کی نظر میں انسانیت کا بھلا اسی میں تھا کہ معاہدۂ عمرانی کے اصول کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کے علمبردار اس تصنیف کو مصنف سے بھی زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔ روسو کے خیال میں تو ایسا دستور ترتیب دینا ناممکنات سے ہے جو ہر ملک کے لئے یکساں طور پر موزوں ہو۔ طرح طرح کی مثالیں دے کر روسو یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک دستور جو کسی خاص ریاست کے لئے بہترین ہو، بہت ممکن ہے کہ کسی دوسری ریاست میں بدترین ثابت ہو۔ چنانچہ جب روسو کو کارسیکا کا دستور بنانے کی دعوت دی گئی تو اس نے پہلے معافی ہی چاہی۔ اور بعد میں پولینڈ کا جو دستور اس نے تیار کیا اس میں یہ اچھی طرح

---

[1] معاہدۂ عمرانی کے سرورق پر روسو اپنے نام کے ساتھ خاص طور پر "جینوا کا شہری" لکھتا ہے

واضح کردیا ہے کہ غیر ملکی کبھی بھی کسی ملک کے لئے مناسب قوانین وضع نہیں کرسکتا، نیز یہ کہ قوانین سے زیادہ قومی روایات اور رسوم اہمیت رکھتی ہیں۔ اور غیر ملکی انھیں کامل طور پر کبھی نہیں سمجھ سکتا۔

صرف اس صورت میں کہ روسو کی تمام سیاسی تصانیف پیش نظر رکھی جائیں ہیں اس کے فلسفۂ سیاست کی تدریجی ترقی اور ان تبدیلیوں کا اندازہ ہوسکتا ہے جو روسو کے خیالات میں پیدا ہوتی رہیں۔ مثال کے طور پر اگر "انسانی عدم مساوات" سے "معاہدۂ عمرانی" کا مقابلہ کیا جاے تو یہ پتہ چلیگا کہ روسو کے فطری اور مدنی زندگی کے نظریہ میں کافی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مگر "معاہدۂ عمرانی" فلسفۂ سیاسیات پر روسو کی آخری کتاب ہے۔ اور اس لئے اس میں روسو نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں کو روسو کے تخیل کا پختہ تر سمجھنا چاہیئے۔

روسو کے "معاہدۂ عمرانی" کا جو درجہ فلسفۂ سیاسیات میں ہے۔ وہی رتبہ "ایمیل" کا فلسفۂ تعلیمات میں ہے۔ افلاطون کی "ریاست" کے بعد روسو کے زمانے تک فلسفۂ تعلیم پر کوئی دوسری تصنیف ایسی نہیں جو "ایمیل" سے ٹکر کھا سکے۔

ایمیل تعلیمی تصنیف سے زیادہ ایک فلسفیانہ کتاب ہے۔ انسان فطرتاً نیک واقع ہوا ہے مگر اس کی برائیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ روسو نے اس کتاب میں اسی کی تشریح کی ہے اور اس کے اسباب بتائے ہیں۔ روسو کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام انسانی کمزوریاں اور خرابیاں روشن ہوجاتی ہیں اگر انسانی دل کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔

روسو اپنے نظرئے تجربہ کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے تعلیمی نظریوں کو اتنی اہمیت نہیں دیتا جتنی کہ اُن دعووں کو جو اس نے انسان اور خصوصاً بچے کی فطرت اور نفسیاتی کیفیت کے متعلق کئے ہیں۔ زیادہ اہم سبق روسو کی نگاہ میں وہ ہیں جو خود بچے کی فطرت اس کی مختلف صلاحیتوں اور قوتوں کو ابھار کر اسے دیتی ہے۔ بچے کو انسان کا شاگرد نہیں۔ فطرت کا شاگرد بننا چاہیئے۔ زیادہ

---

[1] معاہدۂ عمرانی کی طرح اس کے بھی انگریزی میں کئی ترجمے ہیں B. Barbara Foxley کا ترجمہ بہت معتبر ہے۔

سے زیادہ انسان یہ کر سکتا ہے کہ بچّے کو بُرے اثرات سے دور رکھے۔ روسو اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ہر انسان کی فطرت جداگانہ ہوتی ہے یہی نہیں۔ اس کی عمر کا ہر دور ایک مخصوص فطرت رکھتا ہے۔ اور اسی کو پیش نظر رکھ کر ہر فرد کے متعلق الگ الگ فیصلہ کرنا چاہیئے۔

تعلیم کا مقصد ہے سمجھدار انسان پیدا کرنا۔ روسو کے خیال میں سمجھ ابتدا سے انسان میں موجود نہیں ہوتی۔ جب انسان کی دوسری صلاحیتیں نشوونما پا جاتی ہیں تب جاکر کہیں سمجھ پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ پس اگر معلم متعلم کو سمجھ دار سمجھ کر تعلیم دینا شروع کرتا ہے تو گویا وہ اس جگہ سے ابتدا کرتا ہے جو تعلیم کی آخری منزل ہے!

روسو کی آخری تصنیف اس کے "اعترافات" confessions ہیں جو ادبی حیثیت سے فرانسیسی زبان میں ایک انقلاب کا موجب ہوئے۔ خود نوشت سوانح عمریاں بہت سی لکھی گئیں، مگر مشکل سے کبھی کسی نے اپنی زندگی کا ہر پہلو ایسے بے دھڑک طریقے سے بیان کیا ہوگا۔ روسو نے اعترافات میں گویا اپنا دل کھولکر رکھ دیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ یہ کتاب اس نے شروع سے آخر تک دل کی مدد سے لکھی ہے؛ دوسری تصانیف میں اس کے ذہن کو بھی کہیں کہیں دخل ہے! اس نے اپنی زندگی کی تصویر کا پہلا رخ ہی نہیں دوسرا رخ بھی دکھایا ہے۔ جب یہ "اعترافات" روسو کی موت کے چند سال بعد ۱۷۸۲ء میں شائع ہوئے تو روسو کے بہت سے مداح جو اس کی تصانیف کو پڑھ کر اس کے بہت معتقد ہوگئے تھے سخت مایوس ہوئے۔ سچ ہے غریب روسو کی زندگی اس قابل نہ تھی کہ اسے نمونے کے طور پر آنکھوں کے سامنے رکھا جاتا۔

روسو نے "اعترافات" دراصل اس غرض سے لکھنا شروع کئے تھے۔ کہ انسانی خیالات اور اعمال کی صحیح صحیح تصویر کھینچے انسان کا ظاہر اور باطن سب کچھ دکھلائے تاکہ فلسفی ایسی نفسیاتی تصنیف سے فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ "اعترافات" کے ابتدائی ابواب اسی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں مگر اعترافات کو صرف اسی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ روسو کی زندگی اخلاقی مدوجزر کی ایک عجیب مثال ہے، اور ان واقعات کا جن پر روسو بجا طور پر شرمندہ تھا اس کے قلب پر اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ

اور نہیں تو اپنی شرمندگی ہی کا اظہار کرکے اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کا ایک حصہ توبہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ مگر اس انداز میں بھی کتاب ختم ہونے نہ پائی تھی کہ اس کی زندگی کے آخری زمانہ میں والٹیر اور دوسرے انسائیکلوپیڈیا والوں سے اس کی لڑائی ہوئی۔ انھوں نے طرح طرح سے روسو کو بدنام کیا۔ روسو کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی زبردست "سازش" کا شکار ہے جس کا مقصد اسے بدنام کرنا اور لوگوں کی نظروں میں ذلیل ورسوا کرنا ہو۔ یہ خیال یوں کہنا چاہیئے کہ جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ "اعترافات" کے آخری حصے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسو اپنے اوپر سے الزام ہٹانے اور اپنے سیاہ اعمال کے معقول عذر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ روسو کی اس آخری تصنیف کو ان تینوں باتوں کو پیش نظر رکھ کر پڑھنا چاہیئے۔

روسو کی تمام تصانیف کو پڑھتے وقت ایک بات کا ہمیشہ لحاظ رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ اس نے اپنے خیالات شاعرانہ زبان میں ادا کیئے ہیں روسو ہی نہیں اس زمانے کے اور مشہور فلسفی مثلاً والٹیر بھی ایسا کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے لئے اپنے خیالات کو زبان پر لانے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ طنز، استعاروں، اور اشاروں سے مدد لی جائے اور اس طرح سرکاری وغیر سرکاری غیظ وغضب سے نجات حاصل کی جائے۔

(باقی)

زندگی

صبح کو چند مہمان آ گئے تھے تمام دن ان کی خاطر مدارات میں صرف ہو گیا۔ عصر کے قریب میں بشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہر کی ہوا خوری بھی نہ ہو سکی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفہ فطرت کے مطالعہ کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا تھا کہ کسی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دبلا پتلا چھوٹے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا شام کے دھندلکے میں اسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی لیکن جب اس نے مانوس اور خیریت آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہو سکتی تھی۔ میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا تو سب سے پہلے میں نے اس کی ہیئت ظاہری پر لب کشائی کی جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ پر اپنے بے تکلفانہ انداز میں اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا "خیریت تو ہے۔ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی سکتا"

اس نے کچھ رکتے رکتے کہا "میں ملتان سے آ رہا ہوں۔ راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہو گیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ تمہارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے بلکہ اس سے بھی شدید جیسا کسی مصور یا نقاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کئے ہوئے نوادر روزگار کا کھو یا جانا۔ یقیناً اس حادثہ سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟

اس نے کہا "بندہ خدا، مذاق پھر کر لینا پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام وطعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھیروں گا"

"بسم اللہ، آیئے" میں سیدھا اسے اپنے بیٹھنے کے کمرے میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے اور لمپ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو اتار کر میز پر پھینک دیا اور زیرلب گنگنانے لگا لیکن اس کی ہئیت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے دراصل آج کا اصغر اس اصغر سے جسے میں جانتا تھا کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اداس، منحنی سا چہرہ، معمولی ادنیٰ درجہ کے لباس میں ملبوس، آنکھوں میں پریشانی کے آثار، اور کہاں وہ جاق چوبند خوش طبع، انگریزی فیشن کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اس کا حسن مذاق مسلم اور اس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔ چند لمحے خاموشی میں گذر گئے تو میں نے کہا "ہاں تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

ارے بھئی کوئی بات ہو تو کہوں سراسر میری ہی غلطی تھی میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑ بن جاری رہی اور میں اس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ راستہ میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے یہیں ٹھیر جاؤ تاکہ تلاش و تفتیش میں سہولت ہو مگر میں نے سوچا مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا ورنہ جان تو باقی ہے

اُن کو ضروری ہدایت دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا۔ مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیش نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دو چار ہونے والا ہوں وہاں لباس ایسی اہم اور ضروری چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو، اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑبن میں گزار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کرسکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی اور تمھاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلی معلوم ہوتی ہے"

"تعلی"! اصغر جھک اٹھا "تم دیکھوگے کہ میں نے اپنے اصول سے سرموانحراف نہیں کیا ہے باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض یہ ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعویٰ نہ کیا تھا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اسرار حیات کو سمجھ لینے کا دعویٰ تو مجھے نہیں ہاں میں نے ایک ایسا نکتہ ضرور معلوم کرلیا ہے جس سے زندگی کی نہایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کرلئے ہیں جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو لیکن ایسی ہنسی میں پہلے سینکڑوں مرتبہ دیکھ چکا ہوں۔ تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کرسکتے۔ بیشک مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کے دفعیہ کے لئے میں ہمہ اوقات مصروف جد و جہد ہوں۔ آخر انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردش مدام سے گھبرا نہ جاؤں ہرچند جانتا ہوں کہ یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیل حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جسکی حقانیت و صداقت پر میرا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی چیز، مادی یا غیر مادی

ایسی ہے جس کی بنیاد وہم پر نہ ہو؟ عزیز دوست، انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ و زاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو اور پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ زندگی پر ایک غیر فانی گرفت تمھیں حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟ علت و معلول کی اس دنیا میں جہان جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلہ میں منسلک ہیں، میں اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشا نتائج اخذ کرنے کے لئے، اسباب پر قدرت کاملہ حاصل کرنے کا متمنی ہوں۔ مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبایع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمھارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔"

ابھی خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اسے خاموش کر دیا۔ میں نے کہا "سبحان اللہ، کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپکو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آجائے۔ ذرا اس چہرہ کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نظر نہیں آتا اپنی شکن در شکن پیشانی دیکھو۔ رخساروں کی زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گذرا ذوق جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگ شباب کی اصلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے پچھلے حالات قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں کہ یہ گفتگو زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔ اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی دارالاقامہ میں رہے جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر

لی والدہ انتقال کر چکی تھیں اور اس کے والد نے نکاح ثانی کر لیا تھا۔ اصغر کے حقیقی بھائی بہن کوئی نہ تھا اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات اگر کشیدہ نہ تھے تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ کے باعث اصغر کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز اس کی اپنی ہی زندگی تھی چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں، کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گذار لیتا یا اگر جیب گرم ہوئی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ حالات کی اس ناسازگاری نے اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور ارادہ میں پختگی پیدا کر دی تھی۔

ہیئتِ اجتماعی کا فرد ہونے کی حیثیت سے انسان پر بہت سے فرائض ایسے بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروت، بیوی بچوں کی محبت، بھائی بہنوں کے تعلقات غرض ایسی سیکڑوں زنجیروں نے ہمیں سوسائٹی کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم رہا ہی نہیں۔ دراصل انسانی زندگی ان ہی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔ کہتے تو ہیں کہ اکیلا خدا دشمن کو بھی نہ کرے مگر ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندہ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں بلاشبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اس کی ایسی ہی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھوچکا سا کر دیا تھا کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعتوں

میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریقے سے تقسیم کر رکھے تھے اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا پڑھنے پر آتا تو رات کو آنکھ جھپکانا بھی حرام سمجھتا میں کبھی اس کے لاابالی پن پرلب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنیکا خواہاں نہیں ہوں کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصود زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدہ کی صلاحیت سلب کرے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہوسکے" اور پھر خوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمھیں نصیب ہم کو تو رنج ہو۔ جو غم جاوداں نہ ہو

دو سال بعد جب اتفاق سے میرا اور اس کا قیام ایک ہی کمرے میں ہوگیا تو اس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اس کا معمول تھا کہ سرِشام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات گئے گیارہ بارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم ۹ بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوبیٔ قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت با مذاق اور زندہ دل تھے۔ انھوں نے جب شکایت کی اصغر صاحب نے ہنس کر جواب دیا "حضرت، انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں بعض کو قدرت مستثنیٰ بنا کر پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انھیں میں سے ہے"۔

اس کی صحبت یقیناً افزائش مسرت کا موجب تھی۔ مگر جب وہ آدھی رات کو آکر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اس کا تو مہینہ میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلاف معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کردیا بڑی بے تابی سے پوچھنے لگا "خیر ہے، کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں چلانے لگا "تمھارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا، دن بھر کالج کی بک بک میں صرف ہوجاتا ہے، رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کردیتے ہو۔ اگر

ایسی ہی آوارگی دماغ میں سماگئی ہے، تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے"

وہ بستر سے اچھل کر مجھ سے آلپٹا" دوست خفا ہو گئے۔ سچ پوچھو تو تمھارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گذر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا کب سلیقہ تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصول علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کے مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو دنیا جہاں کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم جینبر کی کتاب سے حاصل ہوتا ہے یا تجربات ذاتی سے"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق بھی اس کا نظریہ عجیب تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو بھی لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔ جو دھویں صدی کی شعلۂ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں۔ پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گذارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہو گا جو گذشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے اور ایام رفتہ کو یاد کرکے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بیچارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔ نادان نہیں جانتے کہ اس تغیر پذیر عالم ارضی میں اکثریت ان کی ہے۔ "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"۔ بھائی سچ پوچھو تو میں تو شطرنج اور ٹنیس کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح

دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی چیز کا پابند ہو جانا زندگی کی نشوو ارتقا کو غارت کر دیتا ہے۔ رنج و مسرت کی تخلیق تو ہمارے نفس کے سپرد ہے واقعات خارجی کو ہم اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں ورنہ غم و شادی تو ایک اضافی امر ہے۔

اصغر صرف لباس کے معاملہ میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ انھیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیات انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے ان کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں فیشن کے مطابق شاندار لباس زیب تن ہو اور واقعات عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمھیں آتا ہو تو دنیا کو الو بنا لینا بڑی بات نہیں"۔ ایک دن تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا جس میں پہن کر جانے کے لئے اس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی اچھی نکٹائی نہ تھی۔ اُدھر مہینے کا اخیر تھا اور اس کی جیب خالی ہو چکی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفہ کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے یہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اصغر ایک معمہ تھا۔ جن لوگوں کو اس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلیاں دیکھ دیکھ کر زہر خند ہو جانے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب و ثواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا ہو، نیکی و بدی کا کوئی کوچہ نہ تھا جس کو اس نے

پامال نہ کیا ہو اور پھر دامن جھاڑ کر یوں نہ نکل آیا ہو کہ

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

میں اس کی دقت نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ لاعلمی اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ان چند در چند نفوس میں سے تھا جو بقول اسپنسر "سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں" اصغر یقیناً ایک رجائی تھا لیکن اس کی امید جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اس نے زمانہ کا سرد وگرم چکھا۔ خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بنکر گذرا اور پھر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ "کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا۔"

(اپنی نگاہ میں رنگینی پیدا کرلو اور کل کائنات قوس قزح کی طرح نظر فریب ہو جائیگی طبیعت میں استغنا پیدا کرلو تو جھونپڑی میں بھی محلوں کے خواب دیکھوگے۔)

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے۔ ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہد ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر اپنے حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا وہ اصغر کو "ہری چگ" کے نام سے پکارتا تھا اور اصغر صاحب تھے کہ اس لقب کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلہ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا وہ کہنے لگا " دیکھو بھئی وحید! اگر چند سے تمھاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہکنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی اور تم ان کے جانشین کی حیثیت سے مسند جنون پر رونق افروز ہوگے اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدان عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس "نیک بخت" کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے، میں سنتا ہوں کہ تمھاری محبوبہ

ہندوستان کے جذبات کس طرز انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کردی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو
تم کیوں پہاڑ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے
اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے خون کا جوش زیادہ ہوا
محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ محبت کا جذبہ بے لوث صرف ماں کے سینے میں فروزاں
ہوتا ہے اور باقی سب باطل۔ اس غلام آباد میں مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ بھی بڑھا
لیا جائے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر
آنکھوں سے آنسو بہانا ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا۔ دنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا
ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دین داری میں
داخل ہے۔ تم گردن جھکا کر آنکھیں بند کیے گذر رہے ہو درآنحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں
معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں اپنی
زبان حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بستر علالت پر کراہ رہا ہے اور
کوئی عسرت و تنگدستی کے ہاتھوں نالاں ہے۔ کوئی کسی عزیز کی موت پر نالہ کناں ہے اور
کوئی فکر فردا اور غم ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ ہم ابھی تک بحر حیات کی
موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جو سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گہر ہائے
نایاب موجود ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد
اور معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گذر جاتا ہے اور تم اس شمیم جاں فزا کو مقید کرنے کی فکر میں ہو
یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گذرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ ان کی عطر بیزی سے
اپنے دل و دماغ کو معطر کرو اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس
دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں اور پھر ان دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے
اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشم تخیل کے سامنے لاؤ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان
اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے، جو فنا کے غار عمیق کے کنارے کھڑی یاد

مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمھاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنیٰ سا اشارہ تمھیں ملیا میٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمھیں اپنے بستر سے صحیح و سالم اٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا تمھارے اوہام و ترددات تمھاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو استعمال کرو اور سوچو کہ تمھاری کل پریشانیاں کیا صرف اس نقطہ پر نہیں آ کٹھتیں کہ تمھیں پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا لیمپ میسر نہیں آتا تو بلا سے دیسی جو تا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست ذرا غالبؔ معجز بیاں کے اس شعر پر غور کرو۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تم بھی دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں جن سے متاثر ہونا قرین دانش نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض و غیر جانب دار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو۔ اس عالم متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے۔ زمانہ کی نیرنگیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمھیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعاتِ عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنس داں کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو یہ کیفیت ہے کہ

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد کیوں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے

اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کود حرام کرے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرکے تشخیص امراض و معائنہ مرضیٰ تک ہی اپنے تئیں وقف کردے تو اس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں رد و بدل کرتے رہوگے تو دنیا کی اشیاء زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی فقیروں کا بھیس بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے؎

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالبؔ　　　　چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

بی اے تک ہم ساتھ رہے۔ اس کے بعد میں ایم اے میں آگیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا۔ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ اسکے والد اسے مزید تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درسگاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گذر گیا اور اگلے برس اصغر نے یکایک لا کالج میں داخل ہوکر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کرکے ہر روز آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اس کی باقی زندگی انھیں دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی شائق تھا۔ اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی جدت پرستی ہی کا کرشمہ تھا۔ مگر اس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جنھیں صبح شام بجز کتابوں کے اور کسی چیز سے سروکار نہ ہو۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اس کے والد جو پہلے ہی سے تعلیم کو ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے یہ خبر سنتے ہی برس پڑے صاف صاف انھوں نے کہدیا کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماشبینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا"

اسی گفتگو سے متاثر ہو کر اصغر صاحب گھر سے چل کھڑے ہوئے تھے اور کپڑوں کا بکس کھو کر اداس و مضمحل میرے پاس پہنچے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں"

بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے؟ میں نے حیرت سے پوچھا

"تم حیران کس بات پر ہوتے ہو! میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ نہیں رہا ہوں کہ اس سے کم کسی چیز سے میری تشفی نہ ہوگی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ وہ چیزیں ہیں جو میں بہرحال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں"

چند روپے ان کے پاس تھے، کچھ مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو تین سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے کیونکہ نہ اس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے ہم سبق دوست آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے اور وہیں ان کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب برات اور ولیمہ کی گھما گھمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام کو تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع و شاندار عمارت کے ایک پرتکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامان اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم شوربے کی رکابیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالم خواب ہے اور جو دیکھ رہا ہوں اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور

سوائے ایک خفیف تبسم کے اس کے چہرہ پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چن رہا تھا جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بے اختیار اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا "اصغر تم کہاں؟" اس نے نہایت تحمل سے جواب دیا" یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے پھر باتیں کریں گے" میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے انھیں یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہوگی جب ہم بل ادا کر کے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا" ابھی کام ختم نہیں ہوا ورنہ میں تمہارے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھیرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤں گا"

میں نے اسے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور بمنت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اولین فرصت میں ضرور پہنچنا۔ دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختئی رنگ کا سوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے اس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔

میں بار بار اس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون آدم زاد کا خمیر کس مٹی سے ہوا ہے رات ایک ہوٹل کا خدمتگار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پوچھا" تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا گریجوایٹ اور تم سا زیرک اور خوش فہم شخص یوں ذلیل و خوار ہو"

اس نے کہا" اگر تم نے زجر و توبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور قائم ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابل عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ میں کس

امذا نے اس اصول کو اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں غم دنیا و فکر عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا اچھا پہنا، بمبئی ایسے شہر میں فطرت انسانی کا مطالعہ اور مجھے کیا چاہیئے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہوں۔ مدرسی اور اخبار نویسی میں نے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے ؎ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

"میری صحت دیکھو، قابل رشک ہے یا نہیں؟" اصغر کی صحت واقعی منبطیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت۔ اس پر اس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔ "آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انھیں کے مکان پر ہوں اور شام کو تاج محل ہوٹل۔ پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے شرائط ابھی طے نہیں ہوئے ہیں۔ ممکن ہے چند ماہ میں جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

غزل

حریمِ ناز میں میری نماز ہو جائے
جبینِ شوق سراپا نیاز ہو جائے!

ہر ایک شے میں درخشاں ہو جلوۂ عصمت
مری نگاہ اگر پاکباز ہو جائے

پھر آرزو سے یہ معمور ہو گیا اے حسن!
دیارِ دل پہ پھر اک ترکتاز ہو جائے

یہ میری زیست کا حاصل ہے آپ کا کیا ہے!
اگر نگاہِ محبت نواز ہو جائے۔

کچھ ایسا نغمۂ بے تاب چھیڑ اے مطرب!
کہ بے قرار مرے دل کا ساز ہو جائے

مری نگاہ میں پھر کیا ہے گردشِ گردوں!
تری نگاہ اگر کارساز ہو جائے

وہی ہے رندِ حقیقت شناس نظروں میں
کہ پیرِ میکدہ سے بے نیاز ہو جائے

تلاشِ خویش میں گم ہوں یہ کیا قیامت ہے
کہ راز آپ ہی جویائے راز ہو جائے

نہ کٹ سکے گی شبِ تارِ زندگانی کی
یہ داستانِ محبت دراز ہو جائے

بہشتِ زیست ہے سوز و گدازِ عشق اختر
خوشا وہ دل! کہ سراپا گداز ہو جائے

تنقید و تبصرہ

کتب۔

باطل شکن۔ الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح۔ ترکی جمہوریہ۔ مفتاح العربیہ۔ اصح السیر فی ہدی البشر

رسائل۔

یادگار رسالانہ نمبر۔ سالنامہ حقیقت الاسلام۔ ساقی۔ سالانہ نمبر

باطل شکن | مصنفہ مولانا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ حجم ۶۸ صفحات قیمت فی نسخہ ۳ ۔ ملنے کا پتہ۔ منیجر صاحب مکتبہ عبرت۔ نجیب آباد ضلع بجنور۔
ایک عیسائی پادری نے ایک کتاب تاویل القرآن لکھ کر اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی قرآن کی رو سے مذہب حق پر ہیں اور اہل اسلام کو ان سے مذہبی امور دریافت کرنے چاہئیں۔ اور ان کو برسرحق تسلیم کرنا چاہیئے۔ مولانا اکبر شاہ خاں نے قرآنی دلائل سے اس کتاب کے دجل و فریب کو نہایت خوبی اور صفائی کے ساتھ واضح کردیا ہے۔ اور یہ دکھلا دیا ہے کہ قرآن کریم کے ہوتے ہوئے کسی قوم کا مکروفریب مسلمانوں پر نہیں چل سکتا اور نہ ہی کسی کے جھوٹ اور کذب کے پھندوں میں وہ آسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے توریت اور انجیل کی تاریخی اور موجودہ حیثیت بھی دکھلا دی ہے کہ یہ دونوں کتابیں دراصل مرفوع ہوچکی ہیں صرف ان کے محرف ترجمے باقی رہ گئے ہیں۔ اور اہل کتاب کے لئے دین حق حاصل کرنے کا اب کوئی راستہ بجز قرآن کریم کے نہیں رہ گیا ہے۔
مولانائے موصوف کی دیگر مختصرات کی طرح یہ کتاب بھی ہم کو بہت پسند آئی۔ معقول۔ مدلل اور سادہ و سلیس ہے (اسج)

الکلام الفصیح فی تحقیق حیات المسیح | فرقہ مرزائیہ کا سب سے اہم مسئلہ جس پر جابجا وہ بحثیں کرتے ہیں حیات مسیح کا مسئلہ ہے اس کے اوپر متعدد کتابیں اور رسائل بھی فریقین کی طرف سے لکھے جاچکے ہیں۔ حال میں مولانا مفتی قاری سید محمد مکی قادری سنوسی نے مندرجہ بالا نام سے چھوٹی تقطیع پر چار جز کا ایک رسالہ لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس میں انھوں نے حیات مسیح کے دلائل لکھے ہیں۔ اور مرزا صاحب کے دعاوی کے خلاف بھی بہت سے براہین پیش کئے ہیں۔ انداز بیان متین۔ سادہ اور صاف ہے۔ رسالہ کی قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ۔ جناب حاجی حافظ وزیر محمد

صاحب جنرل مرچنٹ. چوک بازار دارجلنگ (۱ - ج)

ترکی جمہوریہ | از جناب ضمیر احمد ہاشمی صاحب ڈپٹی کلکٹر میرٹھ ضخامت ۲۰۸ صفحات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت و طباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی یا جامعہ پریس عقب جامع مسجد دہلی یا خود جناب مصنف سے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو آل عثمان کی سلطنت سے شروع سے شغف رہا ہے خصوصًا اس آخری زمانہ میں جب کہ خود ان کی سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور محکومیت کا ادبار ان پر مسلط ہو گیا ان کی عقیدت و توجہ کا مرکز اسی طرف منتقل ہو گیا۔ اسی کا اثر تھا کہ ترکوں کی ذرا سی پریشانی سے ہندوستانی مسلمانوں کے دل پر چوٹ لگتی تھی۔ کریمیا اور بلقان کی جنگوں سے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن جنگ عظیم کے بعد جب ترکی حکومت نے نیا چولا بدلا نئی طرز حکومت کی بنیاد ڈالی گئی تو کچھ مغربی حکومتوں کے پروپیگنڈے کے اثر سے اور کچھ حکومت اور اس کے بعض سرکردہ افراد کے رویہ کی وجہ سے مسلمانوں کی عقیدت روز بروز کم ہوتی گئی اور ترکی حکومت کے خلاف ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے خصوصًا جب کہ ترکی حکومت نے خلافت کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ادھر کئی سال سے ترکوں کی تاریخ سے متعلق اردو میں اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے لیکن یہ تمام تر عربی کی جدید تصانیف سے ماخوذ ہے اور محض سطحی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف کی ضرورت اب بھی باقی تھی جو ترکی تاریخ کے گہرے مطالعہ پر مبنی ہوتی اور جس میں ترکی قوم کی ترقی و تنزل اور دوبارہ احیا کے اسباب و وجوہ کا تجزیہ کیا جاتا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر گرمانوس صدر شعبہ مشرقی بوڈاپسٹ و سابق پروفیسر السنہ مشرقیہ شانتی نکیتن کے وہ مقالات نظر انداز نہیں کئے جا سکتے جو انھوں نے انگریزی زبان میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں پڑھے تھے اور جن کا ترجمہ رسالہ اردو میں باقساط شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر گرمانوس کو ترکی میں قیام کرنے وہاں کے مشہور ماہرین سیاست سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا ہے پھر ترکی زبان و ادب اور اس کی تاریخ ان کا خاص موضوع ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ کے ضمن میں انھوں نے ترکوں کی تاریخ ان کے تدریجی نشو و نما اور پھر ان کے انحطاط و تنزل پر بھی بحث کی ہے

زیر نظر کتاب کا مقصد ترکی جمہوریہ کی "نشاۃ الثانیہ کا تجزیہ" ہے لیکن مصنف نے اس سلسلہ میں ترکوں کے ابتدائی نشو و نما تدریجی ترقی اور پھر تنزل و انحطاط کے علل و اسباب کا بھی تجزیہ کیا ہے اور نہایت غور و تحقیق سے کام لیا ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر منقسم ہے اور ہر باب ایک مستقل بحث پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ترکی میں یورپ کے اثر

پر بحث کی گئی ہے پہلے یورپ کی شاطرانہ چالوں کو عریاں کیا گیا ہے پھر بتایا ہے کہ ترکی کے مرد بیمار نے کس طرح اس حکیم مغرب سے چھٹکارا حاصل کیا اور اس کی ساری امیدوں کو پامال و مجروح کر دیا پھر یہ کہ ترکی مصلحین اپنے طرز حکومت اور اپنے تہذیب و تمدن کو کس طرح مغربی طرز پر ڈھالنا چاہتے ہیں اور انھیں کہاں تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ترکی کے متعلق اہل مغرب کی معلومات کس قدر محدود تھیں اور وہ ترکوں کو کیا سمجھتے تھے اور قدیم ترک اور ترکی تمدن ان کی نظر میں کیا تھا دوسرے باب میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ ان کے اناطولیہ میں آباد ہونے۔ ان کے اسلام لانے ان کی فاتحانہ پیش قدمیوں ان کی اور اہل مغرب کی حریفانہ زندگی ان کے نظام حکومت اور اس کی خصوصیات عثمانی بادشاہوں کے عیسائی و دیگر غیر مسلم غلاموں کی تربیت اور نظام سلطنت میں ان کے مراتب و مدارج کا تذکرہ ہے۔ تیسرے باب میں یہ بتایا ہے کہ مغربی و مشرقی عیسائیوں کے باہمی تعلقات کیا تھے اور مشرقی عیسائی یورپ کے عیسائیوں سے کس درجہ متنفر تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ نفرت دور ہونے لگی اور ٹوٹے ہوئے رشتے مدتوں کے بعد پھر جڑنے لگے۔ پھر اس صورت حال کے اسباب بتائے گئے ہیں اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ ترکی ارکان سلطنت نے اس خطرہ کو بروقت محسوس کر کے کس طور پر اس کے انسداد کی کوشش کی غرض اس ملک پر مغربیت نے کس طرح آہستہ آہستہ اپنا اثر ڈالا اور کس طرح انقلاب کے جراثیم پیدا ہوئے۔ چوتھے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح غیر مسلم رعایا پر سے روز بروز حکومت کا اثر و اقتدار زائل ہو رہا تھا اور اس مصیبت کو دور کرنے کے لئے کیا کیا مراعات دی گئیں پھر سلاطین عثمان کی بدعنوانیوں خصوصاً سلطان عبدالحمید کے استبداد اور ترک قوم پرستوں کی ایک جماعت کے قیام کی تفصیل دی گئی ہے اور ان کی بے شمار قربانیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے پھر بتایا گیا ہے کہ ان نوجوانوں کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی نیز ان کے بعض غلط اقدامات کی وجہ سے ملک کو کس قدر نقصان پہنچا۔ پانچویں باب میں جنگ عظیم کے بعد کی مفصل تاریخ ہے اور ترکوں کے زوال کی انتہا سلاطین کی بے عنوانیوں پھر ترک قوم پرورں کی جانبازیوں ان کی مسلسل جدوجہد مغربی دول کی شاطرانہ چالوں یونان کی چیرہ دستیوں اور پھر آخر میں ترک قوم پرستوں کی شاندار کامیابیوں اور ان کی کوشش سے ایک نئی جمہوریت کی تاسیس اور ترکی قوم کی حیرت انگیز ترقی کا نہایت تفصیلی تذکرہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام مسلمانوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی اور ترکوں کے متعلق جو غلط خیالات عام طور پر ان کے دلوں میں قائم ہو گئے ہیں وہ بڑی حد تک دور ہو جائیں گے۔ آخر میں ہم ان غلطیوں کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں جو یا تو کاتب صاحب کی نوازش یا خود جناب مصنف کی بے توجہی کا نتیجہ ہیں مثلاً صفحہ ۱۲ سطر ایک پر "جان بڑی ہے" یہ فقرہ مہمل ہے جان کے بعد ضرور کچھ رہ گیا ہے پھر اسی صفحہ پر دوسری سطر میں "چارہ ساز کو کہہ بیٹھا ہے" لکھا گیا ہے یہاں بجائے "کو" کے "نے" چاہیئے۔ اسی قسم کی اور بہت سی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ اس وقت دشوار ہے امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں ان

فروگذاشتوں کو دور کر دیا جائے گا۔ (ع - ح)

مفتاح العربیہ | مصنف مولانا احسان سامی حقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ضخامت ۱۲۰ صفحات سائز ۲۰×۱۶ بتیس ۲
قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ سید محمد نسیم بذریعہ مولوی سید محمد نعیم صاحب ایڈوکیٹ بالائے قلعہ علی گڑھ۔ یوپی

مولانا احسان سامی حقی نے یہ کتاب بچوں کو عربی بول چال سکھانے کے لئے لکھی ہے۔ ہندوستان میں اس مقصد کے لئے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن جناب مصنف کے خیال میں نہ صرف یہ کہ یہ کتابیں مفید نہیں ہیں بلکہ مضرت رساں معلوم ہوتی ہیں اور انھوں نے اپنے اس دعوے کے اثبات میں معقول دلائل بھی پیش کئے ہیں تاہم ہمیں ان کے اس دعوئی میں تھوڑا سا مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم نے ان کی اس کتاب کو بغور دیکھا ہے۔ مگر ہمیں اس میں کوئی ایسی خاص بات نظر نہ آئی جو دوسری کتابوں سے امتیاز رکھتی ہو اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ جب کہ یہ پوری کتاب محض ایک ہفتہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ بچوں کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس کو دلچسپ اور آسان تر بنانے کے لئے خاص کوشش و اہتمام کی ضرورت ہے۔ اور غالباً ایک ہفتہ اس قسم کی کوشش کے لئے کافی نہیں۔ پھر بھی ہمیں امید ہے کہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں یہ کتاب بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

اس کی کتابت و طباعت یونیورسٹی پریس کی اور کتابوں کی طرح بہت اچھی ہے۔ اچھا ہوتا اگر کاغذ بھی ذرا اور دبیز لگایا جاتا۔ (ح - ح)

اصح السیر فی صدی خیر البشر | مصنف مولانا حکیم ابو البرکات عبد الرؤف صاحب قادری داناپوری تقطیع اوسط لکھائی چھپائی اور کاغذ اعلیٰ۔ ضخامت ۶۱۲ صفحات قیمت فی نسخہ غیر مجلد للعہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یہ کتاب بلحاظ روایت نہایت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ بنگال میں لکھی گئی ہے اس کی اردو صاف اور صحیح ہے۔ جملہ واقعات اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ حالات کے بہت سے مسائل پر ضمناً تحقیقی بحثیں بھی ہیں جو محققانہ انداز میں کی گئی ہیں۔ خود مؤلف نے جہاں اپنی رائیں لکھی ہیں ان میں بہت کچھ بحث کی گنجائش ہے لیکن انھوں نے ائمہ حدیث اور فقہا کے اقوال بھی سامنے رکھ دئے ہیں جن سے فیصلہ میں بہت کچھ آسانی ہو جاتی ہے۔

ہر چند کہ یہ کتاب حصہ اول ہے لیکن اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شروع سے آخر تک معہ ازواج مطہرات کے آگئے ہیں۔ اس لئے سیرت کے طالب کو اس حصہ کے بعد کسی مزید انتظار کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ سیرت میں جو کتابیں علمی انداز سے لکھی گئی ہیں ان میں یہ کتاب بہت قدر کے قابل ہے۔ (ا - ج)

یادگار سالانہ نمبر | ایڈیٹر نیر بی اے حجم ۲۰۰ صفحات قیمت عہ چندہ سالانہ ے مقام اشاعت لاہور
یہ رسالہ پہلے عالمگیر کے دفتر سے نکلتا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ جناب ایڈیٹر صاحب عالمگیر نے اسے چند لائق حضرات کے سپرد کر دیا ہے جو اس پر پوری توجہ صرف کر رہے ہیں اور رسالہ قابل اطمینان طریقے پر ترقی کر رہا ہے۔ زیر نظر نمبر ۱۹۳۳ء کا سالگرہ نمبر ہے اور دوسرے رسائل کے سالانہ نمبروں سے کسی طرح گھٹیا نہیں ہے بڑے سائز پر ۱۹۴ صفحات کی ضخامت ہے۔ ڈیڑھ درجن کے قریب اعلیٰ درجہ کی تصاویر ہیں تقریباً ۷۰ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون لکھنے والوں میں جناب علی عباس حسینی، جناب تبسم ایم اے، جناب ایم اسلم، جناب محمد حسین ادیب، جناب منصور احمد، جناب عظیم بیگ چغتائی، جناب کاشی پریاگی، اور شعراء میں حضرت جلیل، حضرت جگر، حضرت احسن، جناب حشر کاشمیری، حضرت وحشت، جناب بیخود موہانی، مولانا امجد، مولانا سہا، مولانا محوی اور جناب حفیظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں، رسالہ کی کتابت و طباعت بھی اچھی خاصی ہے، کاغذ متوسط درجہ کا ہے، ٹائٹل دیدہ زیب ہے اور اس پر مشہور مغربی شاعر بائرن کا فوٹو بلاک ہے (ح - ح)

سالنامہ حقیقت اسلام | ایڈیٹر سید محمد شاہ صاحب ضخامت ۱۳۶ صفحات کتابت و طباعت نہایت صاف اور پاکیزہ، کاغذ عمدہ۔ چندہ سالانہ ۶ر اس پرچہ کی قیمت ۱۲
پیکو آرٹ پریس ایک عرصہ سے قرآن اور علوم قرآن سے متعلق بہترین خدمات انجام دے رہا ہے ہندوستان میں یہ پہلا پریس ہے جو اس قدر اہتمام اور نفاست کے ساتھ اعلیٰ قسم کے مضبوط کاغذ پر عکسی بلاکوں کے ذریعے غیر معمولی احتیاط کے ساتھ کلام پاک چھپوا رہا ہے۔ تقریباً ایک سال سے اس مطبع سے ایک مذہبی رسالہ بھی نکل رہا ہے جس میں نہایت صاف و سلیس زبان اور دلچسپ انداز بیان میں مذہبی معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ زیر نظر نمبر اسی رسالہ کا سالانہ نمبر ہے اس میں نظم و نثر کے ۲۵ مضامین ہیں جو سب کے سب مفید مذہبی معلومات پر مشتمل ہیں۔ ان مضامین میں مطالب الفرقان (تفسیر مسلسل) اسلامی اخلاقیات کا امتیازی پہلو، اسلام کی خصوصیات، خیر الوریٰ، امیر المومنین عمر، ابو جعفر منصور (مسلسل) عربی زندگی، تجرید الترمذی (مسلسل) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مضمون نگاروں میں جناب مرزا عزیز، شمس الحسن رضوی، رفیق دلاوری، یوسف سلیم، محمد عبد اللہ قریشی، اور روشن صدیقی صاحبان نے اس نمبر کو کامیاب بنانے میں خاص حصہ لیا ہے۔ شروع میں عید کارڈ کے نمونہ پر چار رنگ کا ایک خوب صورت بلاک بھی ہے۔ علاوہ اس کے کلام پاک اور یازدہ سورہ کا ایک ایک صفحہ نمونہ کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ دونوں صفحات اپنی خوش نمائی اور دیدہ زیبی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ٹائٹل کا بلاک بھی بہت متین و سنجیدہ اور خوب صورت ہے۔ غرض یہ رسالہ خصوصاً یہ خاص نمبر ہر حیثیت سے اس قابل ہے کہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ساقی۔ سالانہ نمبر ۱۹۳۳ء | ایڈیٹر شاہد احمد صاحب بی اے سائز ۲۹×۲۲ حجم ۲۲۵ صفحات کتابت وطباعت اچھی۔ کاغذ متوسط۔ اس پرچہ کی قیمت عہ سالانہ ہے مقام اشاعت دہلی

اس رسالہ کو دلی سے جاری ہوئے تین سال گزر چکے ہیں تیسرے سال کے اختتام اور چوتھے کی آمد کی مسرت میں یہ خاص نمبر نکالا گیا ہے جو اپنی صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے نہایت کامیاب ہے۔ اس خاص نمبر کے علاوہ سال میں غالباً تین اور خاص نمبر ادارہ کی جانب سے نکالے جاتے ہیں اور ان میں دلی نمبر اور ظریف نمبر اپنے انوکھے پن کی وجہ سے اہم اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر سالانہ نمبر کی ضخامت جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں ۲۲۵ صفحات ہے اس سال کے سالانہ نمبروں میں کسی پرچہ کی ضخامت اس قدر نہیں ہے۔ پھر کتابت بہت باریک ہے۔ مضامین نظم و نثر کل چالیس ہیں۔ مضمون نگاروں میں خان بہادر میر ناصر علی۔ محمد حسین ادیب ایم اے عبدالمالک آروی۔ سید حسن برنی۔ سید وزیر حسن دہلوی نصیر الدین ہاشمی، سید مقبول حسین احمد پوری۔ حجاب اسمٰعیل۔ ایم اسلم۔ ڈاکٹر اعظم کریوی، سید بادشاہ حسن، مرزا عظیم بیگ چغتائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں مضامین میں شرح ہنگامہ ہستی، اردو شاعری پر کلاسیت اور رومانیت کی جنگ کے اثر۔ بہار کا ایک گمنام شاعر، دولت خانہ، تاج محل۔ جنجال دوست۔ محبت کی ٹھوکر۔ اللہ میاں کی قواعد۔ اکبر الہ آبادی اور مغربی تعلیم مقصود ستارہ بجنوری۔ سلاطین آصفیہ کی اردو شاعری، دولت کا پجاری، اندھی کھلونے والی خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ شعرا میں مہاراجہ کشن پرشاد، حضرت جوش اثر صہبائی۔ علی اختر اختر۔ حضرت فانی۔ حضرت رسا ہمدانی۔ حضرت نوح ناروی۔ رونق محفل ہیں تصویریں ۶ ہیں ان سے پہلی تصویر ہندوستانی مصوری کا اچھا نمونہ ہے۔ دوسری تصویر میں مصریوں کے ممی بنانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی تصویریں چینی آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں اور کارکنوں نے خاص ذرائع سے حاصل کی ہوں گی۔ غرض یہ نمبر ہر اعتبار سے علم و ادب کا بہت اچھا مرقع ہے اور شاہد صاحب نے بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ رسالہ جب سے جاری ہوا ہے برابر ترقی کی راہ میں گامزن ہے ہم شاہد صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ان تمام خوبیوں کے مقابلہ میں اس نمبر کی قیمت بہت کم ہے یعنی صرف عہ

(ر۔ح)

شذرات

غازی رؤف بے کا ورود جامعہ کی تاریخ میں ایک یادگار واقعے کی حیثیت رکھتا ہے. ہم امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہ کے بیحد شکر گذار ہیں کہ انھی کی بدولت غازی موصوف کی زیارت ہمیں نصیب ہوئی. اسی سلسلے میں یہ خبر بھی مسرت انگیز ہے کہ ترکی اور یورپ کے بعض اور جلیل القدر علمائے ڈاکٹر صاحب قبلہ سے جامعہ میں تشریف لانے اور اہل جامعہ کو اپنے خیالات سے فائدہ پہنچانے کا وعدہ فرمایا ہے

جن لوگوں کو ترکی کی گذشتہ پچیس سال کی تاریخ سے واقفیت ہے. ان کے لئے رؤف بے کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں. اس عرصے میں ترکی قوم پر جتنے دور گذرے ہیں ان میں سے ہر ایک میں موصوف نے نمایاں حیثیت سے حصہ لیا ہے آپ ۱۸۸۱ء میں استامبول میں پیدا ہوئے اور گیارہ سال کی عمر میں بحری فوجی اکادمی میں داخل ہوئے. اٹھارہ برس کے سن میں آپ کی عملی زندگی شروع ہوئی اس وقت سے لے کر ۱۹۲۵ء تک آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ان کی تفصیل کے لئے تو ایک مستقل کتاب درکار ہوگی. اجمالاً یہاں کچھ عرض کیا جاتا ہے.

موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں آبدوز کشتیوں کا استعمال خفیہ طور پر شروع ہوا. ترکی حکومت کی طرف سے رؤف بے انگلستان بھیجے گئے کہ وہاں کچھ معلومات حاصل کریں لیکن وہاں انھیں ناکامی ہوئی. امریکہ اس زمانے میں ترکی پر مہربان تھا اس لئے وہاں موصوف کا خیر مقدم کیا گیا. اور ہر طرح کی معلومات بھی انھیں حاصل ہوئیں. اس طرح ترکی بیڑے میں آبدوز کشتیوں کا رواج رؤف بے کے ذریعے سے ہوا. ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے سلسلے میں جب بحری فوج کی از سر نو تشکیل ہوئی تو اس میں بھی رؤف بے کا نمایاں حصہ تھا اور اس کے بعد ہی آپ جنگی جہاز 'حمیدیہ' کے کپتان

مقرر کئے گئے۔ اس جہاز نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جس طرح غنیم کے بیڑے کو پریشان کیا وہ ایک ایسی عجیب و غریب داستان ہے کہ اگر ہمیں اس کے واقعہ ہونے کا علم نہ ہوتا تو کبھی باور نہ کرتے۔

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ عظیم کے سلسلے میں نہ صرف بحری فوج میں بلکہ بری فوج میں بھی اپنے کمالات دکھاتے رہے۔ پھر جب عزت پاشا وزیر اعظم ہوئے تو رؤف بے 'وزیر البحر' بنائے گئے اور اسی حیثیت سے آپ ہی کی سرکردگی میں وہ وفد گیا تھا جس نے ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۱۸ء کو اتحادیوں سے انقطاع جنگ کا معاہدہ کیا۔ صلح کے بعد سلطان کے غیر دستوری طرز حکومت کی وجہ سے عزت پاشا کو استعفا دینا پڑا اور جب توفیق پاشا نے ترکی پارلیمنٹ کو منسوخ کر دیا تو رؤف بے عثمانی حکومت سے اس قدر بیزار ہوئے کہ انھوں نے ملازمت سے بھی استعفا دے دیا۔

جب یونانی فوجیں سمرنا میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اپنی شرمناک سفاکیاں شروع کیں تو رؤف بے بھی اناطولیہ پہنچے اور مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ آپ نے بھی یونانیوں کا مقابلہ کیا آپ کے سپرد فوج کے لئے اسلحہ اور سامان خورو نوش کی فراہمی کا مشکل کام تھا۔ ترکوں نے اس جنگ میں جس بہادری وطن پروری اور ایثار کا ثبوت دیا اس کی مثال تاریخ میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ سلطان وحید الدین نے جب قوم فروش وزرا کے مشورے سے اتحادیوں کو قسطنطنیہ میں داخل ہونے دیا اور قوم پرستوں کے مقابلے میں فوج بھیجی اس وقت رؤف بے ہی اپنی جان خطرے میں ڈال کر سلطان کے پاس گئے تھے اور انھیں اس شرمناک طرز عمل سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ پھر جب ترکی قوم کی جاں نثاری پھل لائی اور اتحادیوں کو اس قوم کے زندہ ہونے کا یقین ہوا تو لوزان کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جو ترکی وفد گیا تھا اس کے سردار بھی رؤف بے ہی منتخب ہوئے اور یہ انھیں کی سیاسی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ معاہدہ سیورے منسوخ ہوا اور ترکوں کو وہ حقوق پھر حاصل ہوئے جن کے بغیر کوئی قوم آزاد نہیں کہی جا سکتی۔

حکومت آل عثمان کی تنسیخ اور ملّی حکومت کے قیام میں بھی رؤف بے کا حصہ بہت نمایاں تھا
آپ کی جو وقعت قوم پرست جماعت کے دلوں میں تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پہلی مجلس
ملّی کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب ہوا۔ اب جب صحیح معنوں میں تعمیری کام کا وقت آیا اور
جب اس کا موقع تھا کہ رؤف بے کی عملی صلاحیتوں سے ترکی قوم کو فائدہ پہنچتا تو کچھ اسباب ایسے پیدا
ہو گئے کہ مصطفیٰ کمال پاشا اور رؤف بے ایک ساتھ مل کر کام نہ کر سکے۔ یہ اختلاف ذاتیات سے متعلق
نہ تھا بلکہ سراسر طرز حکومت اور سیاسی و تعلیمی نظام سے متعلق تھا۔ رؤف بے کی عظمت اور عالی حوصلگی کی
سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اس اختلاف کو ذاتی اختلاف نہیں بنایا اور بجائے اس کے کہ ملک
میں رہ کر ایک مخالف جماعت قائم کرتے اور اس طرح فساد کا دروازہ کھولتے انھوں نے پسند کیا کہ خود گوشۂ
گمنامی میں چلے جائیں اور مصطفیٰ کمال پاشا کی جماعت کو جسے اکثریت حاصل تھی، ملک کا انتظام و انصرام
کرنے دیں۔ اب بھی جب کبھی مصطفیٰ کمال پاشا کا ذکر آتا ہے تو رؤف بے اس فراخدلی اور جوش و
خروش کے ساتھ ان کی خوبیاں بیان فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ان دونوں کے اختلافات کا علم ہے
انھیں حیرت ہوتی ہے۔ کاش اس بے نفسی اور احساس توازن کی مثالیں سیاسی رہنماؤں میں کثرت
سے ملتیں کہ انہی دو صفتوں کے فقدان نے ہر ملک کی سیاسی فضا کو مکدر کر دیا ہے۔

غازی رؤف بے کو ہندوستان آنے اور ہندوستانی مسلمانوں سے ملنے کا عرصے سے شوق تھا
خصوصاً جنگ بلقان کے زمانے میں جب وفد ہلال احمر نے جو ڈاکٹر انصاری صاحب کی سرگردگی میں
گیا تھا۔ ترکی افواج کی خدمت کی تو آپ کا یہ شوق اور بڑھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب اور رؤف بے
کے درمیان جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے انھی کا یہ نتیجہ ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب نے اپنے سفر
یورپ کے دوران میں آپ سے جامعہ میں تشریف لائے اور ترکی کے موجودہ حالات پر چند مسلسل تقریریں کرنے کی
درخواست کی تو آپ نے بلا تکلف اسے منظور کر لیا اور اس طویل سفر کی زحمت برداشت کی

دہلی میں رؤف بے کا خیر مقدم جس شان سے ہوا اور آپ کی تقریروں کے سننے کے لئے مشتاقین کا جیسا ہجوم برابر رہا اس سے وہ دن یاد آتے تھے جب ہندوستان کے مسلمان ترکوں کو ملت اسلامی کا امین اور حامی سمجھتے تھے اور ان کی ہر کامیابی پر خوش اور ناکامی پر رنجیدہ ہوتے تھے۔

جامعہ میں غازی رؤف بے کی چار تقریریں ہوئیں ان کے موضوع بالترتیب یہ تھے :۔ (۱) آل عثمان کی تاریخ کا خاکہ اور جدید دور کی ابتدا۔ (۲) اتحاد اسلامی، اتحاد تورانی، اور قوم پرستی کی کشمکش (۳) ترکی اور جنگ عظیم (۴) ترکی کے موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات۔ یہ تقریریں بہت جلد انگریزی اور اردو میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی ہیں۔ اس لئے ہم ان کا خلاصہ اس وقت پیش نہیں کر رہے ہیں۔ جن لوگوں نے خود مقرر کی زبان سے ان تقریروں کو سنا ہے وہ اسکی شہادت دیں گے کہ مقرر کی شخصیت اور طرز ادا کی دلفریبی کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی برابر قائم رہی اور باوجود اس کے کہ ہر تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی تھی کسی کو بھی طول کلامی کی شکایات نہ ہوئی۔ بیشتر واقعات تو غازی موصوف نے وہی بیان کئے جن سے اخبار بیں حضرات کم و بیش واقف تھے لیکن بیان کرنیکا طریقہ ایسا تھا کہ گویا وہ واقعات ہمارے سامنے پیش آرہے تھے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب ان میں سے بیشتر واقعات خود مقرر کے چشم دید تھے اور بعض میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی وجہ سے آپنے بعض واقعات ایسے بھی بیان کئے جو اب تک ظاہر نہیں ہوئے تھے اور سیاسی راز کی حیثیت رکھتے تھے۔ خصوصاً جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت کے وجوہ کے سلسلے میں آپنے بہت سی پوشیدہ باتیں بتائیں جن سے یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا کہ ترکی کو بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جرمنی کا ساتھ دے۔ اس حیثیت سے یہ تقریریں 'جدید ترکی' کے مورخ کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گی۔

اس علمی حیثیت کے علاوہ خود غازی رؤف بے کی شخصیت، ان کی خندہ پیشانی، ان کے اخلاق کریمانہ اور ان کی رواداری سے جو سبق اہل جامعہ کو خصوصاً اور اہل دہلی کو عموماً حاصل ہوا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ بھلایا جاسکا

نقش دلوں سے جلد محو ہو سکے ایسی ہستیاں دنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں جن کی ملاقات سے انسان کے دل پر مسرت اور جوش کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ایسی لہر جس میں مایوسی اور ناکامی کے تمام خطرات خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔

نہایت افسوس ہے کہ جامع برلن کے تاریخ اسلام کے استاد پروفیسر ڈاکٹر کارل بیکر کا انتقال ہو گیا۔ موصوف تاریخ اسلام اور خصوصًا مصر کی اسلامی تاریخ کے ماہر تھے۔ تمدن اسلامی کے مسائل سے آپ کو خاص دلچسپی تھی اور اسلامی ممالک کی جدید ذہنی کشمکش کا مطالعہ بھی بہت شوق سے کرتے رہتے تھے اسی سلسلے میں آپ پچھلے سال جاوا گئے تھے اور ہندوستان آنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے اپنے ایک ہندوستانی شاگرد سے آپ نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔ چنانچہ بعض لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان سے ہندوستان تشریف لانے اور مختلف علمی اداروں میں اسلامی تمدن پر تقریر کرنے کی درخواست کی جائے۔ مگر کسے معلوم تھا کہ موت ان کی تاک میں ہے اور ان کا یہ شوق اور ان کے احباب کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی مرحوم کی شہرت صرف اسلامی تاریخ کے استاد کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ آپ تقریبًا دس سال تک جرمنی کے سب سے بڑے صوبے یعنی پروسیہ (Prussia) کے وزیر تعلیمات بھی رہ چکے تھے۔ آپ کی علم دوستی اور اپنے مضمون سے شغف کی یہ ایک بیّن دلیل ہے کہ وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد آپ نے جامع برلن کی استادی قبول کر لی اور خاموشی کے ساتھ درس دینے لگے آپ کی ذات سے جرمنی میں اسلامیات کے طالب علموں اور نوجوان اساتذہ کو بڑی تقویت تھی۔ آپ کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ "اسلام" بھی شائع ہوتا تھا۔ جو امید ہے کہ جاری رہیگا۔ آپ کے علمی مضامین کے مجموعے کی ایک جلد تو بہت عرصہ ہوا Islamstudien کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری جلد بھی پچھلے سال تیار ہو گئی تھی۔ امید ہے کہ وہ عنقریب شائع ہوگی اور مرحوم کے انتقال سے اس میں تعویق نہ ہوگی۔

ترکی جمہوریہ

از

مسٹر ضمیر احمد ہاشمی، ایم۔ اے، پی سی ایس

ترکی جمہوریہ سولہ بابوں پر مشتمل ہے۔ جس میں سلیس اور عام فہم زبان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا۔ اور مغربی طرز اختیار کرنے کے لئے ترکی کو کس قدر مراحل طے کرنے پڑے۔ ترکی کا اولین زمانہ۔ اس کا عروج بعد ازاں تدریج زوال اور اس کے اسباب، بالآخر جنگ عظیم میں شرکت اور بعد کی حالت اتحاد اسلامی، خلافت اور سلطلنت کا نسخ اور جمہوریت کا قائم ہونا۔ ترکی کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی و معاشرتی حالت اور ان شعبوں میں نمایاں ترقی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور قیمتی سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ کل صفحات ۳۰۲، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

تفسیریں

خلافتِ کبریٰ — قیمت مجلد للعہ

سورہ بقر کی مکمل اور مبسوط تفسیر، موجودہ زمانے کی مسموم فضا کو دیکھتے ہوئے یہ تفسیر لکھی گئی ہے۔

بیان — قیمت عہ

سورہ آل عمران کی محقق تفسیر ہے، یہ پورا سلسلہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی ضروریات اور شبہات کو پیشِ نظر رکھکر لکھا گیا ہے۔

صراطِ مستقیم — قیمت عہ/

سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر، جس میں فلسفۂ جنگ و جہاد کی ضرورت فتح و کامرانی کے قوانین و ضوابط پر محققانہ بحث کی گئی ہے

عبرت — قیمت عہ

احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر، نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کا مرقع۔

برہان — قیمت عہ/

اس حصہ میں سورۂ نور کی تفسیر ہے، اُمتِ اسلامیہ کے سامنے ایک لائحۂ عمل پیش کر کے دعوت دی گئی ہے۔

سبیل الرشاد — قیمت ۱۰/

سورۂ حجرات کی تفسیر ہے، اس میں علمی مسائل کی فلسفیانہ تشریح عقل کی روشنی میں نہایت ہی وضاحت سے کی گئی ہے۔

ذکریٰ — قیمت عہ/

تیسویں پارہ یعنی پارہ عم کی تفسیر ہے، جس میں ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کی صاف اور واضح تفسیر کی گئی ہے جنہیں ہم پنجوقتہ نماز میں پڑھتے ہیں۔

بصائر — قیمت ۲/

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعات قرآن پاک سے کر لکھے گئے ہیں

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ — قیمت ۔ عہ
امریکن مورخ ۔ ڈاکٹر رابن من کی کتاب ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کو دکھایا گیا ہے ۔

تاریخ ہند قدیم — قیمت ۔ ۸ر
کے ایم پانکر کی کتاب کا ترجمہ جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا ۔

تاریخ الدولتین — قیمت عہ
خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ ۔

تاریخ امریکہ — قیمت ۔ عہ
امریکہ کی مکمل و مفصل تاریخ ، انقلابات و سیاسیات امریکہ کا بیان ۔

ترکی جمہوریہ — قیمت ۔ عہ ر
ترکوں کی مفصل سیاسی تاریخ ۔

تاریخ نجد — قیمت ۔ عہ ر
نجدیوں کے مذہبی عقائد ، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے ۔

تاریخ القران — قیمت ۔ عہ ر
قران حکیم کی جمع و ترتیب ، حفاظت ، فصاحت و بلاغت اور نزول کی مکمل تاریخ ہے ۔

تاریخ الامت — مکمل عہ
اسلام کی مکمل و مستند تاریخ ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسول	عہ ر
”	دوم خلافت راشدہ	عہ ر
”	سوم خلافت بنی امیہ ۔	عہ ر
”	چہارم خلافت عباسیہ	عہ ر
”	پنجم عباسیہ بغداد	عہ ر
”	ششم عباسیہ مصر	عہ ر
”	ہفتم خلافت عثمانیہ	عہ ر

سوانح عمریاں

سیرت محمد علی — قیمت ۔ ے ر
مولینا محمد علی کی مکمل سوانح عمری جس میں مولینا کی زندگی کے تمام واقعات تحقیق سے لکھے گئے ہیں ۔

مکتبہ جامعہ دہلی

ضخامت تقریباً ۶۰۰ صفحات متعدد تصاویر

تلاش حق قیمت عا — گاندھی جی کی خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربے ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر۔

ٹالسٹائی قیمت ۳ر — روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح، انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات

جمال الدین قیمت ۸ر — اخوت اسلامی کا پرجوش داعی، عالم گیر اتحاد اسلامی کا زبردست حامی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کیے۔

اورنگ زیب قیمت ۸ر — اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا۔

حیات حافظ قیمت عہ — لسان الغیب حضرت خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ آخر میں چند مشہور فالیں بھی دی گئی ہیں۔

حیات جامی قیمت ۸ر — فارسی کے مشہور شاعر مولانا نور الدین جامی کے حالات، اور ان کے تصوف پر بحث۔

سیرت عمرو بن العاص قیمت عہ — مشہور مدبر صحابی اور نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات۔

ضیاء الدین برنی قیمت ۶ر — عہد تغلق کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی، مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔

خادمات خلق قیمت ۱۰ر — یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنہوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کر دی تھی۔

ادب

سیر المصنفین قیمت عہ — اردو کے تمام مصنفین اور نثر نگاروں کے حالات، ادب اردو کی دل پسند تاریخ

حصہ اول عاہر - حصہ دوم ۸ر

کیمیا گر
قیمت عہ

چند مختصر افسانوں کا مجموعہ، پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئے گا۔

نیرنگ
قیمت عہ

۱۲، ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے، ان مضامین میں ضمیر کی آواز جستجوئے مسرت قابل ذکر ہیں۔

مضامین رسالہ جوہر
قیمت عہ

جامعہ ملیہ کے قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔

لیلۃ القدر
قیمت ۱ر

مولینا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے۔

دیوان غالب (جرمنی)
عیہ، عا

اس میں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں بیاض کے لئے نفیس حاشیہ ارسادہ اوراق شامل ہیں۔ خوبصورت جلد ہے۔ پہلے اس کی قیمت للعہ ہے، تھی اب عیہ، عا ہے

مرقع غالب (جرمنی)
قیمت ۸ر

آپ کے کمرہ کی زینت کے لئے، ایک عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر جرمن ہنرمندی کا خاص نمونہ ہے، دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں۔

دیوان شیدا (جرمنی)
قیمت عیہ، عا

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مسیح الملک کی شاعری اپنے احباب کی مجلس تک محدود تھی۔ مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور پر جرمنی میں طبع کرایا۔

کلام جوہر
قیمت ۸ر

مولینا محمد علی جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا یہ مجموعہ ہے۔ شروع میں مولینا عبدالماجد دریابادی کا مقدمہ بھی ہے

انتخاب میر
قیمت ۱۲ر

سعدی ہند میر تقی میر علیہ الرحمتہ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے۔ اس میں تمام اشعار جمع کردئے گئے ہیں۔

انتخاب سودا — قیمت ۱۲/

مرزا رفیع سودا میرؔ جی کے ہمعصروں میں ہیں، یہ مجموعہ ان کے اچھے کلام سے تیار کیا گیا ہے، شروع میں نواب جعفر علی خاں اثرؔ کا مقدمہ بھی ہے۔

انتخاب حسرت — قیمت ۱۲/

یہ انتخاب حسرتؔ کے تمام دواوین سے چنکر مرتب کیا گیا ہے۔ حسرتؔ کی شاعری کسی تعریف کی محتاج نہیں، آپ خود پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جواہر ملیہ — قیمت ۳/

دس تاریخی، ملی نظموں کا مجموعہ بہت ہی نتیجہ خیز اور ولولہ انگیز ہے، یہ نظمیں درس میں داخل ہیں۔

نالۂ مشیر — قیمت عہ/

مشہور صاحب قلم اور سیاست شیخ مشیر حسین قدوائی کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ۔

کلام مشیر — قیمت عہ/

یہ شیخ صاحب کے کلام کا دوسرا حصہ ہے۔ لوازم حسن، لوازم عشق، کائنات سے سرگوشیاں اور نسیم حبیب چند اچھی نظمیں ہیں۔

چند اچھے ڈرامے

پردۂ غفلت ... عہ/	گناہ کی دیوار ... ۸/
کھیتی ... ۶/	ہمزاد ... ۶/
فاؤسٹ ... ہے ۸/	مرزا جنگی ... ۱۲/
صیدِ زبوں ... ۱۰/	سلمیٰ ... ۵/
انارکلی ... عا ۸/	فریب عمل ... عا ۸/
اندر سبھا ... ۸/	جنگ فرنگ ... ۸/
مینا ... ۸/	قزاق ... ۸/

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۹۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی وادبی رسالہ
جلد ۲۰
بابت ماہ اپریل ۱۹۳۳ع
نمبر ٤
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۰ | ماہ اپریل ۱۹۳۳ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

(محمد مجیب صاحب بی اے آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ دہلی سے شائع کیا)

میں نہیں ہوا بلکہ خدا کے تصور کی اطمینان بخش توضیح میں بتدریج توسیع ہوتی آئی ہے۔ اور اس کی ترقی پذیر، لطیف تر اور معنی خیز صورتیں تدریجاً نمایاں ہوتی گئی ہیں۔ نیز یہ کہ وحدانیت عالم مذاہب کی سب سے ترقی یافتہ اور سب سے آخری صورت ہے، جو مذہب کا معراج کمال ہے۔

مومن کا طنزیہ کلام

عام طور پر "طنزیات" کے ذیل میں تمام ظریفانہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں اور کل ظریف انشا پردازوں کا شمار "طنزئین" کی صف میں کیا جاتا ہے۔ خود ٹھیک ہے ظرافت اور طنز میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا اگر میری ناقص رائے میں ان دونوں میں نہایت نازک فرق ہے۔ طنز زیادہ سے زیادہ ظرافت کی ایک شاخ قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کا مقصد کبھی محض تفریح و انبساط ہوتا ہے اور کبھی اس سے بلند تر مقصد یعنی ظرافت کے پردے میں اصلاح و تربیت۔ عام ہنسنے ہنسانے والی تحریروں میں جس مقام سے کسی پر چوٹ شروع ہو، کوئی چبھتا ہوا، مزیدار یا اچھوتا فقرہ کسا جائے، خواہ پھولوں کی چھڑی سے ذرا "خبر" لی جائے یا دل کھول کر "مرمت" ہو وہیں سے طنز کا آغاز ہوتا ہے بعض لوگ اس کی ایک اور تعریف کرتے ہیں یعنی طنز ایک طرز انشا، ایک خاص انداز بیان کا نام ہے جس میں "دور کی کوڑی" لائی جائے۔ لکھنے والے کو جو کہنا ہے اسے اس طرح کہتا ہے گویا مقصود اس کا بالعکس ہے لیکن طنز کو صرف ان نظروں میں دیکھنا اس کی وسعت کو محدود کرنا ہے۔ طنز کے لئے ندرت کا ہونا بھی لازمی ہے ندرت بیان اور ندرت معنی دونوں ورنہ بصورت دیگر وہ ایک سطحی، پست، اور رکیک چیز ہو کر رہ جائے گی اور اعلیٰ درجہ کے لٹریچر میں جگہ پانے کی مستحق نہ رہے گی۔

یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں بالخصوص انگریزی زبان میں طنز ایک نہایت وسیع اور خاص صنف ادب شمار کی جاتی ہے جس کی خود اپنی علیحدہ صنفیں ہیں اور ان کے ہاں طنزیہ لٹریچر بہ افراط موجود ہے انگریزی کے سب سے پہلے شاعر چاسر سے لیکر بائرن اور آخر آخر میں ہمارے اپنے زمانے میں برنارڈ شا اور چسٹرٹن تک کم و بیش ہر زمانے میں چوٹی کے طنز گو شعرا و نثر نگار موجود رہے ہیں۔ ان کے ہاں طنز سے بڑے بڑے اصلاحی کام لئے گئے ہیں۔ یہ موضوع بجائے خود ایک دوسرے مضمون کا محتاج ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ اردو زبان میں بھی طنز موجود ہے لیکن

یہ صرف چند خاص امور تک محدود ہے اور اس سے بہت ہی شاذ اصلاح و ہدایت کا کام لیا ہے۔ اور ایسے شعرا یا انشا پرداز تو بہت کم ہیں جنھوں نے اس صنف تحریر کی ترقی و تہذیب ہی کو اپنی ادبی زندگی کا مقصد قرار دے لیا ہو۔

اس سے مطلب نہیں کہ ہمارے ہاں ظریف انشا پردازوں یا شاعروں کی کمی ہے۔ نہیں ابتدائی زمانے ہی سے ہمیں ہجوگو شعرا اور مزاحیہ نگاروں سے سابقہ رہا ہے لیکن سچی اور پاکیزہ طنز ان کے ہاں برائے نام ہے یہ مضمون ایک شاعر کی نسبت ہے اس لئے بالفعل صرف شاعری ہی میں طنز کو تلاش کرنا ہے۔ اردو کی شاعری میں ہمیں کافی ظریف شاعروں کے نام ملتے ہیں جعفر کی "زٹلیات" سے قطع نظر کی جائے تو میر ضاحک، بقا، فدوی، مکین، کے ناموں کے علاوہ سودا، انشا، مصحفی، غالب، مومن، اور آخر آخر میں حضرت داغ جن کا یہ مثل شعر ؎

دیکھنا پیر مغاں حضرت زاہد تو نہیں　　　کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھ کو!

ہر خوش مذاق اور زندہ دل سخن سنج کے زبان پر ہے اور ان کی چلبلی، شوخ اور چٹ پٹی طنز کی دلکش مثال ہے)، ریاض خیر آبادی اور قبلہ میر اکبر حسین اکبر مرحوم کے اسمائے گرامی پیش پیش ہیں موخر الذکر بزرگ اس فہرست میں سب سے آخر لیکن خالص ظریفانہ حیثیت سے سب پر فائق ہیں موجودہ دور کے ایک اور ظریف شاعر حضرت ظریف کا نام بھی امتیازی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان سب شعرا میں سے حضرت اکبر کو چھوڑ کر جنھوں نے طنزیات کا وہ وسیع مفہوم سمجھا جو سمجھنا چاہیئے اور جو اسے دوسری زبانوں میں حاصل ہے اور طنز کو زندگی، مذہب، سیاست، معاشرت، تہذیب، تمدن غرض حیات و ممات کے مختلف اور لاتعداد پہلوؤں پر ناقابل تقلید اور قابل رشک طریقے سے حاوی کر دیا اور حضرت ظریف سے قطع نظر کرکے جن کی شاعری کی خصوصیت علیحدہ ہے دیگر شعرا نے کبھی کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے اور صرف ایک خاص حد تک طنز سے کام لیا۔ ان سب شعرا کا میدان کارزار کم و بیش غزل ہے جس میں تلاش سے طنزیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں زیادہ کیا تمامتر شیخ، عصر، واعظ، محتسب، یا ناصح پر چوٹیں ہوتی ہیں۔ منہ میں آکر یہ حضرات ان بچارے

غریبوں کو رسوا اور ذلیل کرنے کے ساتھ خود بھی تہذیب اور حسن ذوق کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر ناک پر انگلی رکھ کر مٹکنے لگتے ہیں ہمیں ان کے اس طرز سے کوئی شکایت نہ ہونا چاہیے۔ اور انھیں کے زمانے کے مذاق سے انھیں جانچنا چاہیے یہ ابتدائی اور غیر تربیت یافتہ دور قوموں کی تاریخ کی طرح ادب اور شاعری کی تاریخ میں پایا جانا بھی بالکل مطابق فطرت ہے .... ان مختصر حدود کے اندر بھی سودا سے قطع نظر جنھوں نے اس چیز کو امتیاز بخشا اور جن کی طنز میں زہر ہلاہل بھرا ہے مومن کو ہمارے نزدیک "طنزیات" میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے سودا کو بعض اور وجوہ سے بھی علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ اول تو وہ طنز کو غزل میں بہت کم جگہ دیتے ہیں یا وہ اسے ایک مستقل حیثیت دے کر نظم کی صورت میں پیش کرتے ہیں دوسرے ان کے موضوعوں کا دائرہ اس محدود دائرہ سے زیادہ وسیع ہے اور وہ اس فرض کو محض رسماً اور تبرکاً جیسا کہ اور شعرا کا دستور ہے نہیں ادا کرتے بلکہ یہ چیز ان کا حصہ ہو گئی ہے اس حیثیت سے وہ بہت بلند درجہ پر ہیں اور مومن ان کی گرد کو نہیں پہنچتے۔ ساتھ ہی سودا اعتدال سے بھی گذر جاتے ہیں اور ایسے پنجے جھاڑ کے لوگوں کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ان سے دامن چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے ان کی طنز کے مار شاہی شیہ بچے کے مار سے کم نہیں، ان کی طنز کی زد سے لوگ اس طرح خائف رہتے ہیں جیسے شہباز کے پنجے سے کمزور پرند۔ برخلاف مومن کے کہ طنز ان کا پیشہ نہیں ہے اور ان کے ہاں ایسی بے اعتدالی نہیں پائی جاتی۔ وہ بہت احتیاط سے اور بچ بچ کر اپنے حریفوں پر وار کرتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر سودا اور مومن کا کوئی مقابلہ نہیں۔ حضرت ریاض خیر آبادی کی "طنزیات" بھی خاصا لطف رکھتی ہیں۔ اور حقیقت میں موجودہ شعرا کیا شعرائے سابق میں بھی ان کے مخصوص اوصاف و انداز میں ان کا کوئی مقابل نہیں لیکن ان کے ہاں بھی شوخی و بے باکی و ہوسناکی کبھی کبھی ہمیں آنکھ اور کان بند کر لینے پر مجبور کرتی ہے۔

مومن کے شاعرانہ کمال کی داد میں عام طور پر بخل سے کام لیا گیا ہے۔ اصل میں بہت کم لوگوں نے اس کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور جنھوں نے پڑھا بھی انھوں نے صرف اس کے تغزل

سے کام رکھا۔ حالانکہ مومن کے کلام کی خصوصیات مختلف ہیں اور کئی پہلوؤں سے اس کی شاعری پر تنقید ہو سکتی ہے یہ بے توجہی غالباً ضرورت سے زیادہ غالب پرستی کا نتیجہ ہے جس کی روز افزوں اور لازوال شہرت نے، گو وہ کتنی ہی حق بجانب اور بجا کیوں نہ ہو اس دور کے دوسرے شعرا کے کارناموں کی عظمت کو گھٹا دیا ہے۔ مومن کی عدم شہرت کا راز اس کی کم مائگی نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے حالی یا ڈاکٹر بجنوری جیسا نقاد نہیں نصیب ہوا۔ غالب کے ایک بہت بڑے شاعر ہونے میں شک نہیں آج مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کا اس کے کمال کا اعتراف نہ کرنا میری اپنی کم نظری اور بدتوفیقی کی دلیل ہوگا۔ سب سے پہلے مجھے اس امر کا اظہار کرنا ہے کہ مجھ سے زیادہ خوش عقیدگی اس کے ساتھ کم لوگوں کو ہوگی۔ اس کے ادراک، الہام، بلند نظری اور اعلیٰ تخیل میں کسے شک ہو سکتا ہے لیکن اس کی عظمت کا اعتراف و احساس دوسرے شعرا کی طرف سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ حقیقتاً اردو شاعری کا یہ دور بھی عجیب و غریب دور گذرا ہے جس میں غالب، مومن، ذوق، اور شیفتہ جیسے سخنورانِ باکمال نے دادِ سخن دی۔ ان میں سے ہر شاعر اپنے اپنے کمال میں لاثانی ہے اور ہر ایک سے واقف اور لطف اندوز ہونے کے لئے برسوں کی ریاضت درکار ہے مومن بھی ان زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے جس کی شاعری کے چند در چند خصوصیات میں سے ایک خصوصیت اس کی "طنزیات" بھی ہیں۔

حسب معمول مومن کی طنزیات بھی غزل میں ملتی ہیں اور ان کے بھی وہی محدود موضوع ہیں جن پر اور شعرائے طبع آزمائی کی ہے مثلاً ناصح پر چوٹ، واعظ پر بوچھار، رقیب کی ملامت و بدخواہی، محتسب سے چھیڑ چھاڑ لیکن انھوں نے یہ کام ایسے اہتمام سے کیا ہے اور ان کی طنز میں ایسا مزہ ہے اور ایسے ایسے نادر طریقوں اور امتیازی انداز بیان سے انھوں نے ان سب حضرات کی خبر لی ہے کہ معلوم ہوتا ہے انھیں اس کا خاص شوق تھا اور اس میں انھیں بڑا مزہ آتا تھا بالخصوص ناصح اور واعظ سے تو ان سے ایک منٹ کو نہیں بنتی وہ ان کی وجود کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی بھی کیا بدظنی، یا وہ بیچارے تو ان کی ہمدردی اور دل سوزی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور یہ اس کے

برعکس ان کے نام سے بیزار ہو جائیں۔ مگر ہمیں اس سے کیا۔ مومن کے خیر خواہوں یا بدخواہوں کو خود مومن سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ مانا کہ ان کی رفاقت بے لوث ہے مگر یہ عشق وہ بُری بلا ہے کہ عاشق کو خود معشوق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

اک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جسکو تسکین دعا سے ہو نہ تخفیف دوا سے!

ہمیں تو ان کے ناصح مشفق ہمیشہ منہ کی کھاتے نظر آئے۔ مومن کے مزاج میں بڑی مستقل مزاجی ہے۔ وہ انکو منہ نہ لگانے کے بجائے ان کی معصومیت سے لطف اٹھاتے ہیں گھوم گھام کر وہ حضرت ناصح یا واعظ کی خدمت میں پہنچ جاتے ہیں انھیں ایک طنزیہ تمسخر آمیز سلام کرتے ہیں اور ان کی صحبت سے لطف اندوز اور تازہ دم ہو کے آگے بڑھتے ہیں۔ دس پانچ منٹ حسن وعشق یا ادھر ادھر کی باتیں کیں اور حضرت ناصح سے ایک خاص پر لطف طرز سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن وعشق کا ذکر بھی خیر سے انھیں حضرات کو جلانے اور تڑپانے کے لئے کرتے ہیں۔ ناصح کا نام آیا اور ان کے چہرے پر شگفتگی دوڑ گئی ...... ثبوت لیجئے! کم وبیش ہر غزل میں دو چار رچے عشقیہ اشعار کے بعد وہ ان حریفوں پر وار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی عام خصوصیت یعنی انداز بیان کا انوکھا پن جو ان کی شاعری کی جان ہے یہاں بھی ہر قدم پر موجود ہے اور اس وصف نے ان کی طنزیات کو اور زیادہ دلکش، بامعنی اور پر لطف بنا دیا ہے۔ تعجب ہو کہ مومن کے کلام کی اس خصوصیت پر کسی کی نظر نہ گئی۔ حالانکہ اس کے ہاں یہ طنزیات دبی ہوئی، چھپی ہوئی رہنے کے بجائے اجاگر اور ابھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں اپنے بیان اور معنی دونوں کی [illegible]درت کی وجہ سے وہ پہلی نگاہ میں نظر آجاتی ہیں۔

اب میں ان طنزیہ اشعار کا ایک مختصر انتخاب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت میں پیش کرتا ہوں۔ مومن کے کلام میں بالعموم حسب ذیل موضوعات پر طنزیات ملتی ہیں۔

۱۔ مذہب و تقدس، اس موضوع پر ان کی طنزیات زیادہ تر مقطعوں میں ملتی ہیں جہاں وہ اپنے تخلص کی رعایت سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بات ضرور پیدا کرتے ہیں

اس کے پردے میں کہیں واعظوں سے نوک جھوک اور کہیں بتوں سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہے۔

دشمنِ مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مومن کا مقطع ان کی غزل کی جان ہوتا ہے یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت سے شعرا تو محض غزل مکمل کرنے کے لئے مقطع کہتے ہیں۔ مومن کا مقطع اس قدر مشہور ہے کہ یہاں اس کی مثال پیش کرنا بے کار معلوم ہوتا ہے تاہم یہ چند مقطعے ملاحظہ ہوں:۔

ذکر شراب و حور کلام خدا میں دیکھ
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بیقرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

مومن تم اور ذکر بتاں اے پیر [illegible] ٹھہر
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

۲۔ مومنؔ کی طنزیات کا خاص میدان واعظ اور ناصح مشفق پر چوٹ کرنا اور ان کی فضیحت کرنا ہے۔ اسی میدان میں ان کی ظرافت اور زندہ دلی کے جوہر کھلتے ہیں۔ دیکھئے کس کس رنگ میں اور کن کن پہلوؤں سے ان حضرات کی خبر لی گئی ہے۔ اگر اس کے عنوانات قائم کئے جائیں تو تفصیل و تشریح نہ صرف طوالت کا بلکہ لطف کی کمی کا باعث بھی ہو جائے گی۔ قابل غور بات انداز بیان اور مضامین دونوں کا انوکھا پن ہے جس خصوصیت کی طرف مضمون کی ابتدائی سطور میں توجہ دلائی جا چکی ہے:۔

ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترک بتاں اے واعظ
ایسی حوریں تیری قسمت میں کہاں اے واعظ

منتظر ہے کسی بت کا جو نہیں تو کیوں ہے!
مجلس وعظ میں ہر سو نگراں اے واعظ

سچ ہے کافر تری تقریر سے کیوں کر نہ جلیں
شعلۂ آتش دوزخ ہے زباں اے واعظ

ڈر مری آہ سے ظالم، نہ جلا جی کر نہیں
یہ جہنم سے تو کم شعلہ فشاں اے واعظ

اہل جنت سے کرو دل بری حور کا ذکر
ایسی باتیں کوئی سنتا نہیں یاں اے واعظ

کیسی آرام پس مرگ مگر کافر تو ؛
اہل اسلام کا ہے دشمن جاں اے واعظ

شرم کی بات نہیں ہے یہ، اثر ہو کیوں کر
نہ میں مومنؔ ہوں نہ تو پیر مغاں اے واعظ

نچوڑیں گے ہم اپنا دامن تر
جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

توبہ کی عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

"فرمائے ہے" کے ٹکڑے نے کیسا مزہ دیا۔ ایک تو شعر کے یوں ہی کیا کم لطیف معنی تھے اس پر یہ طرز بیان! اسی طرح کا ایک اور شعر ہے

اس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا
ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا

"وسعت کلام" کی وسعت ملاحظہ ہو اور پھر اس کی نشتر زنی ممکن نہیں کہ وار خالی جائے اور ایسی ڈٹ کھا کر ناصح جاں بر ہو سکے۔ رعایت کے متلاشی "وسعت" کے ساتھ "جی تنگ آگیا" میں خوبی

کا ایک اور پہلو نکال سکتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "جان نہ لے" کا ٹکڑا کس قدر بلیغ ہے۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ تو مجھے پریشان نہ کر، میرا سر نہ کھا۔ دوسرا اور لطیف تر پہلو یہ نکلا کہ دل تو محبوب کی نذر ہوا اب جان تو لیتا نظر آتا ہے۔ پورا شعر کس قدر دل کش، بلیغ اور پر لطف ہے۔

قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا
میں تو دیوانہ تھا اسکی عقل کو کیا ہو گیا

ناصح کی دیوانگی کس طرح ثابت کی ہے۔ کیا خوب!

میں نے ناصح کا مدعا جانا
پوچھنا حالِ یار ہے منظور

ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناصح کو جو چاہوں تو ابھی ٹھیک بنا دوں
پر خوف خدا کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

اس میں بھی خاص بات ہے۔ مومن کو چاک کے ٹانکنے پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر وہ ناصح کی اس سینہ زوری پر کہ وہ "ہر بار" ٹانکتا ہے برہم ہیں اب تو محض ضد کی وجہ سے وہ ایک تار بھی ثابت نہ چھوڑیں گے۔

کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:-

کوئی سنتا ہی نہیں بکتا ہی کیا دیوانہ وار
میرے دل کے ساتھ ناصح کا بھی کیا جاتا ہے دل

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح
گر نہیں یقین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

لگ جائے شاید آنکھ کوئی دم شبِ فراق
ناصح ہی کو لے آؤ گر افسانہ خواں نہیں

اثر ہوتا ہی کب ہم سے وفاداروں کو اے ناصح ۔۔۔ فغاں سی پیشتر تم خجلت تقریر تو کھینچو

اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو ۔۔۔ ہمکو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

عشق میں ناصح بھی ہے کیا مدعی ۔۔۔ جرم ثابت ہو گیا انکار سے

پند گو اب تو ہی فرما کس کو سودا ہی یہ کون ۔۔۔ اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں ۔۔۔ کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے ۔۔۔ اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے

منھ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی ۔۔۔ لوں میں بھی ابھی لیتے ہر پردہ دری اتنی
یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے ۔۔۔ کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

اچھے موقع پر ناصح کی یاد آئی اس کو پیغامبر بنا کر بھیج رہے ہیں۔

نہ کرنی تھی نصیحت اسکے بیٹھے پر قیامت کی ۔۔۔ عجب فتنہ ہے ناصح بھی کہ یہ فتنے اٹھاتا ہے

ناصح "فتنہ" ہو یا نہ ہو شاعر کے فتین ہونے میں کوئی کلام نہیں جس نے ایسا موقع پیش کیا۔ اور لیجئے اب کے تو ناصح صاحب بری طرح پھنسے

کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا ۔۔۔ اب تو باندھونگا میں ناصح اسکو بھی زنجیر سے

۳۔ تیسرے درجہ پر ان کی وہ طنزیات ہیں جو انھوں نے محتسب یا رقیبوں پر کہی ہیں اور جو تعداد میں

نسبتاً بہت کم ہیں. بایں ہمہ لطف سے خالی نہیں. مثلاً :-

خاک میں حیف یہ شراب ملے　　　محتسب بادہ خوار ہونا تھا

محتسب وہم ہے تو پہلے پلا دیکھ مجھے　　　نہ لنڈھا، پی لے، نہ آب ہے، زہراب نہیں

رندوں پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا　　　اے محتسب! ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

پس شکستن خم صبر محتسب معقول　　　گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

غیر نکلا ترے گھر سے گئی اس وہم میں جان　　　غل ہوا چور کا اس کوچہ میں گر آخر شب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب!　　　غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب!

" بھلا صاحب" نے کیا بات کی شعر کو سچی طنز کا ایک تیز نیچہ بنا دیا۔

۴۔ شاذ و نادر شعرائے ہم عصر پر بھی طعن و تشنیع ملتی ہے لیکن وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں

یہ ہے ایک مختصر سا انتخاب مومن کے ان اشعار کا جو اسے طنزیہ کی صف اوّل میں لا بٹھاتے ہیں مزید لطف اندوزی کے لئے شائقین مومن اس کے دیوان سے رجوع فرمائیں۔ اسی طرح اس کے کلام میں مختلف قسم کی خوبیاں ہیں جن میں سے بعض پر بشرط فرصت، پھر کبھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

عربوں کے آثار

دنیائے علم و عمران میں !

دنیا میں عرب نامی ایک قوم نمودار ہوئی۔ علم و اخلاق سے تہی مایہ، تہذیب و تمدن سے عاری۔ اور فنون و صنائع سے ناواقف۔

پاس ہی روم و ایران کے قصر فلک بوس اپنی عظمت و ہیبت کا اعلان کر رہے تھے، ان کی تہذیب و تمدن کا خورشید جہاں تاب ایک عالم پر ضیا بار و کرم گستر تھا، لیکن عرب کا کاشانہ، محروم تھا، وہ جاہل تھے، بدخو تھے۔

لیکن دیکھئے! دیکھئے! وہ قوم ایک عالم پر چھا گئی، کشور کشائی اور ملک گیری میں کوئی اس کا ہم نبرد نہ رہا۔ علم و حکمت کی طرف جب متوجہ ہوئی تو یونان کے اسفار و اوراق کو کھنگال کر نئے علم نئے فلسفے، اور نئے نظریات سے علم و حکمت کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، تعمیر و صنائع کی طرف توجہ مبذول ہوئی، تو الحمرا اور قصر زہرا کی بنیادیں پڑ گئیں، غرض عرصۂ حیات کے جس گوشہ میں داخل ہوئی، مظفر و منصور، دنیا کے جس چپہ پر قدم رکھا۔ فاتح و کشورکشا کی حیثیت سے، علم و فن کی جس محفل میں داخلہ ہوا تو صدر نشین مسند علم و فن کے امتیاز خصوصی سے۔

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرف غلط   لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

دنیا زود فراموش ہے، عربوں کے ملکات و فضائل لوگوں کے ذہن و دماغ سے محو ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا "یاددہانی" کے طور پر اگر کبھی کبھی وہ داستان پارینہ زیب قرطاس و قلم ہوتی ہے تو مضائقہ کیا ہے؟

صفحات ذیل مصر کے مشہور علمی رسالہ "المقتطف" میں شائع ہوئے ہیں، ترجمہ نذر ناظرین ہے

یہ پیش نظر رہے کہ رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان نہیں عیسائی ہے

رئیس احمد جعفری ندوی

ایک صدی کے اندر ہی اندر عربوں نے متعدد ممالک پر قبضہ کرلیا، یہاں تک کہ چین جیسے دور و دراز مقام پر بھی ان کی فوجیں نظر آنے لگیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے نام سے دنیا کی قومیں لرزہ بر اندام ہوگئیں۔

ملک گیری سے جب ان کی طبیعت سیر ہوگئی تو انھوں نے علم وفن کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس میدان میں بھی وہ سب سے آگے نظر آنے لگے، ایک طرف سلطنت عباسیہ کا آفتاب نصفت و اقبال مائل بہ غروب تھا، تو دوسری طرف علم و حکمت کا مہر درخشاں طلوع ہو رہا تھا اور آگے چل کر حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی، بہت سے خود مختار عناصر پیدا ہوگئے مگر علمی ترقیوں کو جب بھی فروغ حاصل رہا، پہلے اگر ایک مرکز تھا، تو اب علم وفن کی سرپرستی کے متعدد مراکز ہوگئے۔

عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی کہ مختصر مدت میں یونان، فارس، اور ہندوستان کے مختلف علوم وفنون کو عربی میں ترجمہ کرلیا ہو، بلکہ انھوں نے ان میں وسعت پیدا کی، جدید اضافے کئے، اور نئے نظریات قائم کئے، جو آج تک حضارت فرنگ کے لئے اساس کا کام دے رہے ہیں۔

فن تاریخ میں عربوں نے ایسا امتیاز حاصل کیا تھا کہ علماء مغرب کے لئے وہ آج تک مایۂ حیرت و استعجاب ہے، دوسری اقوام و امم کے مقابلہ میں عربوں کے مولفات کو جو ترجیح حاصل ہے وہ ہر شخص کو معلوم ہے، مثالاً، کشف الظنون کو لیجئے، جس میں کتب وفنون کے اسماء سے متعلق مفصل معلومات پیش کئے گئے ہیں، ان کی تعداد جن کا کتاب میں ذکر ہے ۱۳۰۰ تک پہنچتی ہے، اور پھر شروح و اختصارات وغیرہ متزاد۔ اور وہ تاریخی کتابیں جو سال وسنین کی حسن ترتیب کے اعتبار سے قابل ذکر ہیں، مثلاً طبری، ابن اثیر، ابو الفدا، یا جو اقوام و ممالک کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں مثلاً مسعودی، مقریزی، ابن خلدون، وغیرہ، اس قبیل کی کتابیں تو حد شمار سے خارج ہیں[1]۔ ایسے ایسے مولف و مصنف بھی

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳۔ ص ۹۳

جو اپنی عبارت کی روانی و شگفتگی اور حسن استدلال کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اکثر عرب مورخوں کو علمائے مغرب نے "جگت گرو" تسلیم کیا ہے یورپ کے علمی حلقے اس وقت تک ان کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ابن خلدون ہی کو لیجئے۔ اس نے اپنی مشہور تاریخ کی تالیف اور ترتیب میں ممالک و مساکن کا خاص طور سے خیال رکھا ہے، مغرب اور اندلس کے متعلق اس نے ایسے ایسے معلومات پیش کئے، جہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکا' تاریخ ابن خلدون کا مقدمہ خاص اہمیت رکھتا ہے، یورپ کے ایک مشہور عالم کا قول ہے "ابن خلدون کا مقدمہ فلسفۂ تاریخ سے لبریز ہے، کوئی بھی وہاں تک نہ پہنچ سکا' جہاں تک ابن خلدون کی طبع بلند پہنچی ہے، بلکہ میں تو کہتا ہوں روم یونان کے علما بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچے"

فن جغرافیہ میں بھی عربوں کو تقدم کا شرف حاصل ہے، پہلے تو انھوں نے یونان وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا' ترجمے کے بعد انھوں نے اس فن کو اور بھی وسیع کیا، اپنے مشاہدات و تجربات سے اضافہ کیا' اس لئے کہ یہ قوم خود ایک جہانگیر قوم تھی، بطلیموس کی بہت سی غلطیوں کی تصحیح عربوں ہی نے کی[1] اور یہ عرب ہی تھے جو صحرائے افریقہ تک پہنچ گئے' اور بلاد سوڈان میں بھی اپنے جھنڈے گاڑ آئے۔ گذشتہ اقوام سے عرب اس باب میں بھی ممتاز ہیں کہ انھوں نے فن جغرافیہ میں بہت سی کتابیں اپنے مشاہدات و تجربات سیاحت سے متعلق تالیف کیں۔ زمین کے جو نقشے بنائے ان میں بھی ایک اسلوب بدیع کے مالک ہوئے' ان کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ کرہ پر نقشہ کھینچنے کا اصول سب سے پہلے انھیں نے معلوم کیا' خط نصف النہار کا طول درجہ معلوم کرنے میں بھی عرب ہی سب سے اوّل رہے۔ مشہور عرب جغرافیہ دانوں میں مسعودی، بیرونی، ادریسی، یاقوت، مقریزی، قزوینی، اور ابن بطوطہ سے ہر شخص واقف ہے۔
ان سب میں ادریسی کی شخصیت وہ تھی کہ بارہویں صدی مسیحی میں تو اس کا کوئی ہمپایہ پیدا نہیں ہوا ادریسی ہی نے روجر بادشاہ صقلیہ کی فرمائش سے ایک کتاب "نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق" تالیف کی، جس میں بلاد و ممالک کا نہایت تفصیلی تذکرہ تھا' اس کے علاوہ اس نے روجر کیلئے

---

[1] زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱

ایک نقشہ بھی تیار کیا تھا۱ جس میں اس زمانے کے تمام قابلِ ذکر اقالیم کو دکھایا گیا تھا، ادریسی کی وہ شخصیت ہے جو جغرافیۂ اسلام اور جغرافیۂ فرنگ کے درمیان حلقۂ اتصال کی حیثیت رکھتی ہے، کتاب "تراث الاسلام"۲ میں ہے کہ

"بادشاہ روجر کا ایک مسلمان عالم سے جغرافیہ پر کتاب لکھانا، اور نقشہ بنوانا، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان اس زمانے میں علمی اعتبار سے اپنے تمام اقران و اماثل میں ممتاز تھے"

بعض لوگوں کا خیال ہے عرب بس نقل و ترجمے کے ماہر تھے، علوم و فنون میں انھیں براہ راست کوئی دست رس نہیں حاصل تھی، یہ تحقیق انیق انھی "یورپ زدہ" حضرات سے ظہور میں آتی ہے جن کا سارا علم و فن رہین منت ہوتا ہے استادانِ فرنگ کا، یا ہمارے وہ نوجوان اس قسم کے اقوال کا اظہار کرتے ہیں جو فرنگیت سے مرعوب و متاثر ہیں، ورنہ اس قول کا مہمل ہونا بالکل ظاہر و باہر ہے، وہ فرنگی علما، جن کو خدا نے عدل و انصاف کا مادہ دیا ہے، اس کے علی الاعلان معترف ہیں کہ عربوں نے نقل و ترجمے میں اپنی مہارت کا جو ثبوت دیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ ہے خود انھیں علوم و فنون میں دستگاہ تھی،

یونانی، سریانی، کلدانی، وغیرہ میں طب پر جو سالہ تھا، پہلے تو عربوں نے اسے حاصل کیا، پھر اس فن میں انھوں نے ترمیم و تغیر کیا، اور حک و اصلاح سے کام لیا بلکہ اضافہ و ایزاد کے بھی نہایت بے بہا نمونے چھوڑے، کتاب تراث الاسلام میں ہے۔

"عربوں نے طب یونانی میں بہت کافی اضافہ کیا۔ اور ان کا یہ اضافہ تجربہ پر مبنی تھا، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ طب سے رسمی اور نظری طور سے ہی نہیں واقف تھے، بلکہ عملی حیثیت سے بھی کافی ممتاز تھے"

اس بیان سے ان لوگوں کی تسکین ہو جانی چاہیئے جن کے خیال میں عربوں کا علم طب

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا مادہ Map

۲۔ کتاب تراث الاسلام Legacy of Islam

نظری تھا۔ اس فن میں ان کے بڑے قیمتی مولفات بھی ہیں، مثلاً ابن سینا کا قانون اور ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی اندلسی کی کتاب التصریف وغیرہ۔ ان کتابوں سے فرنگیوں نے اپنی نہضت جدیدہ میں بڑے بڑے فائدے اٹھائے ہیں'' اٹھارویں صدی عیسوی تک عربوں کی بعض کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں داخل رہیں۔ عربوں میں جن لوگوں نے فن طب میں غیر معمولی مہارت حاصل کی، بہت ہیں جسے تفصیل مطلوب ہو طبقات الحکما، تراجم الحکما، اور کشف الظنون وغیرہ کی طرف رجوع کرے، یہ بات بہرحال ثابت ہے کہ طب اور صیدلۃ میں عربوں نے نمایاں حیثیت حاصل کرلی تھی۔

اس طب کو ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ ایک افسر اعلیٰ طلبہ کا امتحان لیتا تھا۔ ممتاز طالب علموں کو انعام بھی ملتا تھا، چنانچہ صرف بغداد میں بزمانہ، خلیفہ مقتدر باللہ ان کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ گئی تھی، اور ان میں وہ ستر افراد مستثنیٰ تھے جو خدمت سلطانی کے لئے معمور تھے[۱]

اس فن میں صرف مردوں ہی کو کمال نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش نظر آتی تھیں۔ مثلاً اخت حفید، اور اس کی دونوں بیٹیاں، ان عورتوں کو خاص طور سے عورتوں کے معالجہ میں کمال حاصل تھا[۲]۔

موجودہ زمانہ میں جو طریقہ رائج ہے، عرب اس سے بے خبر نہ تھے، ان کے ہاں بھی باقاعدہ نبض دیکھی جاتی تھی، پیشاب کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ اور وہ لوگ حکما، یونان کے افکار و آراء پر داد تحقیق و تنقید بھی دیتے تھے۔ یونانی کتابوں پر انھوں نے جو حاشئے لکھے، تعلیقیں تیار کیں، مفید اور مناسب اصلاحات کیں، ان کے علاوہ اور متعدد طریقوں سے وہ اس فن کو جلا دیتے رہتے تھے، وہ عرب ہی تھے، جنھوں نے طب میں کلوروفارم جیسی چیزوں کو معالجہ کے لئے ضروری قرار دیا جس

---

[۱] ابن ابی۔ طبقات الاطبا، ج ۱ ص ۲۲۲۔

[۲] ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبا۔

طرح آج کل جراحت کے لئے داغ دینا ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے" اسی طرح وہ بھی کرتے تھے عربوں ہی نے سب سے پہلے مرض سل میں ناخونوں کے ٹیڑھے ہو جانے کو ایک علامت کی صورت میں معلوم کیا۔ یرقان اور ہیضہ کا علاج دریافت کرنے میں عربوں ہی کو شرف اوّلیت حاصل ہے۔ جنون کے مرض میں افیون کے فوائد کا انکشاف بھی عربوں ہی کا رہین منت ہے، نزیف (بہتے ہوئے خون کو روکنے) کے لئے ٹھنڈے پانی کا تریڑا دینا بھی عربوں کی ایجاد ہے، شانہ اتر جانے کی صورت میں اسے بٹھانے کے لئے وہ بھی وہی طریقہ استعمال کرتے تھے جو آج کل رائج ہے[1]، اسی طرح جذام چیچک، کھسرا وغیرہ کی شکل وصورت اور خصائص وغیرہ کے متعلق عربوں نے تحریری سرمایہ پیدا کیا۔

طب کے درس اور مریضوں کے علاج کے لئے ایک خاص عمارت مخصوص ہوتی تھی، جس کو "بیمارستان" کہتے تھے، اور جس طرح آج کل طبی درسگاہوں سے لوگ سند فراغت حاصل کرکے نکلتے ہیں وہاں سے بھی وہ طبابت کی سند لے کر نکلا کرتے تھے، علاج کے لئے جو عمارت مخصوص ہوتی تھی، اس میں ہر قسم کا ضروری سامان اور آلات موجود رکھنے کا کافی انتظام تھا "نرسنگ" کے لئے ملازم تیمارداروں (خدم) کی ایک جماعت ہر وقت موجود رہتی تھی، جو امراض ان کے زمانہ میں معروف تھے، ان کے علاج کے لئے الگ الگ وارڈ (غرفہ) تھے[2]

علم الجراحت سے متعلق تحقیق وانکشاف کا سہرا زکریا رازی کے سر ہے" اور ان لوگوں میں جنھوں نے عمل بالید، سرجری، اور آلات وغیرہ کے استعمال میں خاص مہارت حاصل کرلی تھی، ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی کو خاص امتیاز حاصل ہے[3]

صیدلۃ (دواسازی) اور جڑی بوٹی کی تحقیق وتفتیش پر بھی عربوں نے خاص طور سے اپنی توجہ

---

[1] ۔ زیدان تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۰

[2] ۔ ابن ابی اصیبعہ۔ طبقات الاطبار ج ۱ ص ۱۸۳

[3] ڈاکٹر احمد عیسیٰ۔ آلات الطب والجراحت عند العرب ص ۴۔

مذہبوں کی، چنانچہ ہندوستان اور دوسرے ممالک سے اس باب میں نہایت وسعت قلب سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ یورپ تک کو اس کا اعتراف ہے کہ فن دواسازی کے بانی ہونے کا فخر عربوں ہی کو حاصل ہے[۱]۔ یورپ میں آج بھی بہت سی جڑی بوٹیاں انھیں ناموں سے معروف ہیں جو عربوں کے رکھے ہوئے ہیں۔

فن کیمیا کے بہت سے مرکبات عربوں ہی کی بدولت عالم وجود میں آئے، عمل تقطیر، عمل ترشیح عمل تذویب، بخارات بنا کے عرقوں کی کشید، قلمیں بنانا، الکحل تیار کرنا یہ سب وہ چیزیں ہیں جنھیں پہلے پہل عربوں ہی نے جانا، پہچانا، بہت سی معدنی تیزاب اور نباتی قلویات (کھاری چیزیں) اور معدنی قلویات عربوں ہی نے معلوم کیں۔ ان تمام چیزوں میں وہ مجتہدانہ نظر رکھتے تھے کہ بہت سے قدیم کیمیائی نظریات کو انھوں نے باطل کر دکھایا۔

ارباب نظر سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بارود کو مرکب کی صورت میں عربوں ہی نے پیش کیا، ابن اثیر کا قول ہے کہ "عربوں نے بعض ایسی دوائیں ایجاد کی تھیں کہ اگر وہ لکڑی پر مل دی جاتیں تو آگ ان پر اثر نہیں کرتی تھی"شیشے کی صنعت میں بھی عربوں نے اپنے کمال کا سب سے اعتراف کرایا، ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ علم نباتات میں بھی عربوں نے ایک استاد کی حیثیت اختیار کرلی تھی، اس علم میں ابن بیطار، اور رشید الدین ابن الصدری غیر فانی شہرت کے مالک ہیں، موخرالذکر کو اس فن کی تحقیق و تجسس کا یہاں تک سودا تھا کہ

"ان کے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رہتا تھا، جب وہ گھاس پات اور جڑی بوٹی کی تحقیق کے لئے نکلتے تھے، مصور کے پاس ہر طرح کے رنگ اور مسالے موجود رہتے تھے، جب رشید الدین ایسے مقامات پر پہنچتے تھے جہاں نباتات کی فراوانی ہوتی تھی، تو وہ اس کا مشاہدہ کرتے تھے، تحقیق کرتے تھے، پھر مصور کو دکھاتے تھے، مصور اس کے رنگ، پتیوں کی تعداد، شاخوں اور جڑوں کا پورا پورا اندازہ کرکے

---

[۱]۔ زیدان۔ تاریخ التمدن الاسلامی ج ۳ ص ۱۸۱۔

بالکل اسی طرح اس درخت کی تصویر کھینچا تھا۔ اور ہو بہو اس کی نقل اتار کے رکھ دیتا تھا، اس سلسلہ میں رشید الدین نے نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کیا تھا، یہ کہ وہ پہلے مصور کو پودے کی بالکل ابتدائی صورت دکھاتے تھے، اس کی تر و تازہ صورت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اور مصور اس کی تصویر لے لیتا تھا، پھر جب وہ پودا بڑھ جاتا تھا، اس میں دانے آجاتے تھے، تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، پھر جب وہ پودا خشک ہو جاتا تھا، اور گرنے کے قریب ہوتا تھا تو پھر اس کی تصویر لی جاتی تھی، اس تحقیق کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا کہ گویا وہ بچشم خود پودے کی اس نشوونما، اور تغیر و تبدل، کا معائنہ کر رہا ہے، ظاہر ہے یہ تحقیق کتنی کامیاب اور مکمل ہوتی ہوگی[1] میں نہیں سمجھتا کہ آج کل کے ماہرین علم نباتات ابن الصوری سے زیادہ تحقیق و تدقیق کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

عربوں نے طبیعیات (فزکس) پر بھی اپنی محنت و کوشش صرف کی چنانچہ اس باب میں بھی نئی نئی بحثیں ان کی بدولت ہمیں نظر آتی ہیں پہلے تو انھوں نے یونانی کتابوں کا ترجمہ کیا، اور ترجمے کے بعد پھر اس فن میں انھوں نے حسب عادت وسعت کی، بہت سے مسائل کا اضافہ کیا، ان کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ روز بروز اپنے لئے وہ نئی راہیں پیدا کرتے رہے۔ انھوں نے ایسے آلات بنائے تھے کہ جن کے ذریعہ سے وہ ثقل نوعی تک کا حساب رکھتے تھے، ایسے ایسے پیمانے انھوں نے تیار کئے تھے کہ ایک گرام کے ۴۰۰۰ ، ۔ حصہ سے کم وزن کا فرق تک وہ معلوم کر لیتے تھے، نظریہ جذب کے متعلق بھی ان کے بہت سے اقوال ملتے ہیں[2]، روشنی کے متعلق بھی ان کے مستقل نظریات ہیں کہ اس سے پہلے کسی کی رسائی ذہن وہاں تک نہ ہوئی تھی، بلکہ اس مسئلہ میں انھوں نے بہت سے اضافے کئے، یونانیوں کی صحت طلب آرا، و افکار کی تصحیح کی۔ اس مسئلہ پر اگر آج عربوں کے اضافے نہ ہوتے

---

[1] ابن ابی اصیبعہ طبقات الاطبا ج ۲ ص ۲۱۹

[2] ڈاکٹر صروف، بسائط علم الفلک ص ۲۲

تو یہ مسئلہ اس منزل تک نہ پہنچتا جہاں آج نظر آ رہا ہے بعض ارباب نظر کا خیال ہے کہ اس سلسلے پر عربوں کے مقالات و نظریات ہی کی بدولت دوربین کی ایجاد عمل میں آئی[1]۔ امراض چشم اور ان کی تشریح سے متعلق بھی عربوں کا بہت سا تحریری مسالہ موجود ہے[2]

موسیقی میں وتر خامس عربوں ہی کی ایجاد ہے، جسے زریاب نے اندلس میں اضافہ کیا تھا قانون بھی عربوں کا ایجاد کردہ ہے، اس کی موجودہ ترکیب (ساخت) فارابی کی دی ہوئی ہے[3]
یہ مشہور قصہ تو اکثر کو معلوم ہو گا کہ فارابی نے ایک باجہ ایجاد کیا تھا۔ جو صرف دو لکڑیوں سے بنا تھا ان لکڑیوں کی ترتیب میں جب ذرا سا تغیر کر دیا جاتا تھا تو مختلف قسم کے راگ نکلنے لگتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ وہ سیف الدولہ کے دربار میں حاضر تھا، اس سے سوال کیا گیا کیا تم گانے بجانے سے کچھ ذوق رکھتے ہو؟ فارابی نے اثبات میں جواب دیا، پھر اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا، اسے کھولا، اور اس میں سے دو لکڑیاں نکالیں، انھیں ایک خاص انداز میں ترتیب دیا، اور بجانا شروع کیا، تو یہ حال ہوا کہ مجلس میں جتنے لوگ بھی تھے سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا، پھر ان لکڑیوں کی ترکیب میں ایک خاص تغیر کیا، اور بجانا شروع کیا، اب کی اہل مجلس پر راگ کے اثر سے گریہ طاری ہو گیا، اور ہر شخص بے حال ہو گیا، اس کے بعد پھر اس نے اپنی لکڑیوں میں ایک خفیف سا تغیر کیا، اور بجانے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ حضار محفل پر غنودگی طاری ہوئی، اور دربان تک خراٹے لینے لگا، فارابی نے لکڑیاں جیب میں رکھیں اور یہ جادوگر غائب ہو گیا۔ فضائے آسمانی میں پرواز کا خیال بھی سب سے پہلے عربوں کو آیا، سب سے پیشتر اس معاملہ کی طرف جس کا ذہن منتقل ہوا، وہ عباس ابن فرناس تھا، نفح الطیب میں ہے کہ۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مادہ Sight

[2] کاجوری۔ تاریخ الفزکس، ص ۲۳

[3] ابن خلکان ج ۲ ص ،،

[4] ابن خلکان ج ۲ ص ،،

عباس نے اپنے جسم کو فضا میں اڑانے کی کوشش کی، پہلے تو اس نے اپنے بدن پر پر چڑے پھر دو بازو تیار کئے، جیسے چڑیوں کے ہوتے ہیں، اس کے بعد اس نے فضا میں کافی عرصہ تک پرواز کی، لیکن یہ پہلا تجربہ اس کے لئے ایک حد تک تکلیف دہ ثابت ہوا، اترتے وقت اس کے جسم کے پچھلے حصے میں کچھ چوٹ آئی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ پرند اترتے وقت اپنے پچھلے حصہ سے زیادہ مدد لیتا ہے، عباس نے غلطی یہ کی کہ دم نہیں بنائی[1]۔"

اب ہمیں چاہیئے کہ عربوں نے فن ریاضیات اور فلکیات میں جو ترقی کی تھی ایک نظر اس پر بھی ڈال لیں۔ ان دونوں مسئلوں پر علماء یونان اور ہندوستان کا جو تحریری مواد تھا اس سے استفادے کے بعد عربوں نے ان مسائل میں بھی قابل قدر اضافہ کیا۔ حساب میں عدد کے خواص اور دوسرے متعلقات پر انھوں نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، لفظ صفر بھی سب سے پہلے عربوں کے قلم سے نکلا، کسر عشری بھی عربوں ہی کا وضع کیا ہوا ہے، نو کا عدد گرا کے جمع کرنے کا اصول بھی عربوں ہی کی جانب منسوب ہے[2]، ہندی ہندسوں کو انھیں نے نقل کرکے رواج دیا، خوارزمی نے اپنی ایک تالیف میں لکھا ہے کہ موجودہ ہندسے ہم کو ہندیوں سے پہنچے ہیں[3] اور عربوں سے انگریزوں نے لئے ہیں۔

فن جبر و مقابلہ میں اگر یونانیوں کو کچھ درک تھا بھی تو بہت ناقص، ہم بلا خوف تردید یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ فن بھی عربوں ہی کے وضع کردہ فنون میں سے ایک ہے، کاجوری کا قول ہے کہ جب اس پر نظر جاتی ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے لفظ جبر کا استعمال بھی عربوں نے کیا اور ان سے انگریزوں نے لیا، اس فن پر انھوں

---

[1] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

[2] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۴

[3] سمتھ کارپنکی۔ الارقام الہندیہ العربیہ ص ۵

نے مستقل نظریات بھی قائم کئے تھے جو اس وقت تک قائم ہیں، معادلات کے لیے حلول جبری و ہندسی بھی انھیں نے ایجاد کئے، درجۂ ثانیہ اور ثالثہ کے معادلات سے بھی انھوں نے سب سے پہلے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس فن میں عربوں نے ایسی ایسی ایجادیں کیں کہ علماء فرنگ آج تک انگشت بدنداں ہیں۔ کاجوری کا قول ہے کہ معادلات تکعیبی کا حل [1] جو قطوع مخروط کے واسطے سے ہوتا تھا، عربوں کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ درجۂ رابعہ کے معادلات کے بعض اوضاع بھی انھوں نے حل کئے [2]، مامون کے حکم سے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اس علم پر ایک کتاب شائع کی، جس نے بڑی شہرت حاصل کی جس سے ساری دنیا میں خوارزمی کا نام پھیل گیا، علماء فرنگ نے فن جبر پر جتنی کتابیں تحریر کیں وہ اسی کتاب پر مبنی تھیں، یہ کتاب فرنگیوں کے کورس میں بھی داخل رہی، اور ایک مدت دراز تک یہ لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے، مثلثات میں بھی عربوں نے بہت جدت سے کام لیا، نسب مثلثہ کے عداد میں، عربوں ہی نے سب سے پہلے مماس کو داخل کیا [3]۔ تناسب جیوب کا قانون بھی عربوں ہی کے اکتشاف کا نتیجہ ہے، اور ان کے فخر کو یہ کافی ہے کہ کروی مثلثات کے حل کا عام قاعدہ انھیں نے بنایا، نظیر مماس، اور قاطع اور اس کی نظیر، ان چیزوں کے لئے جدولیں بھی سب سے پہلے عربوں نے تیار کیں اور واقعہ تو یہ ہے کہ علم المثلثات میں عربوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی کہ پھر اس پر خاص طور سے کوئی اضافہ کیا جاتا چنانچہ علماء فرنگ کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

فلکیات میں بھی عربوں نے اپنی ذہانت و قابلیت، اور ایجاد و اختراع کا ایک زمانے سے لوہا منوا لیا، انھوں نے سابق فلکی علماء کی طرح یہ نہیں کیا کہ نظریات ہی قائم کر کے رہ گئے ہوں، بلکہ انھوں نے اس فن کو عملیات میں داخل کر لیا، رصد وغیرہ کا قائم کرنا بعض نہایت اہم نظریات فلکی

---

[1] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات، ص ۱۰۷

[2] " " "

[3] انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا، مادہ مثلثات (Trigonometry) و نصیر الدین طوسی۔ شکل القطاع ص ۱۲۶

عربوں ہی کے طبع وقاد کا نتیجہ ہیں، انھوں نے بہت سے رصد خانے قائم کئے، اور ان میں منفعت بخش ارصاد کا انتظام کیا، اس فن میں انھوں نے ایسی مہارت کا ثبوت دیا کہ علمائے فلکیین دنگ رہ گئے، کوئی ان کی برابری نہیں کرسکا۔ مغرب نے بھی عربوں کے تفوق کو تسلیم کیا ہے۔ یہاں تک کہ لالاند مشہور فرانسیسی عالم فلکی تبانی کو ان بیس علمائے فلکیین میں شمار کرتا ہے، جو اپنی مہارت وخصوصیات کے اعتبار سے ساری دنیا میں فرد ہیں [۱]۔ زمین کی کرویت پر بھی عربوں کے بہت سے اقوال ملتے ہیں، ان کا یہ خیال بھی تھا کہ زمین ایک محور پر گردش کر رہی ہے، بڑی منفعت بخش زیچیں بھی انھوں نے ایجاد کیں، زمین کے لئے نقطۂ ذنب کی حرکت عربوں نے بیان کی، گرمائی اور سرمائی اعتدالوں کی قیمت میں بھی انھوں نے اصلاحیں کیں، فلک معدل النہار پر فلک بروج کے میل کی قیمت کا اندازہ بھی عربوں نے ہی کیا۔ اور تعجب خیز امر یہ ہے کہ اس میل کا حساب نہایت دقیق ہے، اپنی رصد میں انھوں نے ایک دقیقے تک کا حساب رکھا تھا [۲]۔ آفتاب زمین سے کتنا بلند ہے؟ اس سوال کا جواب جو انھوں نے دیا تھا، وہ تقریباً وہی ہے، جو آج کل کے علمائے فلکیات دیا کرتے ہیں [۳]۔ آلات رصد میں اسطرلاب بھی عربوں کی ایجاد ہے۔ غرض اس فن میں انھوں نے غیر معمولی اضافے کئے، میں نے "بسائط علم الفلک" میں دیکھا ہے کہ پچاس فیصدی ستاروں کے نام وہی ہیں، جو عربوں نے رکھے تھے، اور آج تک وہ فرنگی زبانوں میں برابر استعمال ہو رہے ہیں۔ اس فن میں ان کی مہارت اور کمال کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض فلکی علماء نے ایسے مکانات بنائے تھے، جن میں آسمان تھا، آسمان پر تارے تھے، بادل تھے، بجلیاں تھیں، سب ہی کچھ تھا اور دیکھنے

---

[۱] ملاحظہ ہو مقتطف، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۱ء

[۲] اسمٰعیل مظہر تاریخ الفلک العربی ص ۴۵-۴۶

[۳] اسمٰعیل مظہر " ص ۴۶

[۴] فانڈیک کتاب علم الهیئة ص ۱۳۷

والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سچ مچ آسمان کے نیچے کھڑا ہوا ہے[1] علمائے مغرب کا اس میں اختلاف ہے کہ حرکت قمر میں انواع خلا کے انکشاف کا سہرا کس کے سر ہے؟ بعض لوگ تیخو براہی کا نام لیتے ہیں اور بعض ابوالوفا کا[2] لیکن اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس انکشاف کا سہرا ابوالوفا کے علاوہ کسی اور کے سر نہیں ہے[3]۔

جب عربوں نے عیش وعشرت کے میدان میں قدم رکھا، تو اس میں بھی وہ سب بازی لے گئے، ایک طرف اگر علوم وفنون میں انھوں نے اپنی نظریات وخیالات کی ندرت کاریوں سے ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا تھا، تو دوسری طرف بزم وانجمن میں بھی وہ سب پیش پیش تھے، ان کی بزم آرائیاں آج تک لوگوں کی زبانوں پر اور کتابوں کے اوراق پر محفوظ ہیں، انھوں نے جب شعر وشاعری کی طرف توجہ کی، تو اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ میدان میں کوئی حریف نہیں رہ گیا، جب موسیقی کی طرف ان کی نظر متوجہ ہوئی، تو ایسے راگ اور باجے ایجاد کئے کہ مرور ایام کے باوجود آج تک وہ باقی ہیں۔ جب انھوں نے تعمیر پر نظر عنایت کی، تو ایسے ایسے قصور ومحلات تیار کر کے کھڑے کر دئے، کہ دنیا میں جنت کا نمونہ قائم کر دیا، ان کی عمارتوں کی خوبی وخوشنائی، سنگینی واستحکام، اور تناسب وتناسق پر جب نظر پڑتی ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے، ایک نظر مصر کی عمارات، دمشق کی جامع اموی، اور اندلس کے قصور ومعابد پر ڈالو، تو عظمت اب بھی وہاں سجدہ ریز نظر آئے گی۔

الحمرا کی فرا واقعی خصوصیات میں بیان کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، لیکن میں نے اس کے متعدد اوصاف مقالات کتب میں پڑھے ہیں جو مشاہدے پر مبنی تھے اور ہر وصف ایک دوسر

---

[1] المقری۔ نفح الطیب ج ۲ ص ۲۳۱

[2] کاجوری۔ تاریخ الریاضیات ص ۱۰۵

[3] کتاب تراث الاسلام ص ۳۹۵

سے علیحدہ، یہ نتیجہ ہے۔ الحمرا کی اعجوبہ زائیوں اور حیرت فروشیوں کا، اس کی عظمت اور جلال ہندسی (انجینیرنگ) کا کون انکار کرسکتا ہے؟ مغربی علما نے بھی الحمرا کے گن گائے ہیں اور اس کی نزاکت صنعت اور استحکام عمارت کا اعتراف واقرار کیا ہے، فرنگیوں نے محلات اور کوٹھوں کے نام "عمبرا" "اڈکزارا" (یعنی حمرا اور قصر) رکھنا شروع کئے "عمبرا" (حمرا) کے معنی ہی ان کے یہاں اس قصر کے پڑ گئے، جو خوبصورت ہو، مضبوط ہو، اس کے اندر باغیچہ ہو، طرح طرح کے پھول ہوں، غرض ہر چیز سے آراستہ و پیراستہ ہو[1]

قصر حمرا، عربوں کی جاہ وحشم، اور عیش وتنعّم کی ایک زندہ یادگار ہے، خوف طوالت کی خیال سے اشبیلیہ کے قصر کبیر اور اندلس کے قصر زہرا اور قصر زاہرہ وغیرہ کا ذکر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ قصر زہرا میں سنگ مرمر، اور دوسرے طرح طرح کے نادر پتھروں کو اس حسن وخوبی سے استعمال کیا گیا تھا کہ قوت بیان، اس کی تشریح سے عاجز ہے، اس میں سیکڑوں طلا سرخ کی مورتیں تھیں، مثلاً عقاب ہرن، گھڑیال، شاہیں وغیرہ، ان میں سے ہر مورت ہیرے جواہرات سے مرصع تھی، فوارے کی طرح اس کے منھ سے پانی نکلتا رہتا تھا[2]

یہ عمارتیں کیا بنیں ہمارے شعرا اور ادبا کے لئے ایک اچھا خاصہ میدان ہاتھ آگیا، مختلف شعرا نے اپنے اشعار میں، اور ادبا نے اپنی نثر میں ان عمارتوں کے کمالات وخصوصیات حسن وجمال تشریح وتعبیر، اور اصلی تصویر کھینچنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا۔

سطور بالا میں فن تعمیر کی چند نادر مثالیں پیش کی گئیں۔ ان کے علاوہ عراق، شام، اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں حضارت وتمدن کے جو نمونے عربوں نے قائم کئے، وہ ایسے ہیں کہ عصر حاضر کے بڑے بڑے علما بھی ان کا اعتراف کرتے ہیں، اسپین کے ایک بہت بڑے انجینیر کا بیان ہے کہ جب

---

[1] مجلۃ الکلیۃ جلد ۱۵ ص ۳۳۰

میں مسجد قرطبہ کو دیکھتا ہوں، تو محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑا اور اہم، اور قابل ذکر تحفہ جو ہے، وہ یہی مسجد ہے، میرا خیال تو یہ ہے کہ دنیا اب تک اس مسجد کی نظیر نہیں پیش کرسکی" آگے چل کے وہ کہتا ہے کہ مختلف قسم کی صناعات میں اور پانی کو طرح طرح سے کاٹ کے نکالنے میں عربوں نے جو طریقہ اختیار کئے تھے، عہد حاضر کا فن اب تک وہاں نہیں پہنچ سکا ہے۔ فلسفہ میں عربوں نے جو کمال حاصل کیا تھا۔ اس سے ایک دنیا واقف ہے، کندی، ابن سینا، ابن ہیثم، اور ابن رشد وغیرہ ان اساطین میں ہیں کہ اب تک بہت سے دانشوران مغرب ان کی خوشہ چینی کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں۔

عربی حضارت تمدن کے بحر بے پایاں کے یہ چند قطرے تھے، جو اس صحبت میں پیش کئے گئے مغربی علمار نے عربوں کے عمران و تمدن پر بہت سیر حاصل بحثیں کی ہیں جن میں سے ہر ہر گوشہ ایک دفتر کی حیثیت رکھتا ہے فرنگی علمار نے جب کبھی عربوں کے آثر کی جستجو کی، تو ان پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ عرب ہر چیز میں سبقت لے جا چکے ہیں، ایک بڑے مغربی دانشور کا قول ہے" بہت سی ایجادات واختراعات کو ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ ہمارے مساعی کا نتیجہ ہیں، لیکن تھوڑے ہی عرصہ کی کاوش وجستجو کے بعد ثابت ہوگیا کہ ہمارا خیال غلط تھا، عرب ان چیزوں میں ہم سے مدت ہوئی بازی جا چکے ہیں"

پھر یہ بھی یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ایسے قدر شناس مغربی علمار ہیں جو قدم قدم پر عربوں کی رہنمائی، اور دستگیری کے قائل ہیں، اور دوسری طرف ایسے حق ناشناس بھی جو اپنے زعم علم میں اس کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کرتے کہ اپنے مآخذ و مصادر کا تذکرہ کردیں اس لئے کہ اس میں عربوں کا ذکر آجائے گا اور اسے وہ پسند نہیں کرتے۔ لیکن ایسے انصاف پرور علما بہرحال موجود ہیں جو نہایت فراخدلی سے عربوں کی علمی وعمرانی خدمات کا اعتراف خندہ جبینی

لہ المقری۔ نفح الطیب ج ۱ ص ۲۳۰

کے ساتھ کرتے ہیں۔

فلوریان کا قول ہے کہ " اپنے زمانے میں عربوں نے علوم و فنون کی ترقی میں جو کچھ کیا، ویسا کوئی نہیں کرسکا، اگر ہم یہ کہیں کہ یورپ ان کے خدمات علمی کی بنا، پر ہمیشہ انکار ہیں منت رہا (اور شاید رہے گا؟ مترجم) تو یہ مبالغہ نہیں ہے، بالخصوص تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کی نہضت میں ان کی یہ خدمت ایک بہت بڑی عامل تھی۔"

بلاشبہ حضارت عرب ایک حلقۂ اتصال ہے یونان اور حضارت جدیدہ کے درمیان، وہ عرب ہی تھے جنھوں نے یونان وغیرہ کے علوم کو ضائع ہونے سے بچایا، وہی تھے جنھوں نے ان علوم و فنون کو عربی میں منتقل کیا، وہی تھے، جنھوں نے ان علوم و فنون پر اضافے کئے، اور بالآخر اسپین کی راہ سے یہ سارا سرمایہ یورپ پہنچا دیا۔ کاجوری اور سمت اعتراف کرتے ہیں کہ ریاضیات اور فلکیات میں عرب سب کے استاد تھے، بارون ڈی فو کہتا ہے، "یونان نے جو علمی ورثہ چھوڑا، رومی اسے نہ قائم رکھ سکے، نہ اس کی قدر کرسکے، لیکن عربوں نے اس میراث کی حفاظت کی، اور اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا یعنی یہی نہیں کہ انھوں نے اس میراث کو جوں کا توں باقی رکھا ہو بلکہ اسے ترقی کے سب سے بڑے درجے پر پہنچا دیا۔ انھوں نے اسے پروان چڑھانے میں اپنی پوری کوششیں صرف کردیں، اور بالآخر انھوں نے وہ میراث عہد حاضر کو سپرد کردی۔"

ڈاکٹر سارٹون نے جامع امریکیہ، بیروت میں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا۔

"بعض مغربی علماء خواہ مخواہ عربوں کی جلالت علمی کا اعتراف نہیں کرتے، قرون وسطیٰ عربوں نے علم و فن کو جو فروغ دیا، اس کا اقرار کرتے ہوئے وہ ہچکچاتے ہیں، کہتے ہیں، عربوں نے یونانی علوم فنون کو نقل و ترجمہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی غلط بیانی ہے۔ اگر ہم اسے فرض بھی کرلیں کہ نقل و ترجمہ کے علاوہ انھوں نے کچھ اضافے نہیں کئے تب بھی کیا یہ دنیا کی ایک عظیم الشان خدمت نہیں تھی؟ اگر ان کے "ترجمے" آج نہ ہوتے، تو ہم ترقی کی اس منزل پر نہ ہوتے بلکہ اب تک ہم قرون وسطیٰ ہی میں نظر آتے۔"

ڈاکٹر سارطون کا یہ خیال بھی ہے کہ انکشاف، سے اگر فائدہ نہ اٹھایا جائے تو اس کی حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی لیکن جو انکشاف سے فائدہ اٹھائے، اس کو برتنا سیکھے اور سکھائے وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں اس کا مستحق ہے کہ اسے موجد مانا جائے چنانچہ فرماتے ہیں،

" قرون وسطیٰ میں عرب دنیا کے سب سے بڑے معلم تھے۔ عربوں کے نقل و ترجمہ کی حیثیت میکانکی نہیں تھی کہ لفظ بہ لفظ رکھ دیا، یا ہوبہو چربہ اتار دیا، بلکہ ان کی چیزوں میں روح تھی، زندگی تھی۔ انھوں نے یونان سے علوم و فنون حاصل کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں کیا، اور ہندوؤں سے بھی بلا تامل انھوں نے قابل اخذ چیزیں حاصل کیں"

یہ ہے ایک مختصر سی داستان ایک گذری ہوئی قوم کی جو اگرچہ زندہ ہے، لیکن مر چکی ہے۔
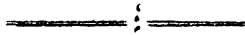
مایا کے کھیل

رام بھروسے کاچھی کا جوان بیٹا پچھلے سال گرمیوں میں پولیس والوں کی گولیوں سے زخمی ہو کر مر گیا۔ وہ بے قصور تھا۔ گاؤں گاؤں کے کسانوں نے لگان کی تخفیف کے سلسلے میں جو بلوے کئے تھے۔ اس سے اُسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ بچارا ہن کی سسرال سے اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں موضع یعقوب پور کے کسانوں کی بھگدڑ میں پھنس گیا۔ سامنے سے پولیس گولی چلا رہی تھی۔ اس کے بھی دو گولیاں لگیں۔ اور ایسی کاری کہ وہیں گاؤں کی سرحد کے پاس خیراتی کے کنوئیں کے قریب اس کی جان نکل گئی۔

رام بھروسے کی پکڑ دھکڑ ہوئی۔ حاکم کے سامنے پیشی ہوئی۔ مگر دو چار گاؤں کے بھلے مانسوں اور داروغہ جی کی گواہی صفائی سے رام بھروسے مظلوم قرار دیا گیا۔ بیٹے کی جان کی قیمت سرکار سے ایک ہزار روپیہ ملی۔

پورے گاؤں پر بلوے کا تاوان لگا۔ پیسے والوں کا حال پتلا ہو گیا۔ عزت داروں کی بات میں دم نہ رہا۔ اب رام بھروسے پورے پکّے ایک ہزار روپیہ کا مالک ٹھاکر بھوپ سنگھ کے دوارے آنے جانے لگا۔ پہلے بیگاریوں میں پکڑا جاتا تھا۔ ٹھاکر صاحب گاؤں کے نمبردار تھے۔ ان کے ہل چلانا پڑتے تھے۔ اور جو کبھی چلم کے لئے تنبا کو مانگ بیٹھتا تھا تو ٹھاکر صاحب کی گالیاں سہنی پڑتی تھیں۔ اب ٹھاکر صاحب پر گھٹتی پڑ رہی تھی۔ نمبرداری ٹوٹ چکی تھی اور رام بھروسے پر لکھمی جی ہنس رہی تھیں۔ اس لئے حالات کی صورت بدل گئی۔ آتے جاتے اگر رام بھروسے کاچھی ٹھاکر بھوپ سنگھ سے دوچار ہوتا۔ تو ٹھاکر صاحب "کہو سیٹھ" کہ کر بات کرتے اور جو ٹھاکر صاحب کے ڈیرے پر جانا ہو جاتا۔ تو ٹھاکر صاحب اپنے حقے کی چلم خود اتار کر رام بھروسے کو دیتے کہ "لو ایک دو دم لگا لو"

دو چار سال تک یہی ڈھنگ رہے۔ لیکن رام بھروسے کے ہاں لچھمی جی کا دل نہ لگا۔ دو چار نقصان ہوئے۔ پہلے سے کسانی جانتا نہ تھا۔ کاشتکاری کے داؤں پیچ اور اونچ نیچ سے واقف نہ تھا۔ کیرا بنا کسان اور کام نہ سنبھلا۔ دوسری طرف روپیہ کا نشہ سوار تھا۔ دو چار مقدمے ہوئے اس میں وکیل منشی اور اہلکاروں نے روپے کھائے۔ اور سرکار کا دیا روپیہ پھر سرکار کے خزانہ میں پہنچ گیا۔ مگر رام بھروسے کاچھی بالکل بگاری نہ بن سکا۔ چونکہ روپیہ چلے جانے کے بعد بھی کچھ چاندی کی ایسی چمک چھوڑ جاتا ہے کہ ہر ایک کا زور چلنا آسان نہیں رہتا۔ لیکن رام بھروسے پھر کیرے ہوگئے۔ فصل کا اناج اور روہ آنے روز پر سوے ولدوں کے کھیت جوتنے لگے۔

ٹھاکر صاحب کی بہن کا لڑکا نائب تحصیلدار تھا وہ دوسرے ضلع سے تبدیل ہوکر نواب گنج کی تحصیل میں آگیا۔ نائب تحصیلدار کی میل ملاقات افسروں اہلکاروں سے تو تھی ہی۔ اب انھوں نے اپنے ماموں ٹھاکر بھوپ سنگھ کی بگڑی بات بنانی شروع کی تحصیلدار صاحب سے ملایا ڈپٹی صاحب کے سامنے پیشی کرادی۔ داروغہ جی سے لحاظ ملاحظہ قائم ہو ہی گیا تھا۔ غرض کہ پھر ٹھاکر صاحب کا زور گاؤں میں بندھ گیا۔ نمبرداری مل گئی۔ نہر کا پانی ضلعدار صاحب کی مہربانی سے وقت پر ملنے لگ گیا۔ فصل اچھی ہوئی۔ چار پیسے ہاتھ میں آئے اور ٹھاکر صاحب کا گاؤں میں وہی رتبہ ہوگیا جو پہلے تھا۔ پھر رام بھروسے کاچھی ان کے کھیتوں پر کام کرنے لگ گیا۔ اور اب پھر وہ جب کبھی چلم کے لئے تمباکو مانگتا تو ٹھاکر صاحب پہلے کی طرح کہہ دیا کرتے کہ "ابے کاچھی کیوں اپنی ذات بھولتا ہے کیوں جوتے کھانے کی دل میں ہے"

پہلے تو رام بھروسے یہ ڈانٹ سن کر ڈر جایا کرتا تھا لیکن اب وہ کچھ مسکرا دیا کرتا ہے۔ اور جی ہی جی میں کہتا ہوا چلا جاتا ہے کہ "مانس کی کچھ نہیں یہ تو سب مایا کے کھیل ہیں"۔

کیفیات

وفورِ بیخودی میں بڑھ گیا ہوں سرحدِ دل سے
خیالِ دوست بھی آتا ہے اس منزل میں مشکل سے

نکلتی ہے تمنّا اس طرح ٹوٹے ہوئے دل سے
کہ جیسے شمع ہنگامِ سحر اٹھتی ہے محفل سے

وہ راحت ہے محیطِ عشق و طوفانِ حوادث میں
کہ دل ڈوبا سا جاتا ہے خیالِ قربِ ساحل سے

خوشا وہ دور جب دل تھا رہینِ رنجِ ناکامی
کہ اب تو زندگی ہے تلخ فکرِ برق و حاصل سے

مرے حق میں ہے تیرِ نیم کش بھی پرسشِ پنہاں
سمجھتا ہوں کہ وہ غافل نہیں ارمانِ بسمل سے

وہ خود بیں جو بہت نازاں تھا حسنِ دلربائی پر
اسے ہم اپنے دل میں کھینچ لائے جذبِ کامل سے

غمِ الفت کو دورِ زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
یہاں تک اہلِ دل مسرور ہیں کیفیّتِ دل سے

نہ پوچھو لذتِ ذوقِ طلب راہِ محبت میں
دلِ دیوانہ مجھ کو دور ہی رکھتا ہے منزل سے

اٹھائیں گے کہاں تک زحمتِ دستِ جنوں وحشی
کہیں مضبوط ہے تارِ نفس طوق و سلاسل سے

دمِ نظارگیٔ حسن کس عالم میں پہنچے گا
وہ دیوانہ جو مجنوں ہوگیا ہو رنگِ محمل سے

تڑپنے بھی نہیں دیتی مری خوئے وفا مجھ کو
بہت جی گھٹ رہا ہے زحمتِ بازوئے قاتل سے

نشاطِ زیست کیسی؟ ہر نفس پر اب یہ عالم ہے
کوئی سر پھوڑتا ہو جس طرح دیوارِ حائل سے

جوابِ گرمجوشی سرد مہری ہی سہی کوکبؔ
چراغِ کشتہ ہوں اب کیا کہوں یارانِ محفل سے

شاعرِ عظیم

ڈاکٹر جے۔ ٹی۔ سنڈرلینڈ انگریزی کے مشہور انشا پرداز اور صحافی ہیں۔ کلکتہ کے مشہور رسالہ "ماڈرن ریویو" میں اکثر سیاسی مباحث پر ان کے بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

موصوف نے حال میں ایک پارۂ ادبی عنوان بالا پر سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں ایک عقلمند فلسفی کی نظر سے "برگِ درختاں سبز" کو معرفت کردگار کا "دفتر" بنا کر دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ ایک مغربی ادیب کا یہ "عرفانی تخیل" خصوصاً اس دورِ مادیت میں قابلِ ستائش ہے ذیل میں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، جو امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

خدائے (عزّ و جل) شاعرِ عظیم ہے۔

کائنات اس کی نظموں کی غیر محدود کتاب ہے۔

فسانۂ ارتقا اس کی پرشوکت اور حیرت انگیز رزمیہ نظم ہے۔

تواریخ اقوام اس کے شاندار ڈرامے ہیں۔

طبقات الارض کے انکشافات، یعنی چٹانوں کے بیان کئے ہوئے گذشتہ عہدِ قدیم کے قصے، اس کے مقدس مرثیے ہیں۔

پہاڑ خصوصاً عظیم الشان سر بفلک پہاڑوں کے سلسلے، اس کی بلند ترین نظمیں ہیں۔ بڑے بڑے تناور درخت اس کے مسبّعات (SONNETS) ہیں۔

آفتاب کے طلوع اس کی حمد و ثنا کے قصائد، اور غروب اس کی عظمت، عبادت، اور پوجا کے پرسکون نغمے ہیں۔

ہواؤں کے قہقہے اور نالۂ و فریاد، گھنے جنگلوں اور صحراؤں میں اس کے غم اور مسرت کے

ترانے ہیں۔

سیکڑوں ریتیلے ساحلوں پر سمندر کی نرم آہیں اور سسکیاں اس کے نوحے ہیں۔ رعد و برق کے طوفان، دریاؤں کے تیز رو سیلاب، گہرے کناروں اور پتھریلے ساحلوں پر بحرِ بے پایاں کی امواج کا شور تلاطم اس کے پر سطوت گانے ہیں۔

آبشار اس کے قطعات ہیں۔

لہرانے والے چشمے اس کے بزمیہ اشعار ہیں۔

کنجوں میں چہچہانے والی چڑیاں اس کے دوہے ہیں۔

براعظموں اور سمندروں میں پرندوں کا حیرت انگیز سلسلۂ مسافرت (ہجرت) اس کی منظوم داستانیں ہیں۔

دنوں اور راتوں کا تغیر پذیر، غیر منقطع، اور مخفی سلسلہ، اور موسموں کی مسلسل آمد و رفت، اس کے منظوم ناٹک اور بزمیہ ڈرامے ہیں۔

پھول، جو ہر جگہ زمین کو خوبصورت اور شاداب بناتے ہیں، اس کے سحر انگیز "نغمہائے بے الفاظ" ہیں۔

چشموں میں پانی کا ہنسنا اور لہریں لینا، چھپروں پر مینہ کی جھڑیوں کی بوچھاڑ،
تیتریوں اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ، اور فضا میں خوبصورت سپید پروں کی پھڑپھڑاہٹ، جنھیں ہم "برف کی قاشیں" کہتے ہیں؛
چھوٹے پرندوں کا چہچہانا، جھینگروں کا شور مچانا، اور گڑھوں میں مینڈکوں کا ٹرانا۔
جگنوؤں کی آگ بچولی، پانی کی سطح پر بلبلوں کی درخشانی اور ستاروں کی جگمگاہٹ۔
یہ سب اس کی "بچکانی نظمیں"، اس کے کنڈر گارٹن کے چھوٹے گیت، اور خوش دل بچوں کے لئے اس کی لوریاں ہیں۔

پہاڑیوں کے پوشیدہ گوشہ ہائے عزلت، اور گھنے جنگلوں کی خلوتیں؛
چاند اور ستاروں سے مزیّن، رات کے وقت پرسکون آسمان کا منظر؛
پہاڑ کی چوٹیوں سے، کسی کے زیر قدم تمام دنیا کو سمیٹنے والے، وسیع نظّارے، اور پر اسرار سمندر کے کنارے، جہاں وسیع پانی لامتناہی آسمانوں سے ہم آغوش نظر آتا ہے، اور روح انسانی کی وسعتوں کو ظاہر کرتا ہے،

یہ سب اس کے خاموش نغمہ ہائے عبادت ہیں، جو ہمیشہ انسانوں کو روحانی امن اور سکون اور زندگی کو شاندار بنانے والی اشیاء کے تصور کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ کو اپنا نمبر خریداری یاد ہے؟

اگر یاد نہ ہو تو مہربانی فرماکر پتے کی چِٹ پر ملاحظہ کر لیجیے۔ خط و کتابت میں نمبر کے حوالہ سے بڑی سہولت ہو جاتی ہے ورنہ بسا اوقات جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا ہے براہ کرم اسے نہ بھولیے

مہتمم

نالۂ دلگداز کیفی بسالِ وصالِ والاجناب رئیس الاحرار

مولانا محمد علی مرحوم ۱۹۳۱ء

یہ تاریخ سیرت محمد علی میں شائع ہونے کے لئے آئی تھی مگر افسوس ہے کہ کتاب کے چھپ چکنے کے بعد پہنچی انشاءاللہ دوسرے ایڈیشن میں چھپ جائے گی۔ اس وقت ہم اسے ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں (مدیر)

محمد با علی باہم شہید ملک و ملت بود
بدنیا در ہزار و ہشت صد ہفتاد و ششش آمد

پئے بہبودی اہل وطن ترک مناصب ساخت
پئے بہبود مسلم با حکومت پنجہ کش آمد

بزنداں او فتاد۔ آزارہا برداشت غمہا خورد
مگر از پردلی اندر بلاہا شاد و خوش آمد

قوی شد بازوئے گاندھی بزور دست و بازویش
سپر انداز دست سلطنت از ہمتش آمد

زہندوستان بہ لندن شد پئے تاسیس آزادی
شبے کردہ تفکرت صبح رنجہ شد نفس آمد

رگ جاں در گستہ اندراں حالت بہ جنت شد
دل عالم ز دست فرقتش در کشمکش آمد

چو فکر اتحاد عالم اسلام بے حد داشت
بہ تدفینش طلبہا از فلسطیں و حبش آمد

بعلم و فضل و کانبیاء[1] بود مصداقے
نزیل مسجد اقصے ہماں اخیار فش آمد

بچارم جنوری شد فوت و پس از نوزدہ روزے
بہ بالیں لحد آں مہر طینت ما ہوش آمد

الٰہی دہ اماں پس ماندگانش را ازیں طوفانہا
بہ گرداب است کشتی ناخدا در خواب خوش آمد

بگفت از بہر تاریخ وفاتش کیفی محزوں
بہ لندن مرد و در بیت المقدس مرقدش آمد
۱۹۳۱ء

---

[1] اشارہ ہے حدیث نبوی کی طرف علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

جراثیم ملیریا کی تاریخ

سر رونالڈ روس کی وفات پر بعض اخبارات نے یہ بیان شائع کیا کہ ملیریا کے جراثیم سب سے پہلے ڈاکٹر رونالڈ روس نے دریافت کئے ہیں حالانکہ ان کا بیان حقیقت کے خلاف تھا کیونکہ اس کی دریافت تو ایک فرانسیسی ڈاکٹر لافران کی جد و جہد کا نتیجہ ہے جو ۱۸۸۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ یہ ڈاکٹر فرانسیسی فوج متعینہ ٹونس الجزائر و مراکش کا طبیب تھا۔ فوج میں یہ مرض اکثر پھیلا رہتا تھا اس لئے اس نے اس پر توجہ کی اور اس کے اسباب دریافت کر کے چھوڑے۔

بہر حال اس جرثومہ کا اکتشاف اخبارات کے اس بیان سے معرض اختلاف میں آگیا ورنہ یہ دونوں باتیں پہلے ہی سے معلوم تھیں۔ اور سر رونالڈ روس کی اکتشاف کے متعلق مزید تحقیق یہ بھی تھی کہ انھوں نے جرثومہ ملیریا دریافت ضرور کیا تھا مگر وہ جرثومہ جو پرندوں میں ملیریا کا باعث ہوتا ہے نہ کہ انسانوں میں پرندوں کا ملیریائی جرثومہ انسانی ملیریائی جرثومہ سے مختلف ہوتا ہے مگر اختلاف و اشتباہ کی بدولت ضرورت محسوس ہوئی کہ مسئلہ پر مزید تحقیق کی جائے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ بکٹریا لوجی (علم جراثیم) کے ماہر خصوصی ڈاکٹر زکی خالد سے اس باب میں معلومات اخذ کی جائیں۔

چنانچہ آئندہ معلومات ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے رہین تحقیق ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے فرمایا کہ اس کی دریافت بھی عجیب و غریب دلچسپ کہانی سے کم نہیں ہے جس طرح پولیس اور سراغرسانی کے اخبار دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں اس کی دریافت کی کیفیت بھی ایسی ہی دلچسپ ہے۔

تقریباً بیس سال سے متواتر مختلف اقوام کے ڈاکٹر اس کے تلاش میں سرگرداں تھے

اور ہر ایک نے اس کی کافی جانچ کی اور سب مختلف وقتوں اور مختلف مقامات پر تقریباً صحیح نتیجے پر پہنچے
جو جو تکالیف اور مصائب انھوں نے ان دریافتوں میں اٹھائے ان کو ہم بخوف طوالت نظر انداز
کرتے ہیں۔ ان لوگوں نے یورپ، ایشیا، افریقہ ہر سہ برّاعظموں میں گشت لگائی ملیریا کے اسباب
کو دریافت کیا اکثر مواقع پر موت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ گروہ اپنے اہل وعیال وطن دوست واحباب
سے دور علم کے شوق اور اس کی تحقیقات میں مصروف جنگلوں اور ایسے میدانوں میں جہاں ملیریا کثرت
سے ہوتا ہے سفر کر رہا تھا۔ ان علماء میں مختلف اقوام کے لوگ شامل تھے جن میں انگریز فرانسیسی اور
اطالوی سب تھے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ مختلف اقوام اور مختلف الخیال علماء تھے لیکن طرز تحقیق سب کا
ایک ہی تھا۔ میری رائے میں یہ حقیقی ہیرو تھے اور علم پر اور انسان پر ان کے کارناموں اور ان
کی تحقیقات کا بہت بڑا احسان ہے۔ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہیں
گے۔ آئندہ آنے والی بہادر قومیں ان کے نقش قدم کی پیروی کریں گی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں
نے دنیا اور اس کی جملہ دلچسپیوں کو چھوڑ کر تنہا جنگلوں کو اختیار کیا اور معلومات حاصل کیں ان
کی معلومات جب تک دنیا کو فائدہ پہنچاتی رہے گی ان کی کوششیں مشکور ہوتی رہیں گی سلسلہ
کلام کو جاری رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

۱۸۸۰ء میں نوجوان ڈاکٹر لافیران (فرانس) نے خوردبین کے ذریعہ سے ملیریا کے مریضوں
کے خون کا معاینہ کیا۔ یہ مریض الجزائر میں تھے اور یہ ڈاکٹر وہاں متعین تھا۔ ڈاکٹر نے خون کے سرخ
ذرات میں نہایت چھوٹے جراثیم محسوس کئے۔
پانچ سال بعد ڈاکٹر گولگی نے یہ معلومات حاصل کی کہ یہ جراثیم مختلف قسم کے ہوتے ہیں اور خون کے
ذرات سے نکل کر جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ان کے نتائج اور اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں یعنی

کھڑے ہونے اور لرزہ آنے کا سبب بھی اس نے بیان کیا اور یہ بتایا کہ عموماً مغرب کے وقت ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوخ گولگی اور سیلی کی متفقہ یہ رائے ہوئی کہ ملیریا کی متعدد قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ملیریا کا تعلق اسی قسم کے جراثیم سے ہے یعنی جس طرح جراثیم مختلف النوع ہیں اسی طرح ملیریا بھی مختلف النوع ہے۔ اس جگہ سے جراثیم ملیریا کی بحث شروع ہوگئی۔ اور تحقیقات سے معلوم ہوا کہ یہ قسمیں سب ہمارے ہی خون میں پرورش پاتی ہیں۔ اور پھر ہم کو ہی فنا کرتے ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے سرخ ذرات خون سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور توالد و تناسل کے سلسلہ سے بڑھتے ہیں۔ جب کثرت ہو جاتی ہے تو نظام صحت کو درہم برہم کر دیتے ہیں جب ہم ملیریا میں مبتلا ہوتے ہیں تو ہمارے خون کے لاکھوں ذرات فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے ملیریا کے مریض فقر الدم یعنی قلت خون کا شکار رہتے ہیں۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ یہ جراثیم کہاں سے آتے اور کہاں پیدا ہوتے اور کس طرح ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب۔ ملیریا کا سبب دریافت ہو گیا تو پھر مفکرین نے اس مسئلہ پر غور کیا کہ مریض سے تندرست جسم تک یہ مرض کس طرح منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر لا فیران (فرانس) اور ڈاکٹر کنگ (انگلستان) نے خیال کیا کہ مچھر کے ذریعہ سے یہ جراثیم مریض سے تندرست جسم میں منتقل ہوتے ہیں اور تندرست کو مریض بنا دیتے ہیں۔ لیکن ابھی یہ خیال تحقیق کا مرتبہ نہ حاصل کر سکا تھا۔

سر رے ٹریک نے رائے قائم کی کہ یہ جراثیم مچھر کے معدے میں اتر جاتے ہیں اور پھر جسم انسان میں اس کے معدہ سے منتقل ہوتے ہیں۔ اپنا دور حیات مچھر کے جسم میں پورا کرتے بڑھتے رہتے ہیں اور پھر جسم انسانی میں مچھر کے ذریعہ سے جب وہ انسان کو کاٹتا ہے۔ منتقل ہو جاتے ہیں اس نظریہ کے مطابق جراثیم ملیریا کی زندگی کے دو دور تسلیم کئے جاتے ہیں پہلا دور جب کہ وہ مچھر کے معدے میں ہوتے ہیں دوسرا دور جب کہ وہ انسان کے جسم میں ہوں جب انسان کے جسم میں ہوتے ہیں تو خون کے سرخ ذرات میں بڑھتے رہتے ہیں۔ مچھر کے جسم میں جب ہوتے ہیں تو اس کے معدے میں نشو و نما پاتے ہیں۔ اس نظریہ پر بہت سے دلائل دئے گئے ہیں اور ان دلائل سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ بالکل درست اور قابل تسلیم ہے۔

ڈاکٹر روس نے ان نظریوں اور تحقیقاتوں کے بعد ثابت کیا کہ جراثیم ملیریا جو پرندوں پر اثرانداز ہوتے ہیں وہ بھی مچھر کے ہی معدے میں پرورش پاتے اور ترقی کرتے ہیں ان کی زندگی کے بھی دو دور ہیں پہلا دور جب کہ مچھر کے معدے میں ہوں دوسرا دور جب کہ پرندے کے خون کے اجزا سے اپنی غذا حاصل کریں۔

جس مچھر کے معدے میں یہ جراثیم پرورش پاتے اور زندہ رہتے ہیں اس کی شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک سونڈ مثل ہاتھی کی سونڈ کے ہوتی ہے جس میں وہ جراثیم ہوتے ہیں جو تعدیہ سے پہلے پرندوں کے خون میں پائے جانے والے جراثیم کے مشابہ ہوتے ہیں یہ ہے وہ تحقیقات جو ڈاکٹر رونالڈ روس نے کی تھی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خلط مبحث کرکے انسانی جراثیم ملیریا کا مکتشف ڈاکٹر رونالڈ روس کو نہ مان لیں اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مریض سے تندرست تک ملیریا کا تعدیہ مچھر کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اس لیئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آئندہ تحقیقات کے لیئے ایک بڑا راستہ پیدا کر دیا اور ملیریا کے اسباب تعدیہ پر بحث کرنے کی بہت سی سہولتیں پیدا کر دیں جس حد تک پرندوں کا تعلق ہے ۱۸۹۵ء میں ملیریائی جراثیم کا اکتشاف مکمل ہو چکا تھا مگر انسان میں ملیریا کی پیدائش اور تعدیہ کے اسباب معلوم کرنے کا سہرا دو اٹالین علما، گراسی اور بنیامی کے سر تھا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ تعدیہ انافلس مچھر کے ذریعے سے ہوتا ہے اس حقیقت کی توضیح کی کہ ملیریا کے جراثیم اپنی زندگی کے دونوں دور مچھر کے معدے اور انسان کے خون میں کس طرح پورے کرتے ہیں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ یورپ میں اٹلی ہی وہ جگہ ہے جہاں ملیریا پھیلانے والے مچھر کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

مچھر جس کے جسم میں ملیریا کے جراثیم موجود ہیں
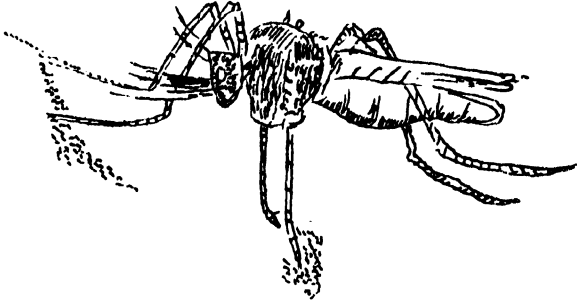
جراثیم ملیریا مچھر کے معدے میں اڑ رہے ہیں

تجربہ ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تجربے اور مشاہدات ہی سے ہم کسی نظریہ کی کامل تصدیق کر سکتے ہیں یا انکار کرتے ہیں۔ دو انگریز علماء نے اس طرف توجہ کی وہ اٹلی سے لندن ایسے مچھر لائے جن کے معدوں میں ملیریا کے جراثیم پرورش پا رہے تھے لندن میں جہاں ملیریا کا نام بھی نہ تھا چند تندرست اشخاص کو ان مچھروں سے کٹوایا۔ جب مدت معینہ گذر گئی ان اشخاص پر ملیریا کا اثر ہوا اور بیمار ہو گئے جب ان کے خون کا معائنہ کیا گیا تو ملیریا کے جراثیم پائے گئے۔ اس تحقیقات کے بعد اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ ملیریا جراثیم کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے اور یہ جراثیم مچھروں کے ذریعہ سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتے ہیں۔ انسان نے کامل ایک چوتھائی صدی اس کی تحقیقات میں گذار دی آخر وہ گوہر مقصود حاصل کر سکا۔ باوجود اس مشاہداتی تصدیق کے غافل انسان اس پر یقین نہیں رکھتا اور بہت لوگ تو اس کو جانتے بھی نہیں کہ یہ کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے ڈاکٹر نذیر خالد کی رائے حاصل کرنے کے بعد دوسرے مشہور ماہر فن ڈاکٹروں سے ملیریا سے بچنے کے طریقے معلوم کئے گئے چنانچہ ڈاکٹر حسنین کی رائے حسب ذیل ہے۔

مچھر سے امراض ذیل کا تعدیہ ہوتا ہے۔

۱۔ ملیریا۔
۲۔ ڈینگو فیور
۳۔ فیل پا (انسان کی پنڈلی اس قدر موٹی ہوتی ہے جیسے ہاتھی کی) ۴۔ زرد بخار

اس کے تعدیہ سے محفوظ رہنے کے حسب ذیل طریقے ہیں۔

۱۔ جہاں تک ہو سکے اس مچھر کو اپنے گھر میں آنے نہ دو ایسے مقامات کو صاف رکھو جہاں عموماً اس کی سکونت رہے اور اس کو پناہ مل سکے۔

۲ جہاں تک ہو سکے مچھر دانی میں سویا کرو اور اس کے کنارے بستر کے نیچے دبے ہوں تا کہ مچھر کسی طرح بھی ان میں داخل نہ ہو سکے۔

۳۔ مچھروں کو جو تمہارے گھر میں ہیں بالکل فنا کر ڈالو۔

۴۔ جہاں تک ہو سکے گھر میں گندہ پانی جمع نہ ہونے دو موری اور نالیاں ہفتہ میں کم سے کم ایک مرتبہ صاف کی جایا کریں پانی اور پانی کے برتن ہمیشہ صاف رہیں اور جہاں مچھر پیدا ہوتے ہوں وہ جگہ عموماً نم دار ہوتی ہے وہاں صفائی کی طرف خاص توجہ رکھی جائے اور ایسی ادویہ چھڑکی جائیں جو مچھر کو فنا کر دیتی ہیں۔

۵۔ اگر مچھر سے کسی طرح بھی حفاظت ممکن نہ ہو تو پھر کونین کو استعمال کرنا چاہیئے۔ ایک یا دو خوراک ڈاکٹر کے مشورے سے ضرور استعمال کرتے رہنا چاہیئے۔

اگر کوئی شخص ملیریا میں مبتلا ہو جائے تو حسب ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے

۱۔ فوراً ڈاکٹر یا طبیب سے رجوع کریں۔

۲۔ شفا رکامل کے بعد بھی تین ماہ تک کونین کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے۔

۳۔ ایسے اشخاص کو جن پر مرض کا ایک دفعہ حملہ ہو چکا ہے دوسرے مریض اشخاص سے دور ہی رکھا جائے تا کہ وہ دوبارہ پھر اس کی زد میں نہ آئیں۔

امید ہے کہ ہمارا مضمون لوگوں کو ملیریا سے محفوظ رکھنے لئے اگر وہ ان ہدایات پر عمل پیرا ہوئے تو ضرور مفید ہوگا۔

دل کی آواز[له]

دل کی آواز ہے یہ درد کی فریاد نہیں (جگر)

سخت حیرت ہے یہ کس بزم میں آیا ہوں میں
اہل محفل کو بڑے غور سے تکتا ہوں میں

ایک صورت نظر آتی نہیں دیکھی بھالی
کون سے لوگ ہیں یہ جن میں کہ تنہا ہوں میں

بیکسی پہ مری روتی ہے مری تنہائی
صفت شمع جب اس بزم میں جلتا ہوں میں

آہ دنیا! تری وسعت میں یہ کیا ہے کہ کوئی
نہ تو میرا ہے شناسا نہ کسی کا ہوں میں

ہم زباں ہے نہ کوئی اور نہ کوئی ہمراز
داستاں اپنی ہواؤں کو سناتا ہوں میں

پھینک دیتا ہوں فضاؤں میں ندائیں دل کی
اپنا دمساز کسی کو نہیں پاتا ہوں میں

کوئی دل سوز نہیں دہر میں اس دل کے سوا
اور اس دل سے بھی کم بخت بھڑکتا ہوں میں

برق کی لہر سی ہے ہر رگ و پے میں ساری
ہمہ تن نبض کے مانند تڑپتا ہوں میں

کچھ عجب حال ہے آشفتہ مزاجی کا مری
کبھی رو دیتا ہوں میں اور کبھی ہنستا ہوں میں

دل دھڑکتا ہے تو کانوں میں یہ آتی ہے صدا
رحم اے شدت احساس کہ پھٹتا ہوں میں

روح گھٹتی ہے جو اس تنگ قفس میں میری
صفت مرغ گرفتار پھڑکتا ہوں میں

سانس لیتا ہوں تو اندر سے نکلتا ہے دھواں
کون سی آگ ہے یہ جس میں کہ جلتا ہوں میں

کبھی تسکیں کے لئے ہے گل و گلشن کی تلاش
کبھی وحشت میں سوئے دشت بھٹکتا ہوں میں

له. اس نظم کے قوافی کی نسبت اہل فن سے یہ عرض ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اس غلطی کو جائز رکھا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے ضمیر سے شرمندہ ہوتا۔ کیا غالب کا یہ شعر یاد دلانے کی ضرورت ہے۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے۔

کوئی دیکھے مری اس وقت کی شوریدہ سری
در و دیوار سے جب سر کو ٹپکتا ہوں میں

دلِ آگاہ بھی کیا چیز ہے اللہ! اللہ!
جب کلی کوئی چٹکتی ہے دہلتا ہوں میں

کون سی آگ ہے یارب نہ جلایا جس نے
روز و شب گو کہ اسی آگ میں جلتا ہوں میں

راکھ کر دی تپشِ عشق نے ساری ہستی
ایک شعلہ کی طرح پھر بھی بھڑکتا ہوں میں

کسی کروٹ کسی پہلو نہیں آرام مجھے
کون سا درد ہے یہ جس سے تڑپتا ہوں میں

چین آتا نہیں اک دم بھی جو دل کو یارب
کس کو اس پاپ کی بستی میں بھٹکتا ہوں میں

وہی بیزار ہیں اس دہر میں میرے دم سے
جن پہ دم دیتا ہوں جان چھڑکتا ہوں میں

چمنِ دہر کے ہر پھول کو چاہا، لیکن
وائے افسوس محبت کو ترستا ہوں میں

پھول پھر پھول ہیں کانٹوں کو بھی چوما میں نے
سب کی آنکھوں میں مگر پھر بھی کھٹکتا ہوں میں

میں کہ فطرت مری خود گل سے بھی نازک تر ہے
مجھ کو حیرت ہے کہ خاروں سے الجھتا ہوں میں

چھینٹ سے جسکی نجس ہو مرا ظرفِ عالی
ایسے پانی میں شب و روز نہاتا ہوں میں

کوئی دم ساز و ہم آہنگ و ہم آواز نہیں
کیوں نہ سر پھوڑ کے مر جاؤں کہ تنہا ہوں میں

آہ آؤں گا ترے دم میں نہ اب اے دنیا
مکر اور فن کو ترے خوب سمجھتا ہوں میں

اوپری دل سے مجھے چاہنے والے لوگو
پیار کہتے ہیں کسے اس کو سمجھتا ہوں میں

ظاہری آنکھ سے اے دیکھنے والو مجھ کو
کہتے ہو قطرۂ ناچیز ہوں، دریا ہوں میں

دیکھ لو غور سے مجھ کو کہ نہ پھر دیکھو گے
قطرۂ اشکِ تمنا ہوں، ڈھلکتا ہوں میں

میں نہ جانوں گا تمھیں کوئی نہ سمجھے گا مجھے
اپنی شوریدگیِ طبع میں یکتا ہوں میں

یوں نہ مایوس ہو تو اے دلِ شوریدہ مزاج
تیری اس شعلہ نوائی کو سمجھتا ہوں میں

کچھ دنوں صبر ابھی کر، مرے پیارے وحشی
تیری محرومیِ تقدیر پہ کڑھتا ہوں میں

روح رہنے کی نہیں قالبِ خاکی میں جلیلؔ
توڑ کر اس کو نکل جائیگی کہتا ہوں میں!

تنقید و تبصرہ

کتب

طلسم زندگی ۔ نقوشِ مانی ۔ کلید عربی ۔ تعلیم زدہ بیوی ۔ تختِ طاؤس ۔ پیغامِ رمضاں ۔

سرمایۂ صحت ۔ آمدن سہی نقلی ۔ موازنۂ صلیب و ہلال

طلسم زندگی | از میاں بشیر احمد بی ۔ اے (اکسن)، بیرسٹرایٹ لا مدیر ہمایوں ۔ مصور تقطیع بڑی ، حجم ۳۰۰ صفحے ، لکھائی چھپائی عمدہ ، کاغذ نہایت نفیس ، جلد کپڑے کی جس پر خوشنما سنہری بیل بوٹے بنے ہیں ۔ قیمت پانچ روپے ۔ ملنے کا پتہ : سید عبداللطیف منیجر رسالہ ہمایوں ، نمبر ۲۳ لارنس روڈ ، لاہور ۔

اردو دانوں میں کون ایسا ہوگا جو میاں بشیر احمد صاحب کے نام سے واقف نہ ہو ۔ آپ ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی اردو ادب کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے ۔ آپ ہی جیسے حضرات کی کوشش سے پنجاب میں اردو کو وہ فروغ حاصل ہوا ہے جو اسے کسی اور صوبے میں یہاں تک کہ صوبۂ متحدہ میں بھی نصیب نہیں ہوا تھا ۔ آپ کا رسالہ ہمایوں برسوں سے زبان و ادب اردو کی اشاعت و ترقی کی سعی میں سرگرم ہے اور علاوہ اور خوبیوں کے اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ رسائل و اخبارات میں جو تو تو میں میں آئے دن ہوا کرتی ہے اس سے کوسوں دور رہتا ہے اور خاموشی سے اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔

"طلسم زندگی" میاں صاحب کے مختصر ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض رسالۂ ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں مگر اب ترمیم و تغیر کے بعد بالکل بدل گئے ہیں بعض بلکہ ایسے ہیں جو اس سے پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے تھے ۔ یہ مضمون چھ حصوں میں حسب ذیل عنوانات کے ماتحت مرتب کئے گئے ہیں ۔

مناظر ، صدائے روح ، آئینۂ دل ، جدوجہد ، سرگوشیاں ، خیالات پریشاں ۔

ہر حصے کا سرورق نہایت خوش نما زنگارنگ نقش و نگار سے آراستہ ہے ۔ مضامین کی تشریح گیارہ خوش نما تصاویر (جن میں سے بعض رنگین بھی ہیں) اور ایک کارٹون سے کی گئی ہے ۔ میاں صاحب کے اسلوب بیان کی ندرت ، بے ساختگی اور شگفتگی سے شائقین ادب ہمایوں کے ذریعے سے خوب واقف ہیں ۔ اتنا کہہ دینا

کافی ہے کہ موجودہ مجموعے کے بیشتر مضامین میں یہ صفات پوری طرح موجود ہیں اور جابجا نیک نفسانہ ظرافت نے اور لطف پیدا کر دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب وہ مقبولیت حاصل کرے گی جس کی وہ مستحق ہے۔

نقوشِ مانی | مجموعہ کلام جناب سید کلب احمد صاحب مانی جائسی۔ تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ حجم ۱۷۶ صفحے۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ، کاغذ عمدہ، قیمت مع محصول ڈاک عا۔ ملنے کا پتہ درج نہیں غالباً دفتر رسالہ تسنیم آگرہ ہوگا۔

حضرت مانی جائسی شعرائے عصر میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ یوں تو آپ کی مشق سخن کوئی پینتیس برس سے جاری ہے مگر بیس برس سے آپ کا کلام اردو کے ممتاز رسالوں اور خاص خاص مشاعروں کے ذریعے جوہر شناسانِ شعر سے خراج تحسین وصول کر رہا ہے۔ مگر ایک تو اس وجہ سے کہ آپ کم کہتے ہیں اور کم سناتے ہیں دوسرے اس وجہ سے کہ آپ کے کلام میں اردو روزمرہ کے ساتھ فارسی ترکیبیں کثرت سے ہوتی ہیں اور آپ کی طبیعت نے پامال مضامین کو چھوڑ کر معنی آفرینی کی راہ اختیار کی ہے آپ کی شہرت خواص تک محدود ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا اور باغِ سخن کے گل چینوں کو وہ پھول جن کی خوشبو سے وہ ایک ایک کرکے لطف اٹھا چکے تھے ایک گلدستے کی شکل میں مرتب ہو کر پہنچ گئے۔ ہم اس مجموعے پر اپنی طرف سے تنقید کرنے کی جگہ کچھ منتخب اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے خود ہی کلام کی خوبیوں کا اندازہ کر لیں۔

ایک نظم "فلسفۂ عشق" کے پہلے دو شعر ہیں:۔

ہے عشق اک سودائے سرپا کاہش روح و رواں — یا لذت دردِ جگر یا حسرت آرامِ جاں

مجموعۂ آلام ہے، سوزِ دلِ ناکام ہے — یا موت کا پیغام ہے یا ہے بلائے جاں ستاں

"کارنامۂ حسن" کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔ اس نظم میں شاعر نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ حسن اپنا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا جس چیز پر عشق کی نظر پڑ جائے وہی حسن بن جاتی ہے۔

یہ حسن یہ اک روشن لَو ہے، نظارہ سوز و پرضو ہے — مگر اس کا نور اک پرتو ہے یعنی روشن بالذات نہیں

ہاں جس سے ہے روشن نام اس کا، جس سے ہے یہ شہرۂ عام اس کا — یوں جس سے بڑھا اکرام اس کا، وہ عشق ہے اور اس کا آئیں

بعض نظموں کے عنوانات یہ ہیں: رازِ بقا، سوگوارِ آرزو، پیامِ بہار، دیارِ دوست، کشمکش امید، فریبِ وفا، آہِ نارسا، خاکسترِ مشتعل۔

مناظرۂ حسن و عشق بڑے معرکے کی نظم ہے۔ اس میں وہی "اضافیتِ حسن" کی بحث ہے مگر خشک

منطقی انداز میں نہیں بلکہ دلکش اور دلنشیں شاعرانہ رنگ میں۔

غزلوں کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

خامشی اچھا ہے شیوہ پیکر تصویر کا — یعنی کیا کہنا کسی کی شوخئ تحریر کا

اثر دل، دو نوجوان کی نگاہ اولیں میں تھا — الٰہی منتقل ہو جائے اب وہ میری آنسو میں

یہ میں نے کب کہا تھا آپ کے ابرو نہیں قاتل — مجھے کچھ شک اگر تھا بھی تو دست نازنیں پر تھا

گلہ بے جا بھی کرتا ہوں کہ اس جلوے کا شائق ہوں — ندامت سے جو اک دن آپ کے روئے حسیں پر تھا

عمر تو صرف ہو چکی قید قفس میں باغباں — چھوڑ دے اب کہ مر رہوں ایک بہار دیکھ کر

پس نگاہ تو تم نے پہنچایا پیام دلبری — کچھ دہان تنگ سے ان کو بھی فرمانے تو دو

کانٹے ہی کانٹے چبھیں بستر یہ مانی تو سہی — آرزو کا ایک کانٹا دل میں چبھ جانے تو دو

زندگی سے موت تک ہے فاصلہ اک سانس کا — پھر بھی کیا معلوم کتنی دور ہیں منزل سے ہم

آہ بن جاتی ہے نشیمن سوز — برق جب جلوہ گر نہیں ہوتی

وہ ابھی ڈرتے ہیں ذکر نالۂ شبگیر سے — کیونکہ ناواقف ہیں ضبط آہ کی تاثیر سے

کچھ نہیں ماجرائے طور و کلیم — دل تھا یارائے دید لا نہ سکا

یاد بھی تو نے محو کی میری　　　　میں ترا بھولنا بھلا نہ سکا

بندہ آئینۂ خدائی ہے　　　　سجدہ نشانِ جبیں مٹا نہ سکا

کلید عربی پہلا حصہ | از جناب خلیل احمد صاحب لکھنوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰ صفحات، طباعت و کتابت اور کاغذ معمولی، قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی یا دفتر رسالہ پیشوا دہلی۔

جناب مولانا قاری خلیل احمد صاحب بچوں کو عربی زبان کی تعلیم کے لئے جدید اصول پر چھوٹی چھوٹی ریڈروں کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں آسان اور مفرد جملوں کی مشق کرائی ہے۔ آخر میں عربی افعال کی گردان کا ایک نقشہ بھی دے دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ بچوں کے لئے مفید ہوگا۔

تعلیم زدہ بیوی | از جناب فضل حق قریشی دہلوی، تقطیع جیبی، ضخامت ۵۰ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو، دہلی۔

یہ ایک مزاحیہ ڈراما ہے اور اس کا مقصد عورتوں کی غلط تعلیم و تربیت کے نتائج سے آگاہ کرنا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ عورت میں محض غلط تعلیم و تربیت کے اثر سے کیسی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے مڈل فیل شوہر سے کیا نامناسب برتاؤ کرتی ہے اور آزادی و تفوق کے زعم باطل میں کیا کیا گل کھلاتی ہے۔ آخر ایک اچانک حادثہ اس کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ تمام پچھلی باتیں سراب معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے مڈل فیل میاں کے قدموں پر گر کر معافی مانگتی ہے۔ ڈراما اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور کچھ دن ہوئے روشن تھیٹر دہلی میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے۔

تخت طاؤس | از جناب مولوی محمد عبداللطیف خاں صاحب کشتہ قادری، منشی فاضل ڈائرکٹر زبان پرشین، بی۔ ایل۔ ای مؤلف "حیات عزیز"، ضخامت ۱۶۴ صفحات، کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا، تقطیع بڑی، قیمت عہ۔ غالباً مؤلف سے مین پوری کے پتے پر مل سکے گی۔

اس کتاب میں جناب مولوی عبداللطیف صاحب کشتہ نے مشہور تخت طاؤس کے متعلق تاریخی

حالات جمع کر دئے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سے یورپین مورخین کے بیانات کی تردید کی اور بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور بقول جناب تبصرہ نگار بہت سے تاریخی انکشافات کئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں ۴۰ صفحات میں جناب ظہیر الدین صاحب علوی وکیل نے تبصرہ کو تعارف لکھا ہے جس میں بجائے کتاب پر تبصرے کے جو ایک تبصرہ نگار کا اصلی مقصد ہونا چاہئے زیادہ تر جناب مصنف کے حالات پر نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں بحث کی گئی ہے۔ پھر خود جناب مصنف کا مقدمہ ہے جو ۱۶ صفحات کو محیط ہے۔ اس میں انھوں نے اس تصنیف کی وجوہ لکھی ہیں۔ مغلیہ عہد کی تمدنی ترقیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کوہ نور ہیرے کے متعلق بعض مغربی مصنفوں کے بیانات کی تنقید کی ہے اور اس کتاب کے لئے مواد فراہم کرنے میں جو دقتیں پیش آئی ہیں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ صفحات میں کتب حوالہ کی فہرست ہے۔ اب اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس میں مختصر سی تمہید کے بعد شاہ جہاں کے مختصر حالات ہیں۔ پھر تخت طاؤس کے متعلق حالات و تاریخی انکشافات ہیں۔ اس سلسلے میں بھی بعض غیر ضروری چیزیں بیچ بیچ میں آگئی ہیں۔ کتاب میں سب سے زیادہ اہم چیز اس کے ذیلی حواشی ہیں۔ مصنف نے اس میں دل کھول کر اپنی محنت اور وقت صرف کیا ہے۔ اکثر مقامات پر ایک ایک نوٹ تین تین صفحوں میں سمایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب کشتہ نے اس سلسلے میں بہت مفید معلومات یکجا کر دی ہیں اگرچہ بعض مقامات پر یہ حاشیے اصل کتاب کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں اور ایک دو سطروں میں کام چل سکتا تھا۔ بہرحال اصل کتاب تقریباً ۳۰، ۴۰ صفحوں میں آئی ہے اور باقی صفحات تبصرہ، مقدمہ اور ذیلی حواشی کی نذر ہو گئے ہیں۔ تاہم جناب کشتہ کی کوششیں قابل قدر ہیں اور امید ہے کہ تاریخ کے طالب علم اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ کتاب میں تخت طاؤس کی دو تین تصویریں بھی ہیں۔ جلد بھی خوبصورت ہے۔

پیغام رمضان | از جناب عبد المجید قریشی۔ ضخامت ۴۴ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط، قیمت ۳ر۔ ملنے کا پتہ: دفتر اخبار ایمان، پٹی ضلع لاہور۔

جناب مؤلف اس کتاب کا مقصد دیباچے میں خود ہی تحریر فرماتے ہیں:-

"میں نے اس رسالے میں صوم رمضاں کی علمی، اقتصادی، تنظیمی اور سیاسی حیثیت ایک زندہ اور عملی تحریک ایک نظام عمل اور ایک قرارداد قانون کے طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور بتایا ہے

کہ مسلمان رمضان کو اپنی زندگی کے عملی پروگرام کے ساتھ جوڑ کر اس قدر عظیم اور بے مثال عملی فوائد حاصل کر سکتے ہیں جو کسی تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور اصلاحی پروگرام سے حاصل نہیں ہو سکتے۔"

رمضان شریف کے فضائل واحکام کے سلسلے میں اردو میں بہت سے رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر ہمارا خیال ہے کہ "پیغام رمضان" ان سب سے الگ اور نہایت مفید و کارآمد کتاب ہے۔ زبان صاف اور طرز بیان دلچسپ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہر مسلمان اس رسالے کو خرید کر سرمۂ بصیرت بنائے گا۔ آخر میں جناب قریشی نے اپنے اس ارادے کا اعلان کیا ہے کہ آیندہ سے تحریک سیرۃ النبی کے ساتھ ساتھ تحریک رمضان وقرآن کے لئے جدوجہد کا بھی آغاز کیا جائے گا۔ خدا انھیں اور سیرت کمیٹی کو اپنے اس ارادے میں کامیاب کرے۔

سرمایۂ صحت | از حکیم مولوی حافظ یوسف حسن خاں سوری، ضخامت ۲۸ صفحے، تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$، کتابت و طباعت متوسط، کاغذ معمولی، قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ: بابو محمد الیاس خاں صاحب سوری مکان مولوی یوسف حسن خاں سوری بہار شریف، بابو وجاہت حسین خاں صاحب محلہ سرار پور گیا۔

اردو زبان میں اب تک صحت وتندرستی کے موضوع پر کوئی ایسی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہو۔ جناب حکیم مولوی یوسف حسن خاں صاحب نے یہ مختصر سا رسالہ لکھ کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ رسالے کی زبان نہایت آسان اور بچوں کے لئے مناسب ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ عام مقبولیت حاصل کرے گا۔

آمدن سی لفظی | از جناب ابوالمحاسن متین، ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ معمولی قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ: جناب غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چار کمان حیدرآباد۔

جناب ابوالمحاسن متین صاحب نے آمدنامہ فارسی کو نئی ترتیب اور جدید طرز پر لکھا ہے۔ علاوہ اس کے شروع میں طریقۂ تدریس کے متعلق کچھ ہدایات لکھی ہیں اور کتاب کے آخر میں صرف ونحو کے مختصر سے قواعد بھی تحریر کئے ہیں۔

موازنۂ صلیب وہلال | از جناب نکہت شاہجہاں پوری بی۔ اے آنرز۔ حجم ۲۳۶ صفحات، تقطیع $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ ،

کتابت و طباعت متوسط، کاغذ دبیز، قیمت عہ/ ملنے کا پتہ صدیق بک ڈپو لکھنؤ یا الناظر بک ایجنسی لکھنؤ ۔

جناب نکہت نے اس کتاب میں موجودہ مغربی یا عیسائی تمدن سے مسلمانوں کی گذشتہ ترقیوں کا تقابل کیا ہے۔ آج کل کے مغرب زدہ نوجوان یورپ کی تمدنی ترقیوں سے مسحور ہیں اور اس امر سے بڑی حد تک ناواقف ہیں کہ ان کے اسلاف نے بھی کچھ نہ کچھ کارنامے انجام دئے ہیں اور موجودہ ترقیوں کی اساس انھیں کی تمدنی کوششیں ہیں ۔

شروع میں جناب مؤلف نے آٹھ صفحوں میں فہرست مطالب کے عنوان سے مضامین کی فہرست دی ہے ۔ پھر ان کی تصویر اور "خطاب با نوجوانان ملت" کے عنوان سے ایک فارسی نظم ہے ۔ اس کے بعد مقدمہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے ۔ کتاب مختلف ابواب میں منقسم ہے ۔ موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں : سرگذشت صلیب و ہلال، اسلامی عظمت وجلال، معمورۂ حسن وعشق، موسیقی اور اسلام، یورپ کی ادبی روح اور اسلام، اسلامی علوم و فنون، اسلامی سائنس وطب یورپ میں، اسلام کی تجارت اور یورپ کی تمدنی تربیت، مصوری اور اسلام، اسلام اور تربیت یہود ۔ پہلے باب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں یورپ جہالت و وحشت کی گمراہیوں میں مبتلا تھا اور اس کے مقابلے میں اندلس کے مسلمانوں کی ترقی نصف النہار پر تھی اور یورپ میں اسی راہ سے تہذیب و تمدن کی کرنیں پہنچیں ۔ دوسرے اور تیسرے باب میں اندلس کے متمدن شہروں کا تذکرہ ہے ۔ ان کی شان دار عمارتوں، باغوں، شاہی محلات اور محکمۂ انتظام کی تفصیل ہے ۔ اسی سلسلے میں عورتوں کی آزادی، ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے ۔ چوتھے باب میں اس الزام کی واقعات و دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے کہ مسلمان موسیقی کی ترقی میں حائل ہوئے ۔ پانچویں باب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مغربی ادب بڑی حد تک اسلامی ادب سے متاثر ہے ۔ شروع میں بہت سی عربی حکایتیں مغربی زبانوں میں ترجمہ کی گئیں یا ان کو سامنے رکھ کر قصے لکھے گئے ۔ فرانس کے بہت سے گیت ہو بہو عربی جذبات کی نقل ہیں ۔ فارسی ادب و شعر نے بھی مغربی ادب پر بہت اثر ڈالا ۔ چھٹے باب میں اسلامی علوم و فنون کا تذکرہ ہے ۔ اس میں مؤلف نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے شاعرانہ ذوق اور ان کی علمی وادبی سرگرمیوں کا حال لکھا ہے ۔ اور مشہور یونیورسٹیوں، کتب خانوں اور علمی اکادمیوں کے نام گنائے ہیں ۔ صرف قرطبہ میں آٹھ ہزار پبلک اسکول تھے جن میں ہر خطے اور ہر قوم کے لوگ بلا تفریق مذہب و ملت تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے تمام اخراجات حکومت کے ذمے ہوتے تھے ۔ پھر مسلمان علما کی علمی سرگرمیوں اور ان کی تصنیف و تالیف کا ذکر ہے اور فلسفہ، سائنس، طب، جغرافیے میں ان کی انتہائی ترقیوں کی تفصیل ہے ۔

بقیہ ابواب بھی اسی قسم کی علمی تحقیقات سے لبریز ہیں۔ کتاب میں زیادہ تر موازنہ اندلس کے حالات سے کیا گیا ہے اس لئے کہ وہی مغربی قوموں سے زیادہ قریب ہے اور اسی کے تہذیب و تمدن کا اثر مغرب پر براہ راست پڑا۔ مؤلف نے ان تاریخی حقائق کے ثبوت میں اکثر و بیشتر خود مغربی مصنفین کے بیانات پیش کئے ہیں اور شروع سے آخر تک اس کا التزام رکھا ہے۔ کتاب کی تالیف میں مصنف نے نہایت محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور نہایت قیمتی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ زبان نہایت صاف و سلیس اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔

رسائل

ہونہار سالگرہ نمبر۔ دستور

ہونہار سالگرہ نمبر | ایڈیٹر فیاض حسین صاحب نسیم (جامعی)، چندہ سالانہ تین روپے، فی پرچہ ۴/، اس پرچہ کی قیمت ۹/۔ مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ جناب فیاض حسین صاحب نسیم (جامعی) چوتھے سے نویں درجے تک کے طلبا کے لئے نکالتے ہیں اور نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ مضامین میں خاصا تنوع ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہر ماہ فوٹو بلاک اور دستی تصویروں کا بھی انتظام ہے۔ زیر نظر نمبر کی ضخامت ۰۰ ا صفحات ہے۔ اس میں قصے کہانیاں، مضامین نظم و نثر، صنعت و حرفت، کشیدہ کاری، معمے، لطیفے، فوٹو بلاک کی اور دستی تصاویر اور کارٹون غرض بچوں اور بچیوں کی دلچسپی اور تفریح کے لئے ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ ٹائٹل بہت خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے صرف ۹/۔

دستور ہفتہ وار ہے | ایڈیٹر آزاد دہلوی، ضخامت ۲۴ صفحات تقطیع الہلال کی قیمت سالانہ ے/، فی پرچہ ۲/، مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ تین مہینے سے نکل رہا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ برابر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جناب آزاد صاحب اسے بڑی سنجیدگی اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ علمی، ادبی، تفریحی مضامین، نظمیں، افسانے غرض ایک ہفتہ وار پرچے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہوتی ہیں۔ قومی اور ملکی معاملات پر اظہار خیال بھی نہایت سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ تقریباً ۸، ۱۰ صفحے ہر پرچے میں فوٹو بلاک کی تصاویر کے بھی ہوتے ہیں۔

ترتیب کی ذمہ داری ہندوستانیوں کی نا اہلی کی وجہ سے جب تک برطانوی حکومت پر ہے اس وقت تک "تحفظات" اختیارات خصوصی اور اختیارات تمیزی کی تلوار اسی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی اس سے نجات اسی وقت ملے گی جب ہندوستان خود اپنے آئندہ دستور اساسی کی تشکیل کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ممالک غیر

انگلستان، امریکہ اور معیشت عالم برطانیہ کے وزیر اعظم اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر میں جو گفتگو آج کل ہو رہی ہے اس کے نتائج پر ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ دسمبر میں جب انگلستان نے امریکہ کو قرضہ کی ایک قسط ادا کی تھی اس وقت ایک تحریر اس مضمون کی بھیجی تھی کہ اب ان اقساط کا ادا کرنا ممکن نہ ہوگا اور خود قرض خواہ کے لئے ان کی ادائیگی بہت مضر ثابت ہوگی۔ اس کا جو جواب امریکہ نے ۷ دسمبر کو دیا تھا اس میں یہ بات تسلیم کی تھی کہ "موجودہ کساد بازاری کے زمانے میں کہ ہر چیز کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے اس قرض کا بوجھ قرض داروں کے لئے بہت بڑھ گیا ہے[۵]" اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ "اس مسئلہ کو دنیا کی معاشی حالت کے روبراہ لانے سے بہت گہرا تعلق ہے جس سے برطانیہ اور امریکہ دونوں کے اہم اغراض وابستہ ہیں۔" اس تحریر میں یہ بھی جتا دیا گیا تھا کہ صدر جمہوریہ آمادہ ہیں کہ "برطانوی حکومت سے مل کر سارے معاملے پر از سر نو غور کریں اور زر رائج اور شرح مبادلہ کو استوار بنانے، تجارت کو فروغ دینے اور قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر سوچیں" لیکن نیت یہ تھی کہ اس غور و جستجو کے معنی یہ نہیں کہ قرضہ بالکل

---

[۵] ناظرین آسانی سے اس کو سمجھ لیں گے کہ اجناس کی قیمت گھٹنے سے قرض دار کا بوجھ کیسے بڑھ جاتا ہے۔ اجناس کی قیمت گھٹنے کے معنی ہیں کہ زر کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ جس چیز کے لئے پہلے زیادہ روپیہ دینا ہوتا تھا اب کم روپے سے وہی چیز حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر کسی کسان پر دس روپے قرض ہوں اور گیہوں کا نرخ ۸ سیر کا ہو تو وہ یہ قرض دو من گیہوں بیچ کر ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر نرخ ۲۰ سیر ہو جائے تو اسی قرض کی واپسی کے لئے اسے پانچ من گیہوں بیچنے پڑیں گے۔ اس لئے قیمتوں کے گھٹنے سے قرض دار کا بوجھ بڑھتا اور قیمتوں کے بڑھنے سے اس کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔

معاف کردیا جائے بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ امریکی مال کے لئے منڈیاں پیدا کرکے اور اسلحہ کے مجنونانہ مقابلے کو بند کرکے اس کی تلافی کی جائے۔

امریکہ کے سابق صدر اور موجودہ صدر میں آئندہ طرز عمل کے متعلق اختلاف تھا۔ مسٹر ہوور چاہتے تھے کہ قرضہ جنگ اور دوسرے معاشی مسائل کو اسلحہ کے مسئلے سے وابستہ کردیں، مسٹر روزولٹ اسے مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ اب تمام مسائل پر کھلے دل سے گفتگو ہوگی اور ممکن ہے مسٹر میکڈانلڈ اور مسٹر روزولٹ کا تدبر اس معاشی گتھی کو سلجھانے کی کوئی تدبیر نکال سکے۔ دنیا کا بڑا حصہ چاہتا ہے کہ قرض کا یہ قصہ ختم ہی ہو تو اچھا۔ ذیل کے اعداد سے کچھ اندازہ ہوگا کہ قرض دار اب کہاں تک اس قرض کے بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ جب پہلی قسط واجب الادا ہوئی تھی تو مندرجہ ذیل قرض داروں نے ادائگی سے معذرت کی:۔

۱۔ فرانس ۱۹،۲۶۱،۴۳۲،۵۰ ڈالر

۲۔ بلجیم ۲،۱۲۵،۰۰۰،۰۰ ڈالر

۳۔ پولینڈ ۳،۳۰۲،۹۸۰،۰۰ ڈالر

۴۔ ہنگری ۴۰،۷۲۹،۳۵ ڈالر

۵۔ استھونیا ۲۶۶،۳۷۰،۰۰ ڈالر

لیکن کیا امریکہ اپنا قرضہ معاف کردے گا؟ اس کے جواب کے لئے ذرا امریکہ کی موجودہ حالت پر نظر کرنی چاہئے۔ خود مسٹر روزولٹ صدر جمہوریہ کا اندازہ ہے کہ ان کے ملک میں بے کاروں اور بے روزگاروں کی تعداد ۱۲ ملین ہے! قومی آمدنی میں تین سال کے اندر ۴۰ ہزار ملین ڈالر کی یعنی ۵۰ فی صدی کی کمی ہوگئی ہے!! پچھلے ڈھائی برس میں سرکاری میزانیے میں ۵۳۰۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہوچکا ہے اور اس وقت ۱۲۰ ملین ماہانہ کے حساب سے اس خسارے میں اضافہ ہورہا ہے!! شکاگو اور فلڈلفیا جیسے بلدیے دیوالہ نکال چکے ہیں۔ غیر منقولہ جائداد پر قرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ اندازہ کرنا مشکل ہے: زرعی زمینیں رہن رکھ رکھ کر کسان ۱۲ ہزار ملین ڈالر سے کچھ زیادہ ہی قرض لے چکے ہیں اور ان کے مال کی قیمت اتنی گر گئی ہے کہ اس قرض کا بوجھ ۳۰ ہزار ملین ڈالر کے قرض کے برابر ہے۔ سرکاری امداد کے باوجود سنہ ۱۹۳۲ء میں ۱۴۰۰ بنکوں نے دیوالے نکالے اور اگر حکومت نے تقریباً ۲۰ کروڑ ڈالر بنکوں کی مدد کے لئے نہ نکالے ہوتے تو نہ جانے اور کتنے بنکوں کا یہی حشر ہوتا۔

ان ناساعد حالات نے عام طور پر تو اب تک امریکہ کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ باقی دنیا کے

جھگڑوں سے الگ تھلگ رہ کر اپنے خانگی مصائب کے دور کرنے کی تدبیر کرے اور اس خیال نے معیشت عالم سے ایک بیزاری سی پیدا کر دی ہے جو نہ دنیا کے لئے مفید ہے نہ خود امریکہ کے لئے۔ ان معاشی معاملات پر امریکہ کی رائے عامہ متحد نہیں ہے۔ بنک والوں اور معاشی ماہروں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو چاہتا ہے کہ امریکہ کو اب یوں روٹھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ قرض پر اصرار کرنے سے اگر تجارت ختم ہوئی جاتی ہے اور دنیا کی معاشی حالت کے سدھرنے کا امکان نہیں رہتا جس کے بغیر امریکہ کی حالت کا درست ہوتا بھی محال سا ہے تو پھر اچھا ہے قرض کو ہی ختم کیا جائے۔ لیکن اس گروہ کا اثر امریکہ میں کچھ زیادہ نہیں۔

دوسرا گروہ جو خاصا با اثر ہے اور اہل سیاست نیز جرائد میں جس کے بہت سے حامی ہیں وہ کہتا ہے کہ دنیا کی زبوں حالی سے چشم پوشی کرنا نہ صحیح ہے نہ مفید۔ دوسرے ممالک کی بات ماننی چاہئے اور قرض داروں کا بار ہلکا کرنا چاہئے مگر اس کے عوض کچھ لینا بھی چاہئے۔ یہ لوگ "دے و انگبین" کی لاگ چاہتے ہیں، تاجر ہیں، سودا کرتے ہیں۔ اس کے سب سے بڑے نمائندے سابق صدر ہوور ہیں۔ اپنی آخری تقریروں میں سے ایک میں انھوں نے صاف صاف فرمایا تھا کہ "میں قرضوں کو یکسر منسوخ کرنے کا حامی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ امریکہ قرضے کی نقد واپسی کے معاملے میں جو بھی مزید قربانی کرے اس کی تلافی کسی اور طریقے سے دنیا کی منڈیوں میں ہونی چاہئے۔"

لیکن عام امریکن شہری قرض معاف کرنے کی تجویز کو تو سننا ہی نہیں چاہتا اور اس سودے کے بھی خلاف ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور یورپ کے شاطر سیاسی ہمیں چل دے جائیں گے۔ قرض قرض ہے اور ادا ہونا چاہئے۔ یہی گروہ تعداد میں سب سے زیادہ ہے اور اگر جدید صدر معاشی حالات میں خوشگوار تبدیلی کے وسائل کی تلاش میں ہوں تو اسی اکثریت کو سمجھانا سب سے زیادہ دشوار کام ہوگا۔ مگر دنیا کی معاشی زبوں حالی اور خود امریکہ کی معاشی حالت دونوں انھیں مجبور کریں گی کہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیں۔ اس لئے کہ یہ بات ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ اگر اس قرض کے معاملے میں امریکہ نے دوسرے ممالک کے ساتھ رعایت نہ کی تو آج نہیں تو کل ساری دنیا کا معاشی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ امریکہ بادل ناخواستہ قرض داروں کے لئے بہت کچھ رعایتیں کرے گا، اپنے لئے کچھ رعایتیں منڈیوں میں حاصل کرے گا، پونڈ اور ڈالر میں غالباً کوئی شرح مبادلہ مستقل مقرر کر دی جائے گی، زر رائج کی مقدار بڑھانے کیلئے قیمتوں کو بڑھانے کی تدابیر کی جائیں گی، چاندی کو غالباً پھر نظام زر میں دخل ہوگا، اور انگلستان اور امریکہ

کی متحدہ مساعی آئندہ عالمی معاشی کانفرنس میں معیشت عالم کو بہت کچھ سہارا دے سکیں گی۔

ہٹلر کا پروگرام ہٹلر کے انتخاب کے متعلق ہم کسی پچھلی اشاعت میں لکھ چکے ہیں۔ اس زمانے میں اخبارات میں جرمنی کے متعلق بہت کچھ شائع ہوتا رہا۔ یہودیوں پر جو مظالم ہوئے اور ہو رہے ہیں ان کا حال سن کر ساری دنیا حیرت میں رہ گئی۔ یہودیوں نے ان مظالم کے خلاف جو بین الاقوامی تو تیں منظم کرنا چاہیں ان کا حشر بھی اچھا نہ ہوا اور ہٹلر کی جماعت نے یہودیوں کے مقاطعے کا ایسا سخت پروگرام پیش کیا کہ بالآخر یہودیوں نے گفت و شنید سے معاملے کو طے کرنا پسند کیا۔ ہٹلر کی پارٹی نے ان مظالم سے اپنے بے شمار وعدوں میں سے کم سے کم ایک تو پورا کر کے دکھایا اور کچھ عرصے کے لئے اپنے ساتھیوں کو مطمئن کر دیا۔ ضمناً یہ فائدہ بھی ہوا کہ یہودیوں سے سمجھوتے کے معاوضے میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر کے پارٹی کی مالی حالت کو زیادہ مستحکم کر لیا گیا تاکہ اگر پروگرام کے دوسرے حصوں کے نفاذ میں سرمایہ داروں سے اختلافات پیدا ہوں تو پارٹی کو روپے کی کمی بے بس یا کمزور نہ کر سکے۔

ہٹلر نے سیاسی زندگی میں اس تیزی سے ترقی کی ہے کہ ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے اور ہر شخص اسے اپنے مذاق کے موافق سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر اس کے مقاصد کو اس کی زبان ہی سے ادا کیا جائے تو بہتر ہے۔ صدر اعظم ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد ہٹلر نے ایک بڑی معرکۃ الآرا تقریر میں اپنی حکومت کے مقاصد ۱۲ دفعات میں یوں بیان کئے تھے:-

(۱) ہمارے پروگرام کی پہلی دفعہ تو یہ ہے کہ ہم جھوٹ نہیں بولنا چاہتے! یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قوم کے سامنے آ کر بے سوچے سمجھے وعدے کرنے سے احتراز کیا ہے۔ تم میں سے کوئی میرے خلاف یہ شہادت نہیں دے سکتا کہ میں نے کبھی کہا ہے کہ ہماری قوم کی تعمیر نو صرف چند دنوں کا کام ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور یہی کہتا ہوں کہ جرمن قوم کی حیات نو کا مسئلہ در اصل قوم کی داخلی قوت اور صحت کا مسئلہ ہے۔ جس طرح میں نے تقریباً ۱۴ برس اس تحریک کے لئے کام کیا ہے، "یکسوئی اور استقلال کے ساتھ، ساتھیوں سے ان ۱۲ ملین تک پہنچنے کے لئے"، اسی طرح اب ہم سب مل کر کام کریں گے جرمن قوم کو پھر سے زندہ کرنے کا۔ اور جس طرح آج مجھے اور میری تحریک کو جرمن سلطنت کی قیادت تفویض ہوئی ہے اسی طرح ہم اس جرمن سلطنت کو پھر زندگی اور بڑائی دے کر دنیا کی قیادت دلائیں گے اور اس مقصد سے کوئی چیز ہمیں

باز نہ رکھ سکے گی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ میں تم سے یہ وعدہ نہیں کرتا کہ قوم کی تعمیر نو کا یہ کام خود بخود ہو جائے گا۔ ہم تو اس کے لئے کام کریں گے ہی لیکن ساری قوم کو اس میں ہمارا ہاتھ بٹانا ہوگا۔ یہ کبھی یقین نہ کرنا کہ آزادی، خوش حالی، زندگی ہمیں یکایک آسمان سے مرحمت ہو جائیں گی۔ ان سب کی جڑ اپنا ارادہ اور اپنی محنت ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس سارے کام میں ہمارے لئے ایک حقیقت، ایک عقیدہ دلیل راہ ہوگا اور وہ یہ کہ کبھی پرائی مدد پر بھروسا نہ کرنا، کسی ایسے کی مدد پر جو ہماری اپنی قوم سے نہ ہو۔ جرمن قوم کا مستقبل بس خود ہم پر منحصر ہے۔ خود اپنے کام سے، خود اپنی مشقت سے، خود اپنے استقلال سے ہم ابھریں گے جس طرح دوسری قومیں اور ایک دفعہ خود جرمن قوم خود ابھری تھی۔

(۴) چوتھی بات یہ کہ زندگی کے آئین ہمیشہ ایک سے رہتے ہیں چنانچہ ہم اپنی قوم کی تعمیر نو کا کام بے جان نظریوں سے نہیں لیں گے جو کسی پردیسی کی کھوپڑی سے نکلے ہوں بلکہ ان ازلی قوانین کے مطابق اس کام کو کریں گے جو تجربہ اور تاریخ ہمیں بتلاتے ہیں اور جنھیں ہم خوب جانتے ہیں۔

(۵) اور ان قوانین کو ہم ایک پانچویں دفعہ میں یوں پیش کرتے ہیں: ہماری زندگی کی اساس دو عناصر پر ہے جن سے کوئی ہمیں محروم نہیں کر سکتا۔ نسل اور زمین، قوم اور ملک یہی دو چیزیں ہیں جن سے ہم قوت حاصل کریں گے اور انھیں پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھیں گے۔

(۶) ہمارے جہاد کا مقصد اسی پانچویں دفعہ سے مشتق ہے یعنی اس قوم اور اس ملک کا قیام و بقا۔ اس قوم کی بقا اس علم کی بنا پر بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے۔ ہم محض تخیلات کے لئے زندہ نہیں رہتے، محض نظریوں کے لئے نہیں، سیاسی جماعتوں کے دور از کار پروگراموں کے لئے نہیں۔ نہیں، ہم تو جیتے ہیں اور مرتے ہیں جرمن قوم کے لئے، اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے، مستقبل میں اس کے جہاد حیات کی کامیابی کے لئے اور ہمیں یقین ہے کہ اسی طریقے سے ہم اس چیز میں بھی مدد دے سکتے ہیں جسے دوسرے اتنا پیش پیش رکھتے ہیں یعنی امن عالم، کہ اس کے لئے پہلے مضبوط قوموں کی ضرورت ہے جو اس کی حفاظت کر سکیں! تمدن عالم، کہ اس کی بنیاد قوموں کے تمدن ہی پر ہو سکتی ہے! اور ایک عالمی معیشت، کہ اس کا تصور بھی اسی وقت ممکن ہے کہ قومی قومی معیشتیں اس کی حامل ہوں۔ ہم اپنی قوم سے شروع کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کی ترتیب نو میں مدد دے سکتے ہیں، کہ نظم و ترتیب عالم کی عمارت میں ہم خود ایک مضبوط تیم بنیں۔

(۷) ہاں، ایک بات اور۔ وہ یہ کہ چونکہ ہم اپنی قوم کی بقا اور اس کے جہاد زندگی کو کامیاب بنانا اپنا مقصد جانتے ہیں لہذا ہمیں اسباب زوال کو ہٹانا ہوگا اور قوم کے مختلف طبقوں میں صلح کرانی ہوگی، اور یہ کام ۶ ہفتوں میں، یا ۶ مہینوں میں نہیں ہو سکتا جب ۷۰ برس تک ایسے انتشار کی کوششیں جاری رہ چکی ہوں۔ ہاں، یہ مقصد ہے جس سے ہم کبھی روگردانی نہ کریں گے، عملاً اس نئی جمعیت کی تعمیر میں کوشاں رہیں گے اور انتشار کے اسباب کو روکتے رہیں گے۔

(۸) ان طبقوں میں صلح کرا کر ہم آگے بڑھیں گے اور اس متحدہ قوم کو اس کی قوت کے اصلی منبع تک پہنچائیں گے اور تعلیم کے ذریعے اپنے بچوں کے ذہن میں خدا پر یقین اور اپنی قوم پر اعتماد پیدا کرائیں گے۔

(۹) پھر ہم آگے بڑھیں گے اور اس قوم کی عمارت جرمن کسان کے کندھوں پر کھڑی کریں گے کہ کسان ہی ہر قومی زندگی کی بنیاد ہے۔ میں جو جرمنی کے مستقبل کے لئے جہاد کر رہا ہوں تو مجھے لازماً جرمن زمین اور جرمن کسان کے لئے جہاد کرنا ہے۔ یہی ہمارے شہروں کی آبادی کے لئے آدمی دیتا ہے۔ یہی صدیوں سے ہماری قوت کا منبع ہے اور اس کی بقا لازمی ہے۔

(۱۰) اس کے بعد ہماری قومی زندگی کا دوسرا اہم عنصر ہمارے مزدور ہیں۔ وہ مزدور جو آئندہ اس قوم میں اجنبی کی طرح نہ رہیں گے جنھیں قوم پھر اپنے میں لے لے گی اور جن کے لئے سب دروازے کھل جائیں گے کہ وہ جرمن قوم کے مجاہد کی حیثیت سے جرمن جمعیۃ قومی میں شریک ہو سکیں۔

(۱۱) ہم جرمن قوم کی قوت ذہنی کو نشو و نما کے مواقع دیں گے، شخصیت کی قدر بڑھائیں گے اور فرد کی قوت تخلیق کو پھر اس کا ازلی حق دیں گے، زوال آمادہ جمہوریت کے مظاہر کا خاتمہ کر دیں گے اور ان کی جگہ اس حقیقت کو دیں گے کہ ہر بڑی چیز صرف انفرادی شخصیت کی قوت سے پوری ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جسے باقی رکھنا ہے پھر انفرادی شخصیت کے سپرد کرنی چاہئے۔

(۱۲) اس پارلیمنٹی جمہوری نظام کی مخالفت سے ہمارے پروگرام کی بارہویں دفعہ نکلتی ہے یعنی اپنی قومی زندگی کو صاف ستھرا بنانا:

زندگی کے ہر شعبے میں ستھرائی، انتظام ملکی میں صفائی، سیاسی زندگی میں ستھرائی، تمدنی زندگی میں ستھرائی۔ ہم جرمنی کی عزت کو پھر سے قائم کریں گے۔ اپنے دلوں میں حریت کا جذبہ پیوست کریں گے، اپنی قوم کو حقیقی جرمن تمدن سے بہرہ یاب کریں گے، حقیقی جرمن موسیقی، حقیقی جرمن طرز تعمیر سے، حقیقی جرمن آرٹ سے کہ انھیں کے ذریعے ہماری روح ہمیں واپس ملے گی۔ ہم اپنی قوم کی عظیم الشان روایات کی تعظیم کرائیں گے، ماضی کے کاموں

کو اجاگر کریں گے، اپنی تاریخ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی یاد تازہ کریں گے .... ہم اپنے نوجوانوں کے دلوں میں ان لوگوں کی عظمت پیدا کریں گے جنھوں نے ہماری قوم کی زندگی اور اس کے مستقبل کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی تھی .... ہم نوجوانوں میں اپنی فوج کی عظمت پیدا کریں گے کہ یہ اس کی عزت کریں اور اسے جرمن قوم کا سب سے بڑا اظہار قوت سمجھیں .... لہٰذا یہ پروگرام گویا ہر شعبۂ زندگی میں احیار قومی کا پروگرام ہوگا، ہر اس چیز اور شخص سے بے زار جو قوم کے خلاف ہے، ہر اس کا دوست اور بھائی جو ہماری اور اپنی قوم کے احیار کے لئے کوشاں ہے۔"

ممالک اسلامی

ایران حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے جھگڑے کا مختصر ذکر جنوری کے رسالے میں آچکا ہے قارئین کرام کو تفصیلی حالات معلوم کرنے کا شوق ہوگا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۳۲ء کو ایرانی مجلس وزرا کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت خود شاہ ایران نے فرمائی اور اس میں یہ طے ہوا کہ آئل کمپنی کو جو مراعات حاصل ہیں انھیں منسوخ کردیا جائے۔ یہ ٹھیکا ۱۹۰۱ء میں ولیم۔کے۔ ڈارسی کو ملا تھا۔ ایک قلیل نقد رقم اور سالانہ منافع کے ایک حصے کے بدلے میں ڈارسی کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پانچ شمالی صوبوں کے علاوہ تمام ایران میں مٹی کے تیل کی تلاش کرے، اسے نکالے اور اس تیل اور اس کی تمام مصنوعات کو جہاں چاہے لے جائے۔ دو برس کے بعد ان مراعات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک کمپنی قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء میں 'اینگلو پرشین آئل کمپنی' نے ڈارسی سے تمام حقوق حاصل کر لئے۔

۱۹۱۳ء میں کمپنی کو مزید سرمایے کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت تک حکومت برطانیہ کو بھی اپنی بحری فوج کے لئے تیل کی کثیر مقدار کے حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہوچکا تھا۔ اس لئے حکومت نے اتنا سرمایہ فراہم کردیا کہ کمپنی کے بیشتر حصے اس کے ہاتھ میں آگئے۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۲۴ء تک حکومت برطانیہ نے اس سرمایے کا سہ چند پالیا جو اس نے اس کمپنی میں لگایا تھا۔ اس دوران میں پیداوار میں بہت اضافہ ہوگیا ۱۹۲۱ء کے ۱۷ ½ لاکھ ٹن کے مقابلے میں ۱۹۲۷ء میں پیداوار ۴۰ لاکھ ٹن اور ۱۹۲۹ء میں ۵۹ لاکھ ٹن ہوئی۔ اس کے بعد کمی شروع ہوئی چنانچہ ۱۹۳۰ء میں پیداوار ۷ ½ ۵ لاکھ ٹن ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قیمتیں بھی کم ہوگئیں اور اس طرح نفع صرف ۸۰ لاکھ ڈالر رہ گیا۔

ایرانی حکومت کا حصہ کمپنی کے نفع میں ۱۶ فی صدی ہے ۱۹۲۱ء میں اسے تیس لاکھ ڈالر ملے تھے، ۱۹۲۶ء میں یہ رقم بڑھ کر ۶۵ لاکھ ڈالر ہوگئی ۱۹۳۰ء میں ۵۴ لاکھ ڈالر ملے لیکن ۱۹۳۱ء میں ۱۰ لاکھ ڈالر سے زیادہ حکومت ایران کو نہیں ملے اور یہی کمی ۱۹۳۲ء میں بھی جاری رہی۔ اس کمپنی کو بوجہ ایک برطانوی کمپنی ہونے کے حکومت برطانیہ کو ایک بڑی رقم محصول آمدنی کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں یہ رقم تقریباً سہ چند تھی اس رقم کی جو حکومت ایران کو منافع کی صورت میں ملی تھی۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ حکومت ایران کی آمدنی میں ایک بڑی رقم کی کمی پڑگئی بلکہ یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ایک ایسے کاروبار سے جو ایران کی سرزمین پر کیا جاتا ہے اور وہ بھی ایران کی فطری دولت کے بل بوتے پر اس سے خود حکومت ایران کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کو زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا ایرانی حکومت نے کمپنی سے معاہدے پر نظر ثانی کرنے کی بابت گفت وشنید شروع کی تھی اور اس کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ۳۰ برس میں حالات بالکل بدل گئے ہیں کمپنی کے ارباب حل وعقد نے اسے منظور کیا اور ایک سال ہوا دوسرا معاہدہ ہونے والا ہی تھا کہ گفت وشنید جاری نہ رہ سکی۔ ایران کے وزیر مالیات نے ٹھیکے کی منسوخی کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ حکومت ایک ایسا نیا معاہدہ کرنے پر آمادہ ہے "جس کی بنیاد دونوں فریق کے حقوق پر ہو"۔

ایرانی حکومت کی اس کارروائی سے انگلستان میں ہل چل مچ گئی۔ ایرانی تیل سے متعلق تمام برطانوی حقوق کے چھن جانے سے برطانوی بحری فوج کے لئے بڑی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اگرچہ ان مشکلات میں ان حقوق کی وجہ سے جو برطانیہ کو عراق میں حاصل ہیں کچھ کمی ضرور ہو جائے گی۔ بظاہر تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حکومت ایران کو ایسی یک طرفہ کارروائی کا حق نہیں حاصل تھا اور اس نے ایک ایسا معاہدہ منسوخ کردیا جس کی میعاد ابھی تیس سال تک باقی ہے۔ لیکن بین الاقوامی مناقشات کا فیصلہ اسی آسانی اور سادگی سے نہیں کیا جاسکتا جس سے دو اشخاص کے باہمی جھگڑے طے کئے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ایرانی قوم کی ذہنی کیفیت ہے۔ یہ قوم ان تمام دیرینہ قیود سے آزاد ہی چاہتی ہے جو گذشتہ حکومت کے زمانے میں ایران پر کسی طرح بھی عائد ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف جذبات میں کچھ غیر معمولی جوش نظر آتا ہے جس کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ حکومت ایران نے برطانوی ہوائی جہازوں کو اپنی سرزمین پر اڑنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

۲ دسمبر سنہ ۳۲ کو حکومت برطانیہ نے اینگلو پرشین آئل کمپنی کی طرف سے ٹھیکے کی منسوخی پر باقاعدہ سرکاری طور سے احتجاج کیا۔ اس کے جواب میں حکومت ایران نے اپنے حقوق کا اعادہ کیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ کمپنی کی جائداد کو اگر اس زمانے میں کوئی نقصان پہنچے گا تو حکومت اس کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ اس اعلان کے خلاف برطانوی دار العوام میں ۵ دسمبر کو نائب وزیر امور خارجہ نے بہت سخت تقریر کی اور اس میں کہا کہ برطانوی حکومت کمپنی کی جائداد یا کاروبار کے کسی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ کمپنی کے مفاد کی حفاظت کے لئے تمام جائز طریقوں سے کام لے گی۔ اس کے بعد ۸ دسمبر کو یہ اعلان ہوا کہ حکومت برطانیہ اس معاملے کو عدالت عالم کے سامنے پیش کرے گی اور اس دوران میں تمام جائداد کی حفاظت کی ذمہ دار حکومت ایران ہوگی۔ اگر حکومت ایران حفاظت نہ کر سکے گی تو حکومت برطانیہ خود حفاظت کی تدابیر اختیار کرے گی۔

حکومت برطانیہ کی اس مداخلت پر ایران میں بہت خفگی کا اظہار کیا گیا اور تین دن کے غور و فکر کے بعد مجلس وزرا نے جس کی صدارت خود شاہ ایران نے کی تھی حکومت برطانیہ کی تحریر کا جواب دیا۔ اس جواب میں ٹھیکے کی منسوخی کے ۹ وجوہ گنائے گئے تھے اور عدالت عالم کے حق سماعت کی اس بنا پر تردید کر دی گئی تھی کہ یہ جھگڑا ایک حکومت اور ایک نجی کمپنی کے درمیان ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ حکومت ایران نے یہ بھی ظاہر کیا کہ وہ جمعیت اقوام کے سامنے حکومت برطانیہ کی دھمکی اور دباؤ کی شکایت پیش کرے گی۔
۱۴ دسمبر کو حکومت برطانیہ نے خود ہی اس قضیے کو جمعیت اقوام کی مجلس کے سامنے پیش کیا اور اس طرح عدالت عالم سے رجوع کرنے کے خیال کو ترک کر دیا۔ ۱۵ دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ کے ایک مباحثے کے دوران میں وزیر امور خارجہ نے بیان کیا کہ حکومت ایران کی یہ کارروائی نہ تو حکومت برطانیہ کی مخالفت پر مبنی ہے اور نہ کسی غیر ملکی شخص یا جماعت کی مخالفت پر بلکہ ایرانی قوم اپنے حقوق کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور ان کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرے گی۔ حکومت ایران نے نظامت جمعیت اقوام سے یہ درخواست بھی کی کہ مجلس کی نشست ملتوی کر دی جائے تاکہ ایرانی نمائندوں کو تیاری کرنے اور جنیوا پہنچنے کا موقع مل سکے۔
۱۹ دسمبر کو مجلس میں اس مسئلے پر کچھ ابتدائی گفتگو ہوئی اور عارضی طور پر ۲۴ جنوری بحث و مباحثے کی تاریخ مقرر کی گئی۔

۲۰ دسمبر کو ایرانی پارلیمنٹ نے ٹھیکے کی منسوخی کی تصدیق کی حسین خاں علائی جو پہلے امریکہ اور فرانس میں ایرانی سفیر رہ چکے ہیں اور جو ایران کے بہترین مدبر سمجھے جاتے ہیں ایرانی وفد کی سرکردگی کے لئے منتخب ہوئے۔ وزیر امور خارجہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حکومت برطانیہ کی مداخلت بے جا کی وجہ سے ایرانی حکومت اور اینگلو پرشین کمپنی میں کوئی

دوستانہ سمجھوتا نہ ہو سکا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت ایران نے کسی خارجی اثر سے متاثر ہو کر اس ٹھیکے کو منسوخ نہیں کیا ہے اور نہ ایرانی قوم کمپنی کی جائداد کو غصب کرنا چاہتی ہے بلکہ وہ تو صرف منافع میں سے اپنا واجبی حصہ لینا چاہتی ہے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اسی دن جب کہ وزیر امور خارجہ نے ان معتدل خیالات کا اظہار کیا ایرانی پارلیمنٹ نے ترکی سے دوستی اور غیر جانبداری کے ایک معاہدے کی تصدیق کی اور اٹلی سے جنگی جہاز اور جرمنی سے فوجی طیارے منگانے کا فیصلہ کیا۔

مجلس جمعیت اقوام کے سامنے ۲۶ جنوری کو سر جان سائمن برطانوی وزیر امور خارجہ اور مرزا علی اکبر خاں ایرانی وزیر عدل کے درمیان اینگلو پرشین آئل کمپنی کے قضیے پر ایک دلچسپ مباحثہ ہوا۔ سر جان سائمن کا دعویٰ تھا کہ مراعات کی منسوخی ناجائز ہے اور اس وقت تک کوئی گفت و شنید نہیں ہو سکتی جب تک حکومت ایران حکم منسوخی کو واپس نہ لے لے۔ ایرانی مقرر نے یہ کہا کہ مجلس کو اس مسئلے کی سماعت کا اختیار ہی نہیں ہے اور نظیر میں خود حکومت برطانیہ کے رویے کو پیش کیا جو اس نے فنستان کے خلاف ایک قضیے میں جو جہاز رانی سے متعلق تھا اختیار کیا تھا۔ اس موقع پر حکومت برطانیہ نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ فنستان نے برطانوی قانون کے مطابق خود انگلستان میں پوری چارہ جوئی نہیں کی تھی۔ داور نے کہا کہ اسی طرح اس موجودہ مسئلے میں اینگلو پرشین آئل کمپنی نے ان تمام مواقع سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا جو اسے ایرانی عدالتوں میں حاصل تھے۔ سر جان سائمن نے جواب دیا کہ ایرانی عدالتوں میں چارہ جوئی سے کیا فائدہ جب خود ایرانی پارلیمنٹ نے منسوخی کی تصدیق کر کے ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جس کی پابندی ایرانی عدالتوں پر فرض ہے۔ ایرانی وزیر نے اس کا یہ جواب دیا کہ ایرانی پارلیمنٹ کی تصدیق سے محض اظہار اعتماد مقصود تھا اور عدالتوں کے اختیارات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے بعد مجلس کی نشست اس لئے ملتوی ہو گئی کہ فریقین کو باہمی گفت و شنید کا موقع دیا جائے۔ اس سلسلے میں چکوسلوواکیا کے وزیر امور خارجہ نے بہت مدد کی اور بالآخر ۳۰ جنوری کو یہ اعلان کیا گیا کہ ایک عارضی سمجھوتا ہو گیا ہے۔

اس سمجھوتے کی دفعات یہ ہیں کہ برطانوی اور ایرانی حکومتیں اپنے قانونی حقوق کو محفوظ رکھتی ہیں لیکن فی الحال مجلس جمعیت اقوام کے سامنے اس مسئلے کے فیصلے پر اصرار نہیں کرتیں اور اسے آئندہ مئی تک ملتوی کرتی ہیں۔ اس درمیان میں کمپنی حکومت ایران سے نئے مراعات حاصل کرنے کی غرض سے فوراً گفت و شنید شروع کرے گی۔ کمپنی اس زمانے میں اپنا کاروبار جاری رکھے گی۔ اگر گفت و شنید ناکام ثابت ہوئی تو یہ مسئلہ پھر مجلس کے سامنے پیش ہوگا۔

شذرات

پچھلے مہینے جامعہ ملیہ کے دائرے کے ایک رکن محمد عثمان صاحب اپنے عزیزوں اور رفیقوں کو داغ جدائی دے گئے۔ مرحوم مدرسہ تحتانیہ کے معلم اور بچوں کے دار اقامہ کے نگراں تھے اور اپنے احساس فرض، ذوق عمل اور حسن اخلاق کی بدولت جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ میں حقیقی معنی میں ہر دل عزیز تھے۔ ان کا جوش اور خلوص ان کے شاگردوں اور رفیقوں کے لئے نمونے کا کام دیتا تھا۔ کسی ضروری کام سے رخصت پر گھر تشریف لے گئے تھے۔ وہاں یکایک نمونیا میں مبتلا ہوئے اور دو تین دن کے اندر انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمیں مرحوم کی والدہ ماجدہ سے اور دوسرے اقربا سے دلی ہمدردی ہے اور ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کے عزیزوں، رفیقوں اور شاگردوں کو اس صدمۂ جانکاہ میں صبر عطا فرمائے۔ جامعہ کے ایک استاد نے مرحوم کی تاریخ وفات کہی ہے جو درج ذیل ہے:

عثماں کہ نسبتش بہ محمدؐ قریب بود | بافراط شوق خود بہ جوار نبی شتافت
پرسید سال رحلت او دل ز فکر من | "مرحوم شد محمد عثماں" جواب یافت

۱۳۵۱ھ

اپریل میں جامعہ کو ڈاکٹر سر محمد اقبال، عبد اللہ یوسف علی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی کے خیر مقدم کا شرف حاصل ہوا۔ ایسے بزرگوں کی تشریف آوری ہم لوگوں کی نظر میں وہی قدر رکھتی ہے جو دوسروں کے نزدیک ارباب جاہ و حکومت کے نزول اجلال کو حاصل ہے۔ مدرسہ عام معاشرے کا ایک ادارہ ہے اور اس کے ساتھ بے شمار رشتوں سے مربوط ہے۔ مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ کو معاشرے کے نمائندوں یعنی مشاہیر قوم کی زیارت اور ان کی صحبت کے فیض سے بصیرت اور ہدایت کے علاوہ برکت اور تقویت بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مشاہیر میں سب سے زیادہ عقیدت مدرسے کے طلبہ اور اساتذہ کو ارباب علم و فضل سے ہونا چاہیے کیونکہ ان کی اقلیم کے حکمراں یہی لوگ ہیں۔ بے شک اراکین سلطنت کا احترام بھی ایک قدرتی جذبہ ہے مگر اسی ملک میں جہاں سلطنت قومی اور ملکی ہو۔ ہندوستان میں تو یہ جذبہ عموماً اعلیٰ مقاصد کی جگہ ادنیٰ اغراض پر مبنی ہوتا ہے۔ سچے دل سے اگر قدر ہوتی ہے تو انھیں حضرات کی جو ذاتی جوہر رکھتے ہیں اور اپنے ملک و قوم کی خدمت میں صرف کرتے ہیں

مولانا سید سلیمان صاحب ابتدا سے جامعہ پر نظر عنایت رکھتے ہیں اور پہلے بھی کئی بار تشریف لاکر ہم سب کو اپنے بزرگانہ اخلاق سے گرویدہ کر چکے ہیں۔ اس مرتبہ آپ اردو اکادمی کی دعوت پر تشریف لائے تھے اور ۱۱ اپریل کے جلسے میں آپ نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں عام تمدنی اور خاص مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے موجودہ تعلیم پر تنقید تھی اور اس کی اصلاح کی صورتیں بتائی گئی تھیں۔ موصوف کے خیالات اس بحث پر بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ جمہور ملت کی دینی اور تعلیمی ضروریات کا جو اندازہ آپ کر سکتے ہیں وہ محکمۂ تعلیم کے افسر یا فن تعلیم کے ماہر ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ ان حضرات کو نہ عام مسلمانوں کی معاشرتی حالت کے مطالعے کی طرف توجہ ہے اور نہ اس کا موقع حاصل ہے۔ ہم اس خطبے کو مئی اور جون کے جامعہ میں شائع کریں گے اور اس کے بعد بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

اس سال یہ اردو اکادمی کا پہلا جلسہ تھا کیونکہ جنوری اور فروری میں رمضان کی وجہ سے کوئی جلسہ نہیں ہو سکا اور مارچ میں ہمارے اور کل قوم کے معزز مہمان حسین رؤف بے صاحب کے لکچر ہوتے رہے۔ اب انشاء اللہ اگست سے دسمبر تک ہر مہینے جلسے ہوں گے اور اس کمی کی پوری طرح تلافی ہو جائے گی۔

علامہ اقبال جامعہ سے ہمیشہ ہمدردی فرماتے رہے ہیں چنانچہ ۱۹۲۸ء میں جامعہ کی امداد کے لئے قوم سے جو اپیل کیا تھا اس پر صرف پانچ چھ بزرگوں کے دستخط تھے جن میں علامہ موصوف بھی شامل تھے۔ مگر ہم لوگوں کی بدقسمتی سے آپ کو ابھی تک جامعہ میں تشریف لانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے مہینے کے آغاز میں آپ ایک دن چائے کی دعوت میں تشریف لائے اور اس کے بعد لاہور سے زحمت سفر اٹھا کر خاص اس غرض سے دہلی آئے کہ رؤف بے صاحب کے دوسرے لکچر میں صدارت فرمائیں اور چونکہ تیسرے لکچر کے صدر ڈاکٹر سپرو صاحب تشریف نہیں لا سکے اس لئے اس میں بھی آپ ہی نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ اسی زمانے میں جامعہ کے طلبہ اور اساتذہ کی التجا پر آپ نے وعدہ فرمایا کہ تھوڑے ہی دن کے بعد پھر تشریف لاکر اہل جامعہ کو اپنی تقریر سے مستفید فرمائیں گے۔ ۵ اپریل وہ مبارک تاریخ تھی جب آپ نے اس وعدے کا ایفا کیا۔ ۵ بجے شام کو آپ نے جامعہ کی انجمن اتحاد کا سپاسنامہ قبول فرمایا اور اس کے جواب میں محبت اور شفقت سے جو کلمے ارشاد کئے وہ ہم لوگوں کے دل سے کبھی محو نہ ہوں گے۔ اس کے بعد ۹½ بجے شب کو آپ نے اپنے سفر یورپ کے حالات پر تقریر

فرمائی جس کا عنوان آپ نے "لندن سے غرناطہ تک" قرار دیا تھا۔ اس کے سب سے دلچسپ حصے دو تھے۔ ایک وہ جس میں آپ نے فرانس کے مایۂ ناز فلسفی برگساں سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا دوسرا وہ جس میں آپ نے جدید اسپین کے حالات بیان فرمائے خصوصاً اس رجحان پر روشنی ڈالی جو وہاں کے باشندوں کو آج کل اسلامی تمدن کی طرف ہے۔ آپ کے خیال میں جو لوگ تہذیب اور معارف اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اسپین میں جاکر رہنا ناگزیر ہے اور انھیں وہاں کی حکومت اور وہاں کے ارباب علم سے ہر طرح کی مدد ملے گی۔

علامہ موصوف کی صحبت سے تھوڑے عرصے میں کئی بار مستفید ہونے کے سبب سے وہ عقیدتمندانہ ذاتی روابط جو جامعہ کے بہت سے استاد اور طالب علم آپ سے رکھتے تھے اور گہرے ہوگئے اور مجموعی حیثیت سے اس قومی ادارے سے آپ کا رشتہ تعلق اور مستحکم ہوگیا۔ امید ہے کہ آئندہ آپ جب کبھی دہلی تشریف لائیں گے تو جامعہ کو اپنا گھر سمجھ کر یہیں قیام فرمائیں گے اور ہمیں خدمت اور استفادے کا موقع دیں گے۔

عبداللہ یوسف علی صاحب جناب شیخ الجامعہ کی دعوت پر تشریف لائے اور آپ نے نہایت غور سے جامعہ کے ہر شعبے کو دیکھا اور ہر چیز کے متعلق بہت تفصیل سے سوالات کئے۔ آپ کا یہ معائنہ خالص تنقیدی نظر سے تھا اور اس میں رعایت کو بہت کم دخل تھا۔ شکر ہے کہ اس کا نتیجہ ہمارے حسب مراد نکلا اور آپ نے ہر طرح اطمینان اور استحسان کا اظہار فرمایا۔ اس وقت آپ دہلی میں مزید قیام نہیں کرسکتے تھے اس لئے جامعہ میں کوئی تقریر نہ کرسکے مگر آپ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ موسم سرما میں یورپ سے آنے کے بعد ہم لوگوں کو اپنے خطبے سے مستفید کریں گے۔

جن حضرات کو اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کی فکر ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ طباعت اور رسم خط کا مسئلہ کتنی زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ پتھر کی چھپائی زمانے کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی اور اگر اردو زبان کو دوسری زبانوں کا مقابلہ کرنا ہے تو ٹائپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ نسخ کا ٹائپ اردو میں مدت سے موجود ہے مگر وہ مقبول نہیں ہوا کیونکہ نستعلیق کی دلکشی ہماری نظروں اور دلوں کو اس قدر مسحور کرچکی ہے

کہ سوائے اس کے کوئی خط ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ مدت سے حکومت حیدرآباد کی سرپرستی میں نستعلیق ٹائپ بنانے کی کوشش ہو رہی ہے اور اس میں بہت کچھ کامیابی بھی ہو چکی ہے مگر ابھی وہ ٹائپ جو حیدرآباد میں بنا ہے تجارتی حیثیت سے گراں پڑتا ہے اور اسے عام رواج حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یہ معلوم کر کے نہایت مسرت ہوئی کہ ایس ایچ۔ قریشی صاحب جو طباعت خصوصاً ٹائپ سازی کے ماہر ہیں اور مدتوں سے اس مسئلے کی تحقیق علمی اصول پر کر رہے ہیں ایسا ٹائپ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو خوبصورت اور دیدہ زیب بھی ہے اور اسی کے ساتھ ان شرائط کو بھی پورا کرتا ہے جو تجارتی حیثیت سے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس ٹائپ کو طیار کرنے کے لئے ایک کارخانہ "قابل اطمینان نستعلیق ٹائپ فاؤنڈری" کے نام سے قرول باغ دہلی میں کھولا ہے اور اس کارخانے کو چلانے کے لئے ایک کمپنی ایک لاکھ روپیے کے سرمایے سے قائم کی ہے جس کے حصے دس دس روپیے کے رکھے گئے ہیں۔ ہم نے قریشی صاحب سے گفتگو کرنے کے بعد اس امر کا پورا اطمینان کر لیا ہے کہ قریشی صاحب اس فن کے ماہر ہیں اور نہایت محنت اور صبر کے ساتھ علمی اور عملی اصول پر کام کرتے ہیں اس لئے ہمیں قوی امید ہے کہ ان کا بنایا ہوا ٹائپ فنی حیثیت سے مکمل ہوگا۔ البتہ اس پر رائے دینے کے ہم اہل نہیں ہیں کہ نستعلیق ٹائپ کو تجارتی حیثیت سے کہاں تک کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور اس کمپنی کا نظم و نسق کیسا ہے۔ بہرحال ہم ان سب حضرات سے جنھیں اردو زبان کی بقا اور ترقی منظور ہے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ قریشی صاحب سے مل کر یا خط و کتابت کے ذریعے اس کمپنی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں اور پھر اس کے حصے خود بھی خریدیں اور اپنے دوستوں کو بھی خریداری پر آمادہ کریں۔ زبان کی سچی خدمت کا یہ نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔

شاعری کے قدردانوں، تاریخ اسلام کے شائقوں بلکہ ان لوگوں کو جو اسلام کے نام لیوا ہیں یہ سن کر مسرت ہوگی کہ حضرت حفیظ جالندھری کے شاہنامۂ اسلام کی دوسری جلد بھی طیار ہو گئی ہے اور عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ یہ جلد بھی دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں جنگ بدر، فتح مکہ اور اس کے بعد کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ پہلی جلد کو جو قبول عام حاصل ہوا وہ شاید ہندوستان میں اس صدی کی بہت کم کتابوں کو نصیب ہوا ہوگا۔ گھر گھر یہ کتاب پہنچ گئی ہے۔ بچے بچے کی زبان پر اس کے شعر ہیں۔ لوگ اسے جلسوں میں سناتے ہیں، چھوٹے چھوٹے حلقوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علاوہ شاعرانہ خوبیوں کے اس کا ہر شعر جوش اور خلوص میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دوسری جلد بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی تاکہ مصنف کو اس سلسلے

کی تکمیل کا حوصلہ ہو. کتاب کے معمولی ایڈیشن (غیر مجلد) کی قیمت تین روپے اور خاص ایڈیشن (مجلد منقش مطلا) کی قیمت ساڑھے بارہ روپیہ ہے ۔ کتب خانہ شاہنامہ اسلام، انارکلی، لاہور سے مل سکتی ہے ۔

اس مہینے ملک وملت کے سر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا جس کا نظیر زمانہ بڑی مشکل سے پیدا کرے گا ۔ سید حسن امام مرحوم کی ذات میں علم و فضل، جاہ و مرتبت، دولت و سطوت کے علاوہ حب وطن اور درد قوم کی صفات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں اور ملک کا ہر طبقہ آپ کے تدبر اور خلوص کا معترف تھا ۔ سیاست میں آپ حریت پسندانہ پالسی پر عامل رہے ۔ چنانچہ نیشنل کانگریس کی صدارت پر بھی فائز ہوئے ۔ آخر میں آپ سیاسی معاملات سے علیحدہ سے رہتے تھے مگر پھر بھی آپ کی ہمدردی اور آپ کے مشورے سے قومی تحریک کو قابل قدر مدد ملتی رہتی تھی ۔ آپ کی وفات ساری قوم اور سارے ملک کے لئے نہایت سخت حادثہ ہے اور آپ کے عزیزوں خصوصاً والد بزرگوار اور صاحب زادوں کے لئے تو ایسی جان کاہ مصیبت ہے جس کے برداشت کرنے کی قوت خدا ہی دے سکتا ہے، بندوں کے حد اختیار بلکہ حد خیال سے باہر ہے ۔ ہم دل سے مرحوم کی مغفرت اور پسماندگان کی تسکین کی دعا کرتے ہیں ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

علی گڑھ میگزین

مدیر

آلِ احمد سرور بی اے ایس سی

علی گڑھ میگزین نہ صرف طلباء کے تمام رسائل پر یک گونہ فوقیت رکھتا ہے بلکہ اردو کے اور رسائل میں بھی اسے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے قران السعدین کا بہترین نمونہ یہی ہے بصیرت افروز مقالے اور اعلیٰ ترین تنقیدیں اسکی زینت ہوتی ہیں مغربی زبانوں سے بہترین تراجم برابر درج ہوتے رہتے ہیں اور اردو کے تمام مشاہیر شعراء کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

اگر دنیائے ادب میں علی گڑھ کی ترقی دیکھنا ہو تو علی گڑھ میگزین ملاحظہ فرمائیے قدیم طلباء کے لئے مادر کالج کی یاد تازہ کرنے کے لئے اس سے اچھا پرچہ نہیں۔

علم و ادب کے شائقین ضرور اس کے خریدار بنیں۔ سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے معہ محصول جس میں سالنامہ بھی شامل ہے نمونے کا پرچہ ۸

مینجر علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

رجسٹرڈ
نمبر ۱۸۵۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۲۰
بابت ماہ مئی ۱۹۳۳ء
نمبر ۵
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

الوراثۃ فی الاسلام فن وراثت پر عربی میں یہ ایک آسان رسالہ ہے۔ قیمت ۸؍

ذکریٰ ولادت نبویؐ پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ معرکۃ الآرا مضمون ہے اس کی قدر الہلال کے مطالعہ کرنے والے حضرات کر سکتے ہیں۔ قیمت ۸؍

بشریٰ اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبار و قہار ہی نہیں بلکہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ از سید سلیمان ندوی قیمت ۶؍

الورد والریحان بچوں کے لئے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے تاکہ وہ آنحضرت صلعم کے اس مختصر کلام کو بآسانی یاد کر سکیں۔ قیمت دو آنہ۔

ہمارا دین اس میں ارکان خمسۂ اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس اردو میں لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲؍

فلسفہ مذہب پروفیسر سید وہاج الدین صاحب کا دلچسپ مقالہ (زیر طبع) قیمت ۸؍

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہے جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔ عہ؍

تاریخ ہند قدیم کے ایم پانیکر کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸؍

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ۔ قیمت ۱۲؍

تاریخ امریکہ دریافت امریکہ سے بیسویں صدی کے آخر تک کے مفصل حالات۔ نہایت ہی دلچسپ کتاب ہے۔ صفحات ۲۷۶ قیمت دو روپے

تاریخ نجد نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے۔ قیمت عہ؍

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ۔ قیمت مکمل ۱۳ للعہ

۱۔ حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت ۱۲؍
۲۔ حصہ دوم خلافت راشدہ۔ عا؍
۳۔ حصہ سوم خلافت بنی اُمیہ۔ ۱۲؍
۴۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ۔ ۶؍
۵۔ حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد۔ عا؍
۶۔ حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر۔ عا؍
۷۔ حصہ ہفتم۔ خلافت عثمانیہ۔ عہ؍

سوانحعمریاں

سیرت محمد علی | مولانا محمد علی کی مکمل سوانحعمری ضخامت ۶۰۰ صفحہ کے قریب متعدد تصاویر قیمت ؏ر

تلاشِ حق | گاندھی جی کے خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربات۔ ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر۔ ایک روپیہ قسم اول دو روپے۔

ٹالسٹائی | روس کے قائد اعظم مشرق کے مصلح اور انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات۔ قیمت ۲ر

جمال الدین | اخوت اسلامی کا پرجوش داعی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کئے۔ ۸ر

اورنگ زیب | اورنگزیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا۔ قیمت ۸ر

حیات حافظ | لسان الغیب خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور انکی شاعری پر مفصل تبصرہ۔ قیمت عہ

حیات جامی | فارسی کے مشہور شاعر مولٰنا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث۔ قیمت ۸ر

ضیاء الدین برنی | عہد تغلق کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔ قیمت چھ آنے ۶ر

سیرت عمرو بن العاص | نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات۔ قیمت عہ،

خادمات خلق | یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنہوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کر دی تھی قیمت ۱۰ر

ادب

سیر المصنفین | اردو کے تمام مصنفین کے حالات ادب اردو کی دلپسند تاریخ۔ قیمت صہ

کیمیاگر | چند مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ

نیرنگ | ۱۲ ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ عہ

مضامین رسالہ جوہر | جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

لیلۃ القدر | مولٰنا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے، ار

دیوان غالب (جرمنی) | اسمیں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز سہ رنگی تصویر۔ عہ و عا

مرقع غالب (جرمنی) | کمرہ کی زینت کیلئے عمدہ چیز ہے۔ غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر۔ دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں قیمت ۸ر

دیوان شیدا (جرمنی) | مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور سے جرمنی میں طبع کرایا۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ دہلی

کلام جوہر | مولانا محمد علی جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا مجموعہ ہے اور شروع میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کا مقدمہ ہے ۸ر

انتخاب میر | سعدیٔ ہند میر محمد تقی میر علیہ الرحمہ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے۔ قیمت ۱۲ر

انتخاب سودا | مرزا محمد رفیع سودا میر کے ہم چشم ہیں۔ یہ مجموعہ انکے اچھے کلام سے تیار ہوا ہے۔ قیمت ۱۲ر

انتخاب حسرت | حسرت کے تمام دواوین کا عطر ہے۔ ۱۲ر

جواہر ملیہ | دس تاریخی ملی نظموں کا یہ مجموعہ ہے دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ یہ نظمیں درس میں داخل ہیں۔ قیمت ۳ر

نالۂ مشیر | مشہور صاحب قلم شیخ مشیر حسین قدوائی کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

کلام مشیر | یہ شیخ صاحب کے کلام کا دوسرا حصہ ہے لوازم حسن۔ لوازم عشق وغیرہ چند اچھی نظمیں ہیں۔ قیمت عہ

چند اچھے ڈرامے

پردۂ غفلت	عہ	گناہ کی دیوار	۸ر
کھیتی	۶ر	صید زبوں	۱۰ر

متفرق

نفسیات شباب	سے	آزادی (ترجمہ)	عمہ
نہرو رپورٹ مکمل	عسہ	اسلامی تہذیب	۴ہ

بچوں کی کتابیں

تاریخ اسلام کا جدید نصاب

ہمارے نبیؐ	جماعت دوم	۴ر
نبیوں کے قصے	〃 سوم	۵ر
سرکار دو عالم	〃 چہارم	۸ر
خلفائے اربعہ	〃 پنجم	۱۰ر

درسی کتابیں

ہمارے رسول	۵ر	اچھی باتیں	۴ر
بچوں کا قاعدہ	۴ر	رہنمائے قاعدہ	۲ر

بچوں کے لئے ڈرامے

بچوں کا انصاف	۴ر	اسکول کی زندگی	۴ر
دیانت	۲ر	محنت	۴ر
شریر لڑکا	۴ر	قوم پرست طالب علم	۴ر

بچوں کے لئے معلومات بڑھانے والی کتابیں

دنیا کے بسنے والے	۶ر	تاریخ ہند کی کہانیاں	۳ر
میلاد النبی پروجکٹ	۶ر	باغبانی پروجکٹ	۸ر
اسلامی عقائد	۱۰ر	آنحضرت	۴ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۲۰ | بابتہ ماہ مئی ۱۹۳۳ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر رسالہ جامعہ سے شائع کیا۔

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

یہ خطبہ جناب مولانا سید سلیمان ندوی نے اردو اکادمی کے جلسے میں ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کو پڑھا تھا۔ ہم اسے دو قسطوں میں مئی اور جون کے پرچوں میں شائع کریں گے۔ اس کے بعد انشاء اللہ بہت جلد یہ علیحدہ رسالے کی صورت میں چھپ جائے گا۔

دوستان و عزیزان جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا جو نہایت مقبول ہوا تھا اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" کے مسئلے پر غور کیا جائے۔

اُسی زمانے میں سر سید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا۔ بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کر کے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے۔ اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہیے۔ ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے اور ایک منٹ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اس موڑ پر پہنچ گئے جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہو گیا ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا۔

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلے گا، لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہوگا۔ پچاس

برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعے کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کماکر　　　وہ کھوئے گئے اور تعلیم پاکر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو یہ مبارکباد بھیجی تھی کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے آٹھ لڑکے انٹرنس میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں" (مکاتیب اول صفحہ ۴۰ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا اس سے وہ چند گریجویٹ ہو رہے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہوگیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا شبلی مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج آئے تھے تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے۔

"یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشا گاہ ہے۔ ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی۔ اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمامتر ضعیف ثابت کردیں گے، لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔"

"سید صاحب (سرسید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے، صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی۔"

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے۔ کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ الف لے بی سی ڈی ہمارے کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہیے۔

تعلیم | تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں۔ ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم لی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے دوسرے پیشے ہیں۔ اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح موردِ الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا۔ موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حدِ فاصل نہ تھی کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں۔ کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے کر تاج و تخت پر قبضہ کیا وہ اپنی فی صدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے۔ پھر جب انہیں عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں، اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دبا کر ان کے نظامِ حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے۔ اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو ۵۰ ہزار انگریز ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے۔

قوم کی ترقی کا راز | ان واقعات سے جو مشاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصود زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا سب کچھ ہو اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے۔

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، ان کی تحلیل کیجیے، تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیوں کر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر افراد اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا۔ کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے، باہم نبرد آزما تھے۔ آرکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا یہی پیش نہیں آیا، حیدر علی اور ٹیپو جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس "آہنی انسان" کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آ گئی۔ مذہب کی اصطلاح میں اسی "ذہنی وحدت مقصد" کا نام **ایمان** ہے جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا۔

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہو سکتا بہت کچھ اسی مقصد عزیز کی گراں بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار،

قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں۔ یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں ہے تو وہ قوم نہیں بلکہ جانوروں کا گلہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے۔

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے۔ اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے ہیں، صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، ان کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر دولت مند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے کانگریسیوں سے لے کر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا۔ اب اس قوم کی ہر کوشش ہر راہ سے اسی ایک منزل مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہل سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اس کو سیاسی خودمختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں۔ اہل تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے اس کے علم و فن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاح معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں، اہل دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہل علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہل ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصول وحدت کے لئے پس دیوار لڑ رہے ہیں، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جا رہا ہے جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے اس لئے راہ رو اور راہ بر باہم دست و گریباں نہیں۔

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز "وحدت مقصد" کا وجود ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے اردگرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں، حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہل پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درس گاہ میں، صناع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں، یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمیں گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔

تعلیم کا پہلا مقصد، مقصد زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے۔ قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر ہر آزمایش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے۔

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اول مسلمانوں کے سامنے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی۔ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درس گاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے۔

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی برا سہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم وفنون کی تحصیل۔ اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی میں ایک دنیوی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا یہاں تک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب اور احترام کے قابل تھے۔ ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی اور اس کی خدمت کے لئے ہر علم وفن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے۔ ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قوموں سے سے لئے، مگر غور سے دیکھئے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح وترمیم کر کے ان کو اپنے نصاب درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمام تر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں کہ دہریت سکھاتا ہے جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو

نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدءِ فیاض کے فلسفیانہ لیکن باادب ناموں سے اس کی تعبیر کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درس گاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا نہیں ہوتی۔

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا کہ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی دی گئی)، جب ہیئت و فلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا اور لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کرے گا۔ جغرافیے کی کتاب لکھے گا تو کہے گا کہ یہ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کی تفسیر ہے۔ علم طب پڑھائے گا تو شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کرے گا۔ فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے ومن لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامراد ہے)۔ غرض جس علم و فن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم و فن اور ہر دنیاوی صنعت و ہنر بھی سراپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکان دار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارثِ پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ وہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد و ستد کا معاملہ اور ایک ہاتھ سے لینے اور دوسرے ہاتھ سے دینے کی ڈیوٹی اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ۔ اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر مناظر پیش ہوتے تھے جن کو آج کل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہیں۔

آج کل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اس کالج سے اُس کالج اور اِس یونیورسٹی سے اُس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا

ذریعہ جانتے ہیں اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپے کے اضافوں کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر لیتے بھی تھے تو وجہ کفاف سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ وہ بڑے بڑے علما جن کے ناموں کی عزت ہمارے دلوں میں ہے انھوں نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیوں پر اپنی زندگی بسر کر دی ہے اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگوں پر اپنے احسان کا بار بھی نہیں رکھتے تھے۔

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا اور خصوصاً بیرونی ملکوں میں جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے جب ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں نہ تو خشکی کی مسافت، اور نہ تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور کرتی تھی۔ محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا۔ بخارا کا یتیم محمد بن اسماعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیرسایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی میں عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درس گاہ کو چھان ڈالتا ہے۔ مصر کے طالب العلم خراسان آتے ہیں، خراسان کے مصر جاتے ہیں، اسپین اور سسلی سے چل کر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہیں اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہیں۔ بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے علم کی طلب میں بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہراۃ، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور، ری، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسروباد وغیرہ شہروں کی خاک چھانی۔ جغرافیے میں دیکھئے یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لے کر ترکستان، خراسان، ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں۔

محمد بن مفرح اموی اندلسی کی راہ طلب میں یورپ، افریقہ، اور ایشیا تین براعظموں کے شہر داخل ہیں۔ اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعا، اور زبید (یمن) ان کے

تعلیمی مقامات ہیں۔ ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسطہ (سراگوزہ) میں ہوئے لیکن اندلس سے لے کر خراسان تک کو چہ گردی کی۔ ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے، وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد میں مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور، اور بلخ میں قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک میں ہوئے اور ۵۴۸ھ میں افغانستان کے شہر ہراۃ میں پیوند زمین ہوئے حسین بن احمد پیدا قرطبہ میں ہوئے اور ۵۶۰ھ میں یمن کی سرزمین میں دفن ہوئے۔

تاج الدین سرخسی ۵۵۳ھ میں پیدا خراسان کے شہر سرخس میں ہوئے، نشو نما شام میں ہوئی اور وفات ۵۹۴ھ میں اندلس میں پائی۔ نحو کے مشہور امام ابو علی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر میں ہوئے، پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکوں کی سیر کرتے بغداد اور موصل سے چل کر اسپین میں جا کر دم لیا اور ۳۵۶ھ میں قرطبہ میں وفات پائی۔ ابن المقری اصفہان کے محدث تھے۔ انھوں نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکہ، رملہ، واسط، عسکر مکرم، حمص، رقہ اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی۔ کہتے ہیں کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کیے اور اس کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضے میں اس کو پیش کیا جاتا تو وہ اس کو قبول نہ کرتا۔

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ وہ پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابو العلا معری کی خدمت میں شام پہنچے ہیں تو پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ ان کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا۔

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں میں دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علموں کو دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعا، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہراۃ، اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھ سکتے۔

میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ایک کوفہ میں حضرت امام ابو حنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی۔ امام ابو حنیفہ کے حلقۂ تعلیم میں مکہ، مدینہ منورہ،

دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، ری، قومس، دامغان، ترمذ، ہراۃ، نیشاپور، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے۔ ذرا نقشے میں ان شہروں کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے۔

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے۔ حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں۔ عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعار، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، خلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور اور انطاکیہ اور عراق کے شہروں میں سے بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رہا اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قومستان، حیفان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہراۃ، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا)، مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا۔ مشرق ہو چکا اب مغرب کی طرف چلئے۔ مصر کے شہروں میں سے قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان تنیس اور شمالی افریقہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، سبطنہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ، اور اٹلی کی سسلی اور ایشیائے کوچک کے سرتا دراز میر استے طالب العلم آ اور جا رہے تھے۔

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے اور نہ دخانی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے اور جو برسوں کے سفر کو ہفتوں میں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور وہاں نہ ڈاک اور تار کے یہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے۔

لیکن ایک لمحہ ٹھہرئے۔ یہ گذشتہ عہد کی داستان کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو ان طالب علموں کو اس زمانے میں اس

طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بہ شہر اور ملک بہ ملک لئے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا عائق ہوتے تھے، پھر کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہِ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت　　　دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصدِ زندگی اور نصب العین تھا جس کو " دین کا ولولہ " اور " مذہب کا جوش " کہتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد۔ ان کے قبضے میں یہی بجلی کا وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں، چل رہے ہیں۔

اس سے دوسرے درجے پر جو جذبہ ہے وہ سیاست ہے۔ اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ کار اس میں دین کے تحت ہے۔ ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا اردپی سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصے دار ہیں۔ اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی نیت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ و روپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے۔ انسانوں کے درمیان طبعی اور فطری تفرقوں کو " ملیت " کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جس کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان بدل سکتا ہے۔

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نومسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لے کر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا۔ افریقہ میں، بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور و دراز گوشوں میں اس طرزِ سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں۔ اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے

مالامال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشورکشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا۔ مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے۔ اسپین اور مراکش کے فاتح یہی بربری نومسلم ہیں جنھوں نے بارہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں۔

وہ کون سا جذبہ تھا جو نومسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمراں بناتا رہا۔ سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچتا اور پھر غزنی میں بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہے جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے، غور کے نومسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں۔

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں یہ دکھاؤں کہ اسلام نے کیوں کر دین ہونے کے ساتھ سیاست کا فرض انجام دیا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پُرزور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔

۵ عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

بایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فشار برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دی جائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں۔ غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جن میں کبھی صلح نہیں ہو سکتی۔ اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کر کے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری

طرف وطنیت کے طرف دار اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے بری کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بے زاری ہے اور یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں، حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے، ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے۔ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ العلماء کے نظریۂ سیاست نے اس امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کیا ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد تحریک میں جمعیتی خادمان وطن کانگریسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم ہیں؟ حالانکہ سب کو پتہ ہے کہ جمعیۃ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے اور با ایں ہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی درجے کم رتبہ نہیں۔

میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلماء کی درسگاہ عقل و نقل کی تطبیق ہے، جامعہ ملیہ اسلامیت اور وطنیت کی تطبیق اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھیں گی۔

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکش کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے اس ملک میں ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہے گا۔

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی وطنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل کر کے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کریں۔ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندان وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراک عمل کریں۔ موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلا شرکت غیرے "کلچرل اٹانومی" حاصل کریں اور دوسری طرف عام ملکی سیاسیات میں وہ اپنے

ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی پر قناعت کریں۔ اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا۔ جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخاب نمایندگی کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ بجائے خود علیحدہ نمایندگی سے طے ہوں گے اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبے کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات و سیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علیحدگی کی بنا پر ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہوں گی، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی امور و معاملات کا فیصلہ کرے گی اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل کا تصفیہ کرے گی۔

ہم نے جہاں تک ان مسائل پر غور کیا ہے ہم کو اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلے کا نظر نہیں آتا، یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے مگر جس طرح ہر نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر ہم طے کر کے عمل میں لاتے ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں۔

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہو گا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں:-

۱۔ پیغام اسلام کی تعمیل، حفاظت اور بقا۔

۲۔ اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام۔

۳۔ اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل اٹانومی" کا قیام۔

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روحِ عمل قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے جدوجہد، اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل پروگرام ہو سکتا ہے۔

شاید اس موقعے پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی بازپرس کی جائے لیکن اگر میری تقریر

کا پچھلا حصہ حاضرین کے ذہن نشیں ہے تو یقیناً وہ میری طرف سے اس بازپرس کا جواب دے سکتے ہیں۔
میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کر کے ان کو سرتا پا عمل بنائے۔ دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی قومی حکومت ہے اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے۔ انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں۔ وزیر اعظم سے لے کر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے احاطوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آئندہ کی سیاسی ذمہ داری کے لئے تیار کرتا رہتا ہے۔

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہوں گا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہے۔ سبب کھلا ہوا ہے۔ انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کر دی جائے جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کر دیا جائے۔

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں۔ اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آئندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہے۔

اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعے سے ہم اپنے افسروں سے گفتگو کر سکیں اور ان کے لئے ان کی زبان میں ان کے لئے سواد مہیا کر کے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم، جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ عَلَم لہراتا ہے جس کا

آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا" اور تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیوں کر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے۔

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے۔ ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے۔ پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر انھیں مناقب کی تکرار ہوتی ہے۔ اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جا سکے اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے۔

ہم نے ہزاروں اور لاکھوں کے صرف سے ملک میں جابجا اسلامی اسکول، اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول، اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں۔ مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایے سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دینا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں کہ قومی سرمایے سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی نتائج کے لحاظ سے سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں کہیں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایے کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دارالاقامے کی حیثیت سے ہے۔

بہرحال یہ ایک جملۂ معترضہ ہے۔ کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت و خواند کے ہنر کی تعمیم و اشاعت کے

لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچا یا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روزافزوں نقصان پہنچ رہا ہے۔ مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرف لاابعنی جن کا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جا رہے ہیں اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات واعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے! ور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمراں قوم کے تماشے کی صرف نقل ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے لئے ۱۹۱۰ء میں جس وقت ملک میں جوش و خروش برپا تھا مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے:-

کہ ایں سر رشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے "مگر دست شما دست شما باشد"۔ لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال و جواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا۔ اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہیئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد معین کرنا چاہیئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہیئے اور آیندہ ہماری درس گاہیں صرف نوشت و خواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے۔

اسی لئے مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درس گاہیں بکثرت قائم کی جائیں جو با مقصد ہوں اور ان کا سر رشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو۔ مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی و قومی جذبات سے یکسر خالی کر دیں۔ اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درس گاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی

زندگی کا مقصد بتائیں اور ان پر ان کی حیات ملی کے اسرار کھولیں

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی۔ اس وقت ملک کی عربی درس گاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں۔ اس طعن کو قبول کر لینے کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و مبتذل حالت میں ہوں تاہم وہ بامقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتا دیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود وہ زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ آج کل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اور ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہے۔

مسلمانوں کی علیحدہ تعلیم اوپر کے معروضات اگر ذہن نشیں ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کی بامقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں ان کو خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دی جائے۔ ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہو تاکہ مسلمانوں کی مستقل ہستی قائم رہے۔ میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تاکہ ان کی علیحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے اور ان کے قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے۔

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے۔ مسلمان ملک کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹیکس ادا کرتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول تقریباً ہندو اسکول ہیں۔ وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے لحاظ سے تمام تر ہندو ہے۔ مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں۔ ایسی حالت میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی بات ہے۔

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے' ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکاتب دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمام تر کفیل ہیں مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے بجا طور پر احتراز کرکے نہ تو خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلے میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں کم ہونا بالکل کھلی بات ہے۔ یو۔ پی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اس لئے ناکام ہے کہ ان کے لئے بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں۔

مکتبی تعلیم کا نظام | پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے جا بجا شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے۔ پورے ملک میں چھوٹے بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے۔ جامعہ ملیہ کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو بار بار پیش کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام سے ایک مجلس نے چند سال سے کام شروع کیا ہے اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلعے میں قائم کئے ہیں۔ اسی قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلعے میں ضرورت ہے جن کے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو اور ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی امداد کا جائز مطالبہ کریں اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغے کے سپرد کیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے خصوصاً جب وہ وقت آئے گا کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اس وقت مسلمانوں کے لئے علیحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج سے

زیادہ عیاں ہو جائے گی۔

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کی جائے اور اس کے لئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہل قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا اندرجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ، سہل سے سہل ہو۔ "حمایت اسلام لاہور" کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں استعمال کئے گئے ہیں۔ کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کر سکتا ہے۔ نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں۔ ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو۔

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآن پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآن پاک جلد سے جلد ختم ہو سکے۔ لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قواعد بغدادی یا یسرنا القرآن وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ پہلے بچے کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہو جائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند روز پڑھائی جائے۔ اس کے بعد قرآن پاک شروع کرا دیا جائے۔ اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کی جائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں! ور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کی جائے تاکہ اختلاف صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کر دے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے۔

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے۔ بدیسی نظام تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ

اور بے مزہ قصّے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذائے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کر ڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں۔

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں لیکن بہرحال انھوں نے اتنا پورے یقین کے ساتھ سمجھ کر طے کر لیا ہے کہ اگر ہم کو زندہ رہنا ہے تو با مقصد قوم ہو کر زندہ رہنا ہے۔ چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے۔ امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی۔ ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس نے کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے۔ ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیوں کر ہے وہ بہت بڑا ہے۔۔۔۔۔

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے۔ اللہ تعالیٰ، پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے۔

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے۔ ہم ترک ہیں۔ ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں۔ ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہوگا۔ جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہو جاتا ہے۔ میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں۔ جو میرے محبوب ملک کو نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں۔"

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پا لیا ہے اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو قوموں کی ان کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

(باقی آئندہ)

غالب

مصنفہ سید عبداللطیف پی ایچ ڈی (لندن) مترجمہ سید معین الدین قریشی، ایم اے (عثمانیہ)

غالب کو جس نظر سے دیکھئے وہ ایک عجیب و غریب تصنیف ہے۔ بہتر تو یہ تھا کہ اس کا اردو ترجمہ نہ کیا جاتا اس لئے کہ کتاب کے 'خدوخال' اس کا نشوونما اور اس کی روح سراسر انگریزی ہے اور اردو میں اس کی حقیقت تک پہنچنا ہر شخص کا کام نہیں ہے مثلاً کتاب کا نام ہے "غالب کی حیات اور اردو شاعری کی تحقیقی تحسین"۔ یہ پورا جملہ اگر انگریزی عبارت میں نقل کیا جائے تو انگریزی داں طبقے کے لئے اس کا مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے یعنی "A critical appreciation of his life and Urdu Poetry" درآں حالیکہ اردو زبان میں 'تحسین' کا لفظ وہ مطلب پوری طرح ادا نہیں کرسکتا جو ہم معنی انگریزی لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو ۱۳۰ صفحے کے اس مختصر رسالے کے اکثر اجزا پر صادق آتی ہے۔ اور جن ابواب میں شعر، صوفیانہ رنگ اور شخصی رجحانات وغیرہ سے بحث کی گئی ہے وہاں یہ خاصی مضحکہ خیز صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جناب مصنف نے اپنے دیباچے میں یہ بات کھول کر رکھ دی ہے کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی وہ قطعی غلطی پر ہیں۔ اور اگرچہ انھوں نے اس انکار کے بعد زباں دانی کا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا ہے لیکن زبان و ادب اردو کے متعلق اس عنوان سے اظہار خیال کیا ہے جس سے ان کی فطری بالغ نظری اس خاص میدان میں ایک معجزانہ حیثیت اختیار کرلیتی ہے یعنی وہ ادب و زبان کی ان گہرائیوں سے واقف ہیں اور ان سرچشموں کا کھوج نکالتے ہیں اور ان بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں جہاں اب تک اردو لکھنے اور بولنے والے لوگوں کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ معترض ہیں کہ "اپنی چار دیواری میں بیٹھ کر یہ حضرات اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اردو ادب ابھی عالم عنفوان میں ہے۔ وہ ابھی عبوری دور میں ہے اور شباب کی منزل مقصود کی طرف جادہ پیما، لیکن عنفوان اور عنفوان سے شباب تک پہنچنا دور کی بات ہے"۔

اب یہ دور کی کوڑی لانے کا کام انھوں نے اپنے ہی ذمے رکھا اور اپنے زعم باطل میں یہ سمجھا ہے

کہ کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں۔ اسی دیباچے میں نقادانِ ادب اردو کو وہ ان الفاظ میں یاد فرماتے ہیں کہ "دیوانۂ ثار افراد کی یہ برادری روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ادبی رائے زنی کے احساس تناظر کا گلا گھونٹتی رہی"۔ اس "احساس تناظر" کی حقیقت جناب مصنف نے واضح نہیں فرمائی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے حقائق ان کی تصنیف کے آیندہ صفحات میں بے شمار نظر آتے ہیں اور ع مدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا بے اختیار یاد آجاتا ہے۔

باب اول میں جناب مصنف نے مولانا حالی مرحوم اور ڈاکٹر بجنوری دونوں پر یکساں تنقید فرمائی ہے اور خلاصہ اس کاوش کا یہ ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو فن تنقید سے لگاؤ نہ تھا اور ڈاکٹر بجنوری باوجود مغربی تعلیم کے اپنے جوش عقیدت سے مجبور ہو کر گمراہی پر اتر آئے۔ آپ کو یہ بھی شکایت ہے کہ "حالی و بجنوری دونوں کے طرز تنقید میں ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ ایک آدھ شعر سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ غالب ہیئت داں اور فلسفی، واعظ اور عاشق سبھی کچھ تھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ شعر میں فلسفے کا کوئی مسئلہ بیان کر دینا اور بات ہے اور شاعر کو فلسفی قرار دینا بالکل دوسری چیز۔ اگر کسی شعر میں یہ ممکن ہے کہ اس کے چھوٹے سے اعضائے ترکیب میں ایک مسئلہ ہیئت و فلسفہ کا یا حکمت و موعظت کی کوئی بات سما سکے تو یہ غزل کا کمال ہے اور اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں لیکن اس حقیقت کی غلط تاویل کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔

باب دوم سے باب چہارم تک جناب مصنف نے اپنا زور قلم محض فن تنقید کی پرورش اور توضیح میں صرف فرمایا ہے اور یہ نہایت دلچسپ، مفید اور قابل قدر ہے۔ لیکن غالب کی زندگی اور غالب کی شاعری کو دیکھنے اور سمجھنے میں اس سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے یہ ایک سوال ہے جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو اپنی کتاب پر نہیں بلکہ فن تنقید کے ان اصولوں پر دوبارہ نظر فرمانی چاہیے جن کی بنیاد پر "تنقیدی تحسین" کی یہ پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

اس مختصر رسالے کے ۲۰۰ صفحات اصول تنقید کو واضح کرنے کے لئے صرف کئے گئے ہیں اور کلام غالب کی تنقید صرف ۲۰ صفحے میں ہے۔ ان ۲۰۰ صفحات میں دیوان اور مکتوبات کی تاریخی ترتیب واضح کی ہے اور اس کی روشنی میں شاعر کی حیثیت اور اس کے مرتبے کو جانچنے کی کوشش کی گئی ہے اور اعتراض یہ ہے

کہ مولانا حالی نے "مطلق ماخذ کو تاریخی لحاظ سے ترتیب نہیں دیا اور کمال یہ ہے کہ باوجود اتنی مدت گزر جانے کے سید عبداللطیف صاحب نے یہ کارنمایاں انجام دیا ہے۔"

باب چہارم سے وہ حصہ شروع ہوتا ہے جس میں جناب مصنف نے غالب کی شاعری کو اس کے سوانح حیات کے اثر اور ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ واقعات زندگی سے ان کیفیات کا سراغ لگانا چاہتے ہیں جن کی اثرپذیری نے غالب سے شعر کہلوائے اور جن کا انعکاس مضامین شعر میں ہوا ہے۔ اسی کوشش میں غالب کی زندگی کے خاص اور اہم واقعات کو بنیاد قرار دے کر اس زمانے کے مکتوبات و غزلیات میں ان سے مترتب ہونے والے تاثرات کی تلاش کی گئی ہے۔ یقیناً یہ کوشش اور مشغلہ دلچسپ ہے لیکن یہ کام ایسے شخص کی دسترس سے باہر ہے جس نے بقول بعض حضرات " اردو کے دامن میں پرورش نہیں پائی بلکہ جنوبی ہند کی محض ایک غیر تربیت یافتہ بولی دکھنی کا آغوش یافتہ ہے"۔ اور یہ حقیقت اس وقت بھی ناقابل انکار ہے جب کہ وہ محض غالب کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے "شعری عمل" کے لئے جداگانہ عنوانات قائم کر سکنے کا بھی اہل ہو مثلاً (۱) ابتدائی ہیجان (۲) القار (۳) تصور (۴) لفظیات شعر (۵) تنظیم شعر اور صورت شعر کے معیار قائم کر کے غالب کے شعر کو جانچنا دوسری بات ہے اور واقعات زندگی کا اشعار سے براہ راست تعلق نکالنا بالکل دوسری چیز جو بجز اتفاقی شاعری کے عام طور پر پورے وثوق کے ساتھ ثابت نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ غزل میں رسمی اوزان و قوافی ہیں اور ایسا مانوس طرز ادا کہ اس انبوہ میں سے دل کی پھانس چن لینا آسان کام نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ صدہا سال سے ایشیائی ممالک میں دیوان حافظ سے لوگ تفاول کرتے ہیں اور ہر شخص اپنے مطلب کا "القار" بلکہ "حقیقت الامر" اور "واقعات آیندہ" ان ہی اشعار میں پالیتا ہے جو بالعموم ہر شاعر کے دیوان میں اسی مضمون پر اور اسی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ پھر استعارہ و تشبیہ اور زبان کی نزاکتوں اور گہرائیوں میں الجھنے کے باوجود کسی متعین واقعے کو ان سے صحیح طور پر متعلق کر لینا آسان نہیں۔

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام ۔۔۔ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو، ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر

غزل کی ماہیت پر اگر دوسرے پہلو سے نظر کی جائے تو واضح ہو گا کہ وہ نہ مسلسل نظم ہے اور نہ قطعہ بلکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مکمل مضمون ہے۔ ان چند مکمل مضامین میں سے ایک یا دو متعلق واقعات ہو سکتے ہیں اور باقی اشعار کا غیر متعلق ہونا ناگزیر ہے۔ پھر اس انتخاب کا طریقہ کیا ہو گا؟ کیا اس کے لئے بھی اول "مواد" پیدا کر کے "ماخذ" و "رہنما" تلاش کئے جائیں؟ کیا ان الفاظ کی مدد سے دل کے پردے کھل سکتے ہیں اور زندگی کی تاریکیاں منظر عام پر آسکتی ہیں؟ ڈاکٹر عبداللطیف کو اپنی ادبی بصیرت اور صحت مذاق پر کچھ اس بلا کا اعتماد ہے کہ وہ ان چند معیاروں سے جن کی وضاحت میں ان کی کتاب کا بڑا حصہ وقف ہے اس غمازی کا فرض ادا کرنا چاہتے ہیں جس کی اہلیت مبدءِ فیاض نے عام مخلوق میں ودیعت نہیں کی اس لئے کہ وہ شرافت نفس کو اپنی شان ستاری کا ایک پرتو قرار دے کر دنیا میں حسن اخلاق کا وجود قائم رکھنا چاہتا ہے تاکہ بدگمانی، تنگ نظری، دریدہ دہنی اور عیب جوئی ادبی تنقید کا نصب العین نہ بن سکے۔

باب پنجم اسی مسئلے کی تطبیق ہے جس میں غالب کا زاویۂ نگاہ "زندگی کے متعلق" بیان کیا گیا ہے اور خارجی اثرات سے اس کی سیرت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ جن واقعات نے "غالب کی دماغی رَو بدل دی" وہ (۱) قمار بازی کے جرم میں سزائے قید اور (۲) واقعۂ غدر ۱۸۵۷ء ہیں۔ ان دونوں واقعات کا یہ اثر ہوا کہ غالب "مردم بیزار" ہو گیا اور اگرچہ اسباب دنیا میں سے اکثر اس کو میسر تھے، علم و فضل کی قدردانی بھی ہوئی، خطاب و خلعت سے سرفراز ہوا اور شہرت و عزت بھی پائی، معاش کی تنگی نہ تھی، ہمدم و ہمساز بھی تھے "لیکن غالب کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ نہ تو عطائے رحمانی کا شکر گزار تھا اور نہ کسی انسانی خدمات کا۔ خلاف مردانگی وہ ہمیشہ کڑھتا ہی رہا۔"

اگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ معیار تحقیق و اصول تنقید کو یہاں استعمال کیا جائے (جس کے لئے ہمیں ۲۰۰ صفحات لکھنے کی ضرورت نہیں) تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب تک جس قدر ژرف نگاہی صاحب

ممدوح نے صرف فرمائی ہے وہ انھیں چند جملوں کے لکھنے کے لئے تھی ورنہ کلام غالب نہ اس قابل تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس پر توجہ فرماتے اور نہ مرزا غالب کی سیرت جوان واقعات سے متاثر ہو چکی تھی ایسی چیز تھی جس کو کوئی صاحب فکر و اہل قلم اپنی توجہ کا مرکز بنانے پر آمادہ ہوتا اس لئے کہ "خلاف مردانگی" کا ثبوت حاصل ہو جانے کے بعد کسی سلجوقی سپاہی یا بلند پایہ شاعر کے متعلق اگر کچھ کہا بھی جائے تو کیا۔

غالب کے جن اشعار سے اس نظریے پر اسقدر وثوق سے استدلال کیا گیا ہے ان کو یہاں نقل کرنا بے سُود ہے اس لئے کہ خود جناب مصنف کو تسلیم ہے کہ "یہ جستہ جستہ اشعار ہیں جن میں شخصی عنصر شاید زیادہ نہ ہو" اس امر کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ ان اشعار میں شخصی عنصر نہیں ہے اس ادعا کے لئے جس بے دردی کا ثبوت جناب مصنف نے دیا ہے اس کی لے غالب کی "خلاف مردانگی" بے اطمینانی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ اب ان اشعار کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان کی تعداد نو ہے اور اگرچہ حق انتخاب مجھے حاصل نہیں لیکن اس مضمون خاص پر یہ تین شعر بہترین ہیں:۔

۱ مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں ۔ سوائے خون جگر سو جگر میں خاک نہیں

۲ زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ۔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

۳ نومیدیِ ما گردشِ ایام نہ دارد ۔ روزے کہ سیہ شد سحر و شام نہ دارد

ان اشعار سے ڈاکٹر صاحب کی فکر رسا کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

دوسرا ثبوت مثنوی گہر بار ہے۔ اس کی حقیقت اور اس پر اعتراض کی نوعیت بھی خود ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ 'جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے' مرزا کا کمال بدبیں کی نظر میں بھی چمک اٹھتا ہے اور جس لطیف شاعرانہ تخیل کی مذمت کی جا رہی ہے وہی اس کا اعجاز ہے لیکن اب سید عبداللطیف صاحب کو سمجھانے والا کہاں سے پیدا کیا جائے۔ شاید ایسا دیدہ ور مرزا غالب کو بھی میسر نہ آتا کہ ع عنقا را بلند است آشیانہ۔ فرماتے ہیں کہ

"یہ ایک طویل مناجات ہے جس میں رحمت الٰہی کو جوش دلایا گیا ہے کہ اس کی انتہی

کمزوری کو بخش دے۔ اس مقام پر امید تھی کہ غالب کا سرِ نیاز جھک جائے گا کہ اس نے کفرانِ
نعمت کیا اور اپنی ان خداداد قوتوں کو خام مقصد کی تلاش میں ٹھکرا دیا جس سے وہ آشفتہ حال
اسیرانِ مصیبت کو مسرت و راحت کے لازوال نغمے سنا سکتا تھا۔ لیکن غالب ایسا کیوں
کرنے چلا تھا۔ وہ پھر کر الٹا خدا ہی کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے
زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا یہاں تک کہ وہ عطیاتِ ربانی کا دلی شکریہ بھی
ادا نہیں کر سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب نے اصولِ تنقید بیان کرتے ہوئے بار بار اس خطرے سے آگاہ فرمایا ہے کہ چند اشعار
سے کوئی عام نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مثنوی ابرِ گہر بار کے بھی چند ہی اشعار نقل کئے گئے ہیں اور جو نتیجہ نکالا گیا ہے
وہ واقعے اور مضمون دونوں کے خلاف ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ (۱) غالب کا سرِ نیاز مناجات میں بھی نہ جھکا۔
(۲) خدا کو موردِ الزام قرار دیتا ہے کہ اس نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا! اس سلسلے
کے متعلق جو غلط فہمی ڈاکٹر صاحب کو ہوئی وہ بالکل قابلِ معافی ہے اس لئے کہ شاید ان کے لئے یہ دشوار ہے
کہ مناجات میں شکایت اور شکوے کی نزاکت کو محسوس فرما سکیں اور غالباً یہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے کہ
وہ اس جذبے تک پہنچ سکیں جس کی بنا پر دل شکستہ خدا سے شکایت کرتا ہے کہ" اس نے ظرف و حوصلے سے
زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا"۔ یہ خدا کی شکایت ہے یا ظرف و حوصلے کی؟ ع

یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایتِ ظرفِ آستیں ہے

معلوم نہیں سید معین الدین قریشی صاحب جو "غالب" جیسی گراں مایہ تصنیف کو غالب کی زبان
بولنے والوں تک پہنچانے کے ذمے دار ہیں محض " لفظیات " تک دلچسپی رکھتے ہیں یا کبھی انھوں نے ڈاکٹر
عبد اللطیف سے شکوۂ باری، شکوۂ فلک، شکوۂ دوست، شکوہ عدو، شکوۂ ہجر وغیرہ وغیرہ مختلف اسالیبِ
ادا کی نزاکت و خوبی پر گفتگو بھی فرمائی ہے۔ بہرحال ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ شکوہ شعر و سخن میں ہزاروں معنی
پیدا کرتا ہے اور جو شخص طویل مناجات میں رحمتِ الٰہی کو جوش دلانے کے لئے شکوہ کرتا ہو اور وہ بھی زبان
شعر میں تو یقیناً وہ " خدا کو موردِ الزام نہیں قرار دیتا " اور اگر شکایت والزام صرف اسی قدر ہے کہ " اُس

نے ظرف و حوصلے سے زیادہ غم اس کے حصے میں دے دیا" تو ظاہر ہے کہ یہ شکایت خود اپنی کوتاہی اور بے کسی کا اعتراف ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اردو اور فارسی زبان کے شعرا تک ڈاکٹر صاحب کی نظر ہو یا وہ کسی دوسرے واسطے سے ان تک پہنچ سکیں (جیسے کہ وہ ورڈس ورتھ، شیلے، براؤننگ، آرنلڈ، شکسپیر، ملٹن تک پہنچے ہیں بلکہ ان شعراء سے گزر کر سینٹ پال تک بلند پروازی فرمائی ہے) تو ان کو معلوم ہوگا کہ یہ طرز کلام کسی شاعر کے لئے معیوب نہیں اور نہ وہ "مردم بے زاری" کی آخری حد ہے بلکہ

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

نیز اس مسئلے کے متعلق ایک قول فیصل ہے جس سے خواہ ڈاکٹر صاحب کی تسکین نہ ہو لیکن دوسرے لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں یعنی

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ مرزا مذہب کے معاملے میں اس قدر "صلح کل" کیوں ہے، اس نے وہابی فرقے کے خلاف کیوں لکھا، اپنے تئیں اثنا عشری کیوں کہتا ہے اور بعض شیعہ حضرات کے خلاف کیوں قلم اٹھایا، اور انتہا یہ ہے کہ اس نے مندرجہ ذیل رباعی کیوں لکھی (وھو ہذا)

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو دے صوفی   شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں خود غالب کی کہی ہوئی موٹی بات بھی نہیں آسکتی کہ مذہب کے متعلق غالب کا یہ رویہ اس لئے تھا کہ وہ صوفی تھا اور اس کا اعلان اور اقرار کرتا ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ صوفی کے کیا معنی؟ تو صوفی کے خواہ کچھ معنی ہوں اور اس کے عقاید کچھ ہی کیوں نہ ہوں اس قدر یقینی ہے کہ وہ بے انتہا بے تعصب، وسیع نظر اور "صلح کل" ہوتا ہے اور پڑھا لکھا صوفی تو کچھ اس سے بھی زیادہ۔

اسی طرح غالب کی وطن پرستی کا معاملہ ہے۔ بے شک وہ انگریزوں کو پسند کرتا تھا، گورنروں اور کمشنروں کے لئے قصائد لکھے اور تعریفوں کے پل باندھ دئے لیکن وہ دلی کی بربادی اور ہندوستان کی سوگواری پر بھی آنسو بہاتا تھا۔ اگر اس عہد کے حالات جاننے والے لوگوں سے کبھی ڈاکٹر عبداللطیف کو

ملنے کا موقع ملے تو وہ اس متضاد جذبے کو بیشتر لوگوں میں پائیں گے۔ غالب اس معاملے میں منفرد نہ تھا اور نہ یہ کمینہ پن اور دنائتِ طبع کی دلیل تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے قطعی درست ہے کہ وہ موجودہ دور کا قوم پرور نیشلسٹ نہیں تھا اور جن لوگوں نے اس کی وطن پرستی کے گیت گائے ہیں وہ بھی حقیقت سے بالکل دور نکل گئے ہیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے "صوفیانہ رنگ" کا جلی عنوان قائم کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ:

"غالب کے کئی نقادوں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ بات بھی بتلائی ہے کہ وہ بڑا صوفی تھا۔ واللہ اعلم! کسی خیال کا ذہنی ادراک اور چیز ہے اور اس میں بس جانا اور بات۔ اس کے علاوہ ایسے فقرے جو صوفیانہ مسلک کے حامل ہیں غزل گو شعرا کی قدامت پست دکانِ سخن میں عرصے سے موجود ہیں۔ دیکھئے خود غالب اس خصوص میں کیا کہتا ہے 'آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔' محض اس بنا پر کہ غالب کے اشعار میں صوفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں ہمیں یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئے کہ وہ صوفی تھا۔"

میں جناب مصنف کو بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کے کسی نقاد نے آج تک یہ نہیں کہا کہ وہ "بڑا صوفی تھا" اور اس کہنے کے یہ معنی کبھی نہیں ہوتے کہ مرزا اسداللہ خاں غالب گلی قاسم جان والی مسجد میں فرغل لپیٹے ایک گوشے میں مراقب بیٹھے رہتے تھے، جب کبھی حالتِ استغراق میں افاقہ ہوتا ارادت مندوں کا مجمع ان کو گھیر لیتا اور سلسلۂ رشد و ہدایت جاری ہو جاتا تا آنکہ وہ نماز کے وقت اسی طرح شریکِ نماز ہوتے مگر کبھی صفِ اول سے قدم نہ بڑھاتے اور نہ زبان طعن و شکوہ دراز کرتے بعد عصر مسجد سے قدم باہر نکالتے اور ہزارہا اربابِ حاجت پیچھے پیچھے نظر آتے لیکن وہ اپنی شانِ انکسار میں نہ گردن موڑ کر دیکھتے اور نہ کسی کو یہ جرأت ہوتی کہ آگے بڑھ کر اپنی احتیاج پیش کر سکے۔ پھر قدم شریف میں حلقہ قائم ہوتا اور نمازِ مغرب کے بعد ذکرِ جہر شروع ہو جاتا اور پھر یہ سرمستانِ حسنِ ازل اسی طرح آخر رات تک وہاں مشغول طاعتِ حق رہتے!! کیا صوفی کے صرف یہی معنی ہوتے ہیں؟

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جا است!

کاش ڈاکٹر صاحب کسی کاوش کی تکلیف نہ اٹھاتے اور نہ تحقیق کی الجھنوں میں بھٹکتے پھرتے۔
غالب نے جو کچھ کہا سچ کہا "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف اور کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونیت طبع کے یہاں کیا رکھا ہے۔" جس کسی نے غالب کو صوفی بتایا وہ ان ہی معنوں میں کہ اس کے اشعار میں مضامین تصوف پائے جاتے ہیں اور بقول ڈاکٹر صاحب یہ وہی اشعار ہیں جو "غزل کو شعرار کی قدامت پرست دکان سخن میں عرصے سے موجود ہیں" اور بس۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو غالب کی سیرت اور اس کے ذاتی حالات میں دھبہ لگانے کا جو شوق دامن گیر ہے اس کا تقاضا ہے کہ وہ بغیر سبب عیب پیدا کرتے ہیں اور افسوس یہ کہ یہ کام بھی ان کے بس کا نہیں، اس لئے کہ جس قدر دعاوی انھوں نے اس بحث کے سلسلے میں فرمائے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا ثبوت وہ فراہم کر سکے ہوں۔ ابتداءً خارجی اثرات کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کی ذات میں بٹہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس مکروہ ذہنیت کو تحقیقات علمی کا جامہ پہنا کر غالب کے باپ دادا کو اس لئے ذلیل قرار دیا ہے کہ ان کا پیشہ " اجورہ داری" تھا اور اس پیشے کی ارذل خصوصیات وراثتاً غالب کی سیرت کا جزو بن گئی ہیں لیکن وہ اپنی اس " تجویز" کو پایۂ تحقیق تک پہنچانے کے لئے دوسرے اہل علم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ نظریۂ توریث کو تسلیم کرنے کے بعد غالب کے ذاتی عیوب اور ذہنی رکاکت کے ثبوت فراہم کریں اور اگر نظریۂ توریث کے قائل نہ ہوں تو دوسرے طریقوں پر ان عیوب کا سراغ نکال کر ان کو نمایاں کریں۔ لیکن غالباً عام طور پر اردو بولنے والے اس بنیادی اور نسبی عیب کی حقیقت نہ سمجھے ہوں جس کو مصنف نے " اجورہ داری" سے موسوم کیا ہے۔ ان کی تصنیف کے اکثر اجزار کی طرح یہ بھی انگریزی لفظ Mercenary کا غیر معروف ترجمہ ہے جس کے معنی انگریزی میں جو کچھ بھی ہوں اردو میں مرزا غالب کے آباد اجداد کے پیشہ سپہ گری کو ظاہر کرتا ہے۔ فن سپہ گری سے دنائت و رکاکت کو اس لئے وابستہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے دور انحطاط میں بعض اشخاص فوجی ملازمت قومی اغراض کے خلاف قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن اس زمانۂ ہیجان و ابتلا میں قومی اغراض

کیا تعلق یہ ایک وسیع سوال اور جداگانہ مبحث ہے اور اس سے خود مصنف کو بھی بحث نہیں۔

باب ششم میں پر عظمت شاعری کو واضح کرنے کے لئے غیر ملکی نقادان فن کے مختلف اقوال نقل ہیں اور اس کے بعد غالب کے کلام پر اصل تنقید شروع ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ حصہ ہے جو سب سے زیادہ غیر دلچسپ اور بے معنی ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق کچھ لکھنا خود ڈاکٹر عبداللطیف صاحب پر ظلم ہوگا اس لئے کہ نہ وہ اس مضمون سے دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ اس کو سمجھنا چاہتے ہیں

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ڈاکٹر صاحب کی روایت کے مطابق غالب اور خدا کے تعلقات بھی اچھے نہ تھے ورنہ شاید یہ امید ہوتی کہ غالب کی یہ دعا جو اس وقت میرے واسطے سے ان کے لئے کی گئی ہے مقبول ہو جائے اور ان کو "اور دل" مل جائے تب کہیں یہ مشکل حل ہو سکے۔ کلام غالب پر جو تنقید کی گئی ہے اس کی ایک مثال بھی اگر پیش نظر ہو تو سطور بالا کی حقیقت واضح ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے　　　عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا

"بتلایئے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے۔ اگر حیدرآباد سے کسی شخص کو لندن لے جانے کے وسائل حاصل ہو جائیں اور وہاں پہنچ کر سینٹ پال کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھے تو وہ یقیناً قدیم لندن کی سرزمین پر ایک طائرانہ نظر ڈال سکے گا لیکن اصل مرحلہ تو یہ ہے کہ پہلے وہ لندن جائے اور پھر اس کو وہاں کے مشہور و معروف گرجا پر چڑھنے کا موقع حاصل ہو۔ کیا غالب کو اپنی اس زندگی میں کبھی عرش کے آستانے تک بھی رسائی ہوئی؟"

میرے ایک دوست سوال کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کو سینٹ پال تک تکلیف کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی کیا چار مینار جو گھر کے گھر ہی میں تھا اس قابل نہ تھا کہ اس کی مثال دی جا سکتی اور اگر عرش آشیاں ہونے کے لئے یورپ کا سفر ضروری تھا تو پھر ایفل ٹاور اس کام کے لئے زیادہ موزوں تھا کہ پیرس کی دلکشی اور مینار کی بلندی دونوں اپنی خصوصیات میں ممتاز ہیں۔ دوسرے یہ بھی دریافت طلب ہے کہ عرش کے لئے کوئی آستانہ ضروری ہے یا نہیں اور عرش اور اس کے آستانے میں کوئی

حدود واضح ہیں یا ان دونوں کے لئے کوئی ایسا معیار ہے جس سے ذہن ان کی حقیقت تک پہنچ سکے مختصر یہ کہ عرش کسے کہتے ہیں اور اس کا آستانہ کیا چیز ہے؟ کیا عبداللطیف صاحب اس کا جواب دے سکتے ہیں؟

جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا جا چکا ہے "غالب" نہ صرف انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے بلکہ اس کی "ترکیب اعضا" ، طرز ادا، معیار تنقید، غرض یہ سب کچھ انگریزی ہے جس مغربی ذہنیت سے مصنف نے مشرق کے بلند پایہ شاعر پر نکتہ چینی کی ہے وہ سادگی کی دلیل ضرور ہو سکتی تھی اگر اس میں اپنی سیرت کی خصوصیات اور عالی ظرفی کے رجحانات کو دخل نہ دیا جاتا اس لئے کہ اب وہ کتاب ایک فتنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بجز گمراہی اور فساد خیال کے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصل انگریزی میں اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اس لئے کہ اردو ادب سے ناواقف مطالعہ کرنے والے مرزا غالب کی نسبت جو رائے قائم کریں گے وہ اصل حقیقت کے بالکل خلاف ہوگی۔ ہمیں حیرت ہے سید معین الدین قریشی پر کہ انھوں نے اپنی قابلیت اور وقت کا یہ مصرف کیوں نکالا کہ "غالب" جیسی کتاب کو اردو میں ترجمہ کرکے پیش فرمایا اور یہ حیرت محض اس لئے ہے کہ ترجمہ اچھا ہے اور زبان شگفتہ ورنہ جہاں تک ان کے جذبۂ شوق کا تعلق ہے وہ خوشی سے اس سعادت میں شریک ہوں اور غالب کو مطعون کرنے میں امداد فرمائیں لیکن شاید وہ واقف نہیں کہ اس کتاب میں مصنف کا طرز استدلال اور اظہار خیال آپ اپنی تشریح ہے اور مطالعے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جناب مترجم نے غالب کو زیر بار احسان کیا ہے یا ڈاکٹر عبداللطیف کو رسوا کرنا چاہا ہے۔

"دکھنی کا آغوش یافتہ" بجائے "تربیت یافتہ" کے استعمال کیا گیا ہے (ص ب)۔ "اجورہ دار" Mercenary کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے لیکن جس موقعے پر استعمال ہوا ہے وہاں نہ یہ مطلب ادا ہوتا ہے اور نہ سپاہی و عسکری کے معنوں میں یہ استعمال کیا جا سکتا ہے (ص ۶۰)۔ ایک موقعے پر لفظ "خانہ ساز" کا عجیب وغریب استعمال ہوا ہے اور افسوس کہ اسی جملے میں غالب کی تعریف بھی کی گئی ہے خواہ دوسروں ہی کی زبانی کیوں نہ ہو۔ ملاحظہ ہو:-

"اس لحاظ سے اس کو اردو نثر کے خانہ سازوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔"

جناب مترجم نے غالباً انگریزی لفظ Architect کا ترجمہ فرمایا ہے لیکن اردو زبان میں "خانہ ساز" دوسرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس کو فن تعمیر و بنائے مکان سے صرف دور کا واسطہ ہے۔ یا ایک دوسری جگہ لکھا ہے "جو صاحب اصل مسودے پر کام کرنا چاہیں"۔ یہ جملہ زیادہ غیر مانوس نہیں لیکن اردو میں یہ مطلب دوسری طرز سے ادا کیا جاتا ہے، محض انگریزی کی نقالی اردو کے لئے باعث فخر نہیں ہے۔ ایک موقعے پر لکھا ہے کہ "اب ہم پھر غالب کی طرف رجوع ہوتے ہیں"۔ "رجوع کرنا" عام طور سے مستعمل ہے اور فصیح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عبداللطیف کی یہ تصنیف ذہنی غلامی کی مکمل مثال ہے۔ انھوں نے اس روح سے کام لیا ہے جو آج سے چند قرن پہلے یورپ کے تعلیم یافتہ افراد میں ظاہر ہوتی تھی اور جس کے بعض نمونے اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی، اقبال اور پھر سیاسی و اجتماعی تحریکات نے اس غلامی کے خلاف جہاد کیا اور مسلسل جد و جہد کے بعد اب عزت نفس کی حقیقت ہندوستانیوں پر کچھ کچھ منکشف ہو چلی ہے لیکن اس لعنت کے جراثیم امراض وبائی کی طرح کبھی کبھی سر اٹھاتے رہتے ہیں اور ڈاکٹر عبداللطیف کے اس کتابی پیکر میں یہی مادۂ فاسد اب پھر رونما ہوا ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کسی دوسرے موقعے پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے
انھیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات ان کی

بلاغت اور اس کی مختصر تاریخ

قوت گویائی انسان کی ایک اہم ترین صفت ہے جس کے بغیر وہ اپنی تمدنی اور معاشرتی مشکلات حل نہیں کرسکتا۔ قدرت نے جس طرح ہر چیز کو حسن و قبح کے دو پہلو عطا فرمائے ہیں زبان کو اس فطری اور نیچرل تقسیم سے محروم نہیں رکھا۔

یہ قوت ہر شخص میں حسب قابلیت کم و بیش پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ معمولی طریقے سے بھی اپنے دل کی بات دوسروں کو نہیں سمجھا سکتے اور بعض معمولی سے معمولی بات کو بھی اس خوبصورتی سے ادا کرسکتے ہیں جس کا سامعین پر اچھا خاصا اثر پڑتا ہے۔ زبان کے اسی خوبصورت پہلو کا نام بلاغت ہے۔

معاشرت انسانی کی مختلف ضرورتوں کے اعتبار سے جب کوئی زبان عالم وجود میں آتی ہے تو جس طرح ابتدا میں معاشرت کے طریقے سیدھے سادے اور بے تکلف ہوتے ہیں اسی طرح زبان بھی شروع شروع نہایت سادے لباس میں جلوہ نما ہوتی ہے۔ مبالغہ اور مضمون آفرینی کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ تشبیہات و استعارات شاذونادر کہیں کہیں آجاتے ہیں۔ جس مضمون کو ادا کرنا ہوتا ہے اس کو بغیر کسی ایچ پیچ کے بے تکلف ادا کردیا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں معاشرت کے طریقے وسیع ہوتے جاتے ہیں سامان زندگی میں تکلفات پیدا ہوتے جاتے ہیں، نفاست و لطافت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قدر زبان بھی تمدن کے ساتھ ساتھ عروج کرتی جاتی ہے، الفاظ میں تراش خراش پیدا ہوجاتی ہے، استعارات و تشبیہات میں نزاکت اور رنگینی آجاتی ہے، مبالغے میں زور اور مضمون نگاری میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

عربی ادب میں جاہلیت کا کلام دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کوہ و صحرا، دشت و بیابان، دشوار گزار راستے اور مٹے ہوئے کھنڈر ان کے ادبی ذوق کے جولان گاہ تھے لیکن یہی جادہ پیما عرب جب حکومت اور دولت کے منصب پر فائز ہوئے تو ان کے کلام میں دقت آفرینی اور رنگیں بیانی کی کوئی حد نہیں رہی جس کا صحیح اندازہ متنبی، ابونواس بحتری، ابوتمام وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

ہر زبان کے لٹریچر سے بلاغت کو وہی تعلق ہے جو روح کو جسم سے ہے۔ کلام میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب وہ بلیغ انداز سے ادا کیا گیا ہو اور سامعین پر کوئی خاص اثر ڈالتا ہو ورنہ ناقابل التفات سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

بلاغت چونکہ ایک فطری اور وجدانی چیز ہے اس لئے چند الفاظ میں اس کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں کی جاسکتی۔ گو متاخرین نے اس کو الفاظ کی زنجیروں میں جکڑ کے دریا کو کوزے میں بند کرنا چاہا ہے لیکن دراصل اس کے ذوقی اور وجدانی ہونے کی وجہ سے یہ راہ عمل غلط ہے بلکہ متقدمین کے مسلک کے مطابق اس کی حقیقت کا مختلف طریقوں سے سمجھنا دراصل صحیح ہے تاکہ ان سب کے مجموعے سے بلاغت کا ایک صحیح نقشہ پیش نظر ہو جائے۔

عربی علم بلاغت پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی بلیغ کلام کی جانچ پڑتال کے لئے کچھ قواعد مقرر نہ تھے بلکہ بلاغت کے ان طبعی اور فطری اصول پر جو قدرت نے ہر سخن فہم اور دقیقہ سنج طبیعت کو عنایت فرمائے ہیں کلام کے حسن و قبح کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔

اس فن کی تدوین کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب دنیا کے سامنے داعیِ حق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید پیش کیا اور ساتھ ہی اس کے اعجاز اور بلیغ ہونے کا دعویٰ بھی کیا۔ علمائے کرام نے اس دعوے کے ثبوت کے لئے اصول بلاغت کی طرف توجہ کی۔ عربی زبان میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ علوم و فنون مدون ہونے لگے اور عربی زبان کی گرامر مرتب کی گئی۔

سب سے پہلے حضرت علیؓ نے ابوالاسود دؤلی کو جو آپ کے شاگرد اور کبار تابعین میں سے تھے عربی گرامر کے چند قواعد کی تعلیم فرمائی۔ ابوالاسود دؤلی نے انھیں پر قیاس کرکے چند اور اصول مرتب کئے اور حضرت علیؓ کی خدمت میں پیش کرکے ان کی تصحیح بھی کرائی۔

علامہ ابن خلدون نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

اول من کتب فیہا ابوالاسود الدؤلی من بنی کنانۃ ویقال باشارۃ علی	ابوالاسود دؤلی پہلا شخص ہے جس نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

رضی اللہ عنہ۔ | کے اشارے سے کیا تھا۔ (مقدمۂ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۸۰)

کتاب کی شکل میں سب سے پہلے علامۂ جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ)، نے ایک تصنیف پیش کی جس کا نام "کتاب البیان والتبیین" ہے۔ اس کا دوسرا نام "التبیین والتبیان" بھی ہے۔

جاحظ اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل انشا پرداز تھا۔ لوگ اس کو ادبار عرب کا سردار اور فصاحت و بلاغت کا امام مانتے ہیں۔ ارباب علم و ادب میں شاید ہی کوئی شخص اس کے مرتبۂ کمال تک پہنچا ہو۔

اس نے یوں تو مختلف فنون میں بہت سی بے نظیر کتابیں لکھی ہیں لیکن "البیان والتبیین" سے ان کو کوئی نسبت نہیں۔ یہ اپنے موضوع پر بالکل اچھوتی سب سے بہتر کتاب ہے۔ اس میں خطبار و شعرار کا کلام، دلچسپ حکایات و لطائف اور مواعظ کے نمونے بڑی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔

علامہ ابن خلدون نے فن ادب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

سمعنا من شیوخنا فی مجالس التعلیم ان اصول ھذا الفن و ارکانہ اربعۃ وھی ادب الکاتب لابن قتیبہ و کتاب الکامل للمبرد و کتاب البیان والتبیین للجاحظ و کتاب النوادر لابی علی القالی وماسوی ھذہ الاربعۃ فتبع لھا و فروع عنھا

ہم نے اپنے اساتذہ سے علمی درسگاہوں میں سنا ہے کہ اس فن کے اصول و ارکان صرف چار کتابیں ہیں۔ ابن قتیبہ کی ادب الکاتب، مبرد کی کتاب الکامل، جاحظ کی کتاب البیان والتبیین اور ابو علی القالی کی کتاب النوادر۔ ان چار کے علاوہ بقیہ کتابیں سب انھیں کی تابع اور فروع ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۴۸۶)

اسی صدی ہجری میں عبداللہ بن المعتز عباسی (المتوفی ۲۹۶ھ)، بھی تھا۔ یہ اپنے عہد کا بہت بڑا نازک خیال اور بلیغ شاعر تھا۔ اس نے بھی اس موضوع پر چند کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کتاب البدیع سب سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ فن بدیع میں سب سے پہلی کتاب ہے۔

علامہ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیہ" میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے

لکھا ہے کہ کتاب البدیع کا ایک نسخہ اب تک کتب خانۂ اسکوریال میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

چوتھی صدی ہجری میں قدامہ ابن جعفر بغدادی (المتوفی سنہ ۳۱۰ھ) نے تنقید نثر و نظم پر سب سے پہلے نقد الشعر اور نقد النثر دو مستقل کتابیں لکھیں جن میں سے نقد الشعر زیادہ مقبول ہوئی۔ آج کل بعض یونیورسٹیوں میں داخل نصاب ہے۔

اس کتاب میں نہایت خوبی سے شعر کی تعریف کی گئی ہے اور لفظ و معنی کی باہمی ترکیب کے اعتبار سے شرائط نظم مفصل بیان کئے گئے ہیں۔

قدامہ نے اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تذکرہ صاحب الفہرست نے صفحہ ۱۳۰ میں کیا ہے۔

کچھ عرصے کے بعد ابو ہلال عسکری (المتوفی سنہ ۳۹۴ھ) نے نثر و نظم کی تنقید کے سلسلے میں ایک اور قیمتی کتاب تصنیف کی جس کا نام کتاب الصناعتین ہے۔ اس کتاب میں نثر و نظم کے بلند پایہ انتخابات، چیدہ چیدہ اشعار، بلیغ سے بلیغ خطبے بہت ہی خوبی سے جمع کئے گئے ہیں۔ ایک ایک مسئلے کی متعدد مثالیں پیش کر کے فصاحت و بلاغت پر خوب خوب موشگافیاں کی ہیں اور بتایا ہے کہ ایک خطیب یا مضمون نگار اپنے لیکچر یا خامہ فرسائی میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

مثلاً وہ اصول خطابت پر بحث کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک مقرر کا فرض ہے کہ تقریر کرتے وقت اس کا دل قوی اور مضبوط ہو، اعضا ساکن اور مطمئن ہوں، زبان صاف اور شستہ ہو، آواز اچھی اور معتدل ہو، موقعے اور محل کے مناسب مضامین کا انتخاب کر سکتا ہو، سامعین کے مذاق اور میلان طبع سے واقف ہو، امرا اور عوام کے مراتب کا لحاظ رکھتا ہو تاکہ سامعین کے جذبات برانگیختہ ہو سکیں۔

پانچویں صدی ہجری میں علامہ ابن رشیق قیروانی (المتوفی سنہ ۴۵۶ھ) نے ایک نہایت ہی بیش بہا کتاب لکھی جس کا نام کتاب العمدۃ فی الشعر و نقدہ ہے۔ اس کتاب کا نام ہی اس کا عنوان ہے۔ اس موضوع پر پہلے قدامہ ابن جعفر، ابو ہلال عسکری وغیرہ نے گو قابل قدر کتابیں لکھیں مگر جس خوبی اور وضاحت سے کتاب العمدہ میں اشعار پر تنقید کی گئی ہے کسی اور کتاب میں اس کی چوتھائی بھی نہیں۔ تنقید اشعار کے

سلسلے میں مختلف طریقوں سے اصول بلاغت منضبط کئے گئے ہیں۔ شعراء کی اصطلاحیں، ان کے خاص خاص عنوانات، ان کے باہمی مباحثے، نظم و نثر کا مقابلہ، ان پر تنقید و نکتہ چینی کے طریقے، لطائف و ظرائف، شعراء کے طبقات، ان کے باہمی امتیازات اور وہ تمام اصول جو صحیح طور پر بلاغت کے لئے دستور العمل بننے کے قابل ہیں تفصیل سے بتائے گئے ہیں۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور آخر میں تنقید اشعار پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

وبالجملہ فہذہ الصناعۃ وتعلیمہا مستوفیً فی کتاب العمدۃ لابن رشیق۔ | خلاصہ یہ ہے کہ یہ فن اور اس کا تعلیم پورے طور پر ابن رشیق کی کتاب العمدہ میں پایا جاتا ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون مصری صفحہ ۵۰۴)

اس دور کی آخری کڑی شیخ عبدالقاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) تھا۔ یہ شخص علم کلام، علم نحو، علم فقہ کا امام اور فن بلاغت کا مؤسس مانا جاتا ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں علم بلاغت کو جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔ اس کے منتشر اور پراگندہ شیرازے کو یکجا کرکے ہر ایک کے لئے جدا جدا فصول اور ابواب قائم کئے، فن معانی کو فن بیان سے علیحدہ کرکے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ کتابیں تصنیف کیں جن میں بجائے عقلی دلائل کے ادبی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت ہی ادیبانہ انداز میں مثالیں پیش کرکے بتایا ہے کہ دیکھو اس کلام میں جو کچھ زور ہے وہ محض اس لئے کہ فلاں لفظ فلاں جگہ پر ہے یا فلاں لفظ فلاں لفظ سے مقدم یا مؤخر ہے۔ اگر اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو کلام میں وہ خوبی باقی نہیں رہتی جو موجودہ حالت میں ہے۔

الفاظ کا باہمی تناسب اور ان کی نشست ہر کلمے کی دوسرے کے ساتھ موزونیت اور کھپت فصاحت کی جان ہے۔ کبھی دو کلمے ہم معنی ہوتے ہیں مگر کسی عبارت یا شعر میں ایک ہی کلمہ کھپ سکتا ہے۔ اگر اس کے بجائے دوسرا کلمہ رکھ دیا جائے تو کلام میں بھدا پن پیدا ہو جاتا ہے اور جب کلام میں ایسے الفاظ جمع ہو جاتے ہیں باہم مناسبت رکھتے ہیں تو زبان میں خود بخود ان کے ادا کرنے میں ایک سلاست اور روانی پیدا ہو جاتی ہے جس کو فن بدیع کی اصطلاح میں انسجام کہتے ہیں۔

صناعۃ لفظی و معنوی اور ان کے تمام اقسام اس قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں کہ کسی شخص نے

اب تک ان مسائل پر اتنی وضاحت و خوبی سے خامہ فرسائی نہیں کی۔ پھر یہ بھی بتایا ہے کہ ایک کلام کو دوسرے کلام پر فضیلت محض انتخاب الفاظ کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں معنی کو بڑا دخل ہے۔ الفاظ سے جس قدر حصہ متعلق ہے اس کو فصاحت کہتے ہیں اور جن چیزوں کا تعلق معنی سے ہے ان کو بلاغت کہتے ہیں۔

چھٹی صدی ہجری تک متقدمین کا یہ مذاق باقی رہا۔ وہ اس فن کے اصلی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیشہ اصول بلاغت ادیبانہ انداز میں بیان کرتے رہے تاکہ متعلم کو خطابت و صحافت میں کافی دستگاہ حاصل ہو جاوے اور وہ ہر موضوع پر تحریر و تقریر کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر سکے۔

لیکن ساتویں ہجری میں جب ابو یعقوب یوسف سکاکی (المتوفی ۶۲۶ھ) کا دور آیا تو افسوس ہے کہ دریا کا رخ دوسری طرف پھر گیا۔ اس نے علم بلاغت کو منطقی رنگ میں رنگ دیا اور علوم ادبیہ کو پس پشت ڈال کر معقولات کا ایک بڑا طومار اضافہ کر دیا۔

متاخرین نے سکاکی کی کتاب "مفتاح العلوم" کو بہت سراہا۔ اس کے متعدد خلاصے اور حاشیے لکھے گئے اور فلسفیانہ رنگ میں اس کثرت سے شروح و حواشی پڑھائے جانے لگے کہ اصل فن کا کہیں پتہ نہیں رہا۔ جن میں علامہ تفتازانی (المتوفی ۷۹۱ھ) کی تصنیفات مطول اور مختصر معانی سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور مدت سے درس نظامی میں داخل ہیں جو اس وقت ہندوستان کے زیادہ تر مشرقی مدارس میں رائج ہے اور جس کی تحصیل کئے بغیر کوئی شخص عالم کہے جانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

زمانے کی رفتار اور جدید مذاق کے ساتھ ساتھ دنیا کی تمام چیزیں بدلتی جا رہی ہیں لیکن ہمارا عربی نصاب تعلیم جو آج سے صدیوں پہلے فلسفہ و منطق کے عروج کے دور میں تیار کیا گیا تھا آج بھی بلا کسی ترمیم و تنسیخ کے رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عربی زبان باوجود ہماری مذہبی زبان اور ہمارے ذوق سے قریب تر ہونے کے ہم کو مدتوں میں ویسی نہیں آتی جیسی انگریزی زبان باوجود ایک اجنبی زبان ہونے کے تھوڑے عرصے میں آ جاتی ہے اس لئے کہ اس میں زمانے کے مذاق کے مطابق ایک روح ہوتی ہے جس کا ہمارے یہاں کہیں نشان تک نہیں ملتا۔

یہ سب کچھ دراصل اس بے نتیجہ طریقہ تعلیم کا اثر ہے جو بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر مدارس میں مروج ہے۔ عالم اسلامی علماء کے اس جمود اور کورانہ تقلید پر جس قدر بھی ماتم کرے کم ہے۔

جمالیہ عربک کالج (مدراس)

کالج کی مختصر تاریخ | ۵۰ برس کا زمانہ گزرتا ہے کہ جناب حاجی جمال محی الدین صاحب نے اس کالج کی بنا ڈالی تھی۔ شروع شروع میں یہ کالج عربی کا مدرسہ تھا جس میں عربی زبان میں بہت سے علم پڑھائے جاتے تھے جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے عربی مدرسوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔

آج سے آٹھ سال پہلے حاجی صاحب موصوف کے سعادت مند فرزند سیٹھ جمال محمد صاحب ایم' ایل' اے نے اپنے مدرسے کے نصاب تعلیم میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کردی۔ وہ یہ کہ پرانے علوم کے ساتھ چند نئے علوم کی تعلیم بھی لازمی کردی اور اسی وقت سے اس مدرسے کا نام "جمالیہ عربک کالج" ہوگیا۔

طریقۂ تعلیم | جمالیہ عربک کالج میں تعلیم کا طریقہ نہ بالکل جدید ہے اور نہ قدیم۔ انگریزی تعلیم کو لازمی قرار دینے کے باوجود مشرقیت کو برقرار رکھنے کا ہر وقت خیال رکھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں تعلیم کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ استاد پڑھتا تھا اور طلبہ سنتے جاتے تھے اور ضروری اشارات اور بعض وقت استاد کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اپنی کاپی میں لکھتے جاتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا تھا اور استاد معانی اور ضروری بحثوں کی تشریح کرتا تھا۔ جمالیہ عربک کالج میں یہ دونوں طریقے عمل میں لائے جاتے ہیں۔ اسکول میں اکثر و بیشتر طلبہ ہی کو پڑھنا پڑتا ہے اور کالج میں یہ فرض استاد انجام دیتا ہے لیکن ایک تہائی کے قریب طالب علموں کو بھی قرأت میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ تعلیم حدیث کے سلسلے میں ایسا کرنا استاد و شاگرد دونوں کے لئے باعث سعادت سمجھا جاتا ہے۔

تقسیم نصاب | سردست جمالیہ کالج میں مدت تعلیم آٹھ سال رکھی گئی ہے۔ چار سال اسکول کے لئے اور چار کالج کے لئے۔ اسکول کے چار سالوں کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے کہ پچھلے دو سالوں میں عربی زبان اور دینیات پر زور دیا جاتا ہے۔ اسکول کے تیسرے سال سے انگریزی بھی شروع کرادی جاتی ہے۔ اسکول میں ذریعۂ تعلیم تامل زبان ہے مگر اسکول کے پہلے ہی سال سے اس بات کی کوشش کی جاتی

ہے کہ طلبہ کو اردو بھی آجائے۔ اس کے لئے شروع ہی سے اردو کا ایک گھنٹہ رکھا جاتا ہے۔

کالج میں ذریعۂ تعلیم عربی اور اردو زبان کو رکھا گیا ہے۔ کالج کے پہلے ہی سال سے اردو کی طرف خاص توجہ کی جاتی ہے جو کالج کے آخری سال تک باقی رہتی ہے۔ اسی کے ساتھ طلبہ کو انٹرمیں تک انگریزی، حساب، اقلیدس، الجبرا، تاریخ ہند و انگلستان (تاریخ اسلام کے علاوہ) اور جغرافیہ وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور جس وقت طالب علم یہاں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے تو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا علوم سے بھی بقدر ضرورت واقف ہوتا ہے۔

سال آئندہ سے ایک تجویز اور بھی زیر غور ہے کہ فارغ التحصیل طلبہ کو دو سال کی مدت اور دی جایا کرے۔ اس زمانے میں یہ طلبہ دینیات کے کسی ایک یا دو فنوں میں مہارت پیدا کریں۔ اسی کے ساتھ ان کو مذاہب عالم کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔

مقصد تعلیم | جمالیہ عربک کالج کی خصوصیت اس کا مقصد تعلیم ہے۔ انگریزی اور عربی کے جدا جدا اسکولوں کے قیام نے ان دونوں زبانوں کے جاننے والوں میں ایک خلیج حائل کر دی ہے۔ تحریک آزادی کے بہت زیادہ ترقی کر جانے کے باوجود عربی اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں میں وہ اتحاد اور اتفاق نہ پیدا ہو سکا جس کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے مذاق اور رجحان سے ناآشنا ہیں اور اسی وجہ سے وہ تفریق جو دونوں میں پیدا ہو گئی ہے کسی طرح نہیں مٹتی۔ سیٹھ جمال محمد صاحب کو اس چیز کا احساس تھا۔ اسی لئے موصوف نے ہندوستان کے بعض مخصوص علما کے علاوہ اپنے ممالک اسلامیہ کے سفر کے زمانے میں مصر میں علامہ طنطاوی (مصنف تفسیر جواہر) سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ علامہ موصوف نے علوم عربیہ کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی تعلیم کی پرزور تائید کی۔ لہذا جمالیہ کالج میں عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی وغیرہ کو نصاب تعلیم میں داخل کر لیا گیا تاکہ وہ تفریق بھی دور ہو جائے جو بدقسمتی سے دو تعلیم یافتہ طبقوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ اسی کے ساتھ علوم جدیدہ سے ضروری واقفیت پیدا ہو جائے تاکہ وقت کی ضروریات کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ غرض کہ جمالیہ دین و دنیا دونوں کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور جنوبی ہند میں جمالیہ کالج اسی نصب العین کو سامنے رکھتا ہے۔ جو شمالی ہند میں جامعہ ملیہ دہلی کے پیش نظر ہے۔

دارالاقامہ | جامعہ کالج کے دو بورڈنگ ہیں۔ ایک بڑا بورڈنگ جس میں تقریباً ۵۵ طلبہ رہتے ہیں۔ بڑا بورڈنگ ایک شاندار عمارت ہے۔ اس کے اردگرد کافی کشادہ میدان ہیں۔ اس کے کمرے اس قدر چوڑے اور آرام دہ ہیں کہ ایک کمرے میں پانچ آدمی بآرام رہ سکتے ہیں۔ بورڈنگ کسی ایک استاد کی نگرانی میں دیدیا جاتا ہے اور استاد (نگران دارالاقامہ) کی آسانی کے لئے انتظام کی یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر کمرے کے رہنے والے طلبہ میں سے کسی ایک کو مانیٹر مقرر کردیا جاتا ہے جو ان کے چال چلن، تعلیم، نماز اور کھیل وغیرہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مؤدب (نگران دارالاقامہ) کی طرف سے سارے بورڈنگ کا ایک طالب علم کو ذمہ دار قرار دے دیا جاتا ہے جو تمام کمروں کے مانیٹروں سے ان کے ساتھیوں کے متعلق بازپرس کرتا ہے۔ عام نگرانی اس کا فرض منصبی ہوتا ہے۔ چھوٹے دارالاقامے میں پندرہ طالب علم رہتے ہیں اور اس میں بھی انتظام کی یہی شکل ہے۔

طلبہ کی انجمنیں | طلبہ کی دو انجمنیں ہیں۔ ایک کالج کی طرف سے جس کا نام لٹریری سوسائٹی ہے۔ ہر مہینے اس کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جس کی اطلاع ناظر (پرنسپل) کالج اور انجمن کے سکریٹری (جو ایک طالب علم ہوتا ہے) کی طرف سے دی جاتی ہے۔ باہر کے مقررین بھی بلائے جاتے ہیں چنانچہ ابھی حال میں مسٹر پال کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ بزرگ مدراس کے مشہور عیسائی ہیں۔ آپ کی شخصیت اپنے مخصوص خیالات کے باعث تمام دنیا کے عیسائیوں میں بین الاقوامی شہرت حاصل کرچکی ہے۔ موصوف نے انگلستان سے واپسی پر سب سے پہلی تقریر جامعہ کالج میں کی۔ ہندوستان کے بعض مشہور علماء و زعماء بھی اپنی تشریف آوری سے اس سوسائٹی کو مشرف کرچکے ہیں۔

عام طور پر طلبہ خود ہی کوئی عنوان مقرر کرتے ہیں جس کے ماتحت موافق و مخالف خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے جلسوں میں اساتذہ بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس انجمن کے جلسوں کی صدارت عموماً کوئی نہ کوئی استاد کرتے ہیں۔

دوسری انجمن طلبہ کی نجی انجمن ہے جس کا تعلق بورڈنگ سے ہے۔ اس انجمن کے جلسوں کی نگرانی مؤدب کرتا ہے اور وقتاً فوقتاً طلبہ کو ضروری ہدایات دیتا ہے لیکن طلبہ اپنی کارروائیوں میں بالکل

آزاد ہوتے ہیں۔ اس کے جلسوں میں مختلف زبانوں میں تقریریں ہوتی ہیں جس کی اطلاع پہلے سے دے دی جاتی ہے۔ عام طور پر تامل اور انگریزی اور کبھی کبھی اردو اور عربی میں تقریریں ہوتی ہیں۔

ورزش | ورزش اور کھیلوں کا بھی خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چھوٹے بڑے سب لڑکے کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ عام طور پر طلبہ والی بال اور بیڈمنٹن کو زیادہ دلچسپی سے کھیلتے ہیں۔ کھیلنے کے لئے بڑے بڑے میدان موجود ہیں۔

عملی کام | اس کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ طلبہ کو کچھ عملی کام بھی کرنا چاہئے۔ اس کے لئے کچھ زمین ان کو دے دی گئی ہے جس میں وہ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔ آج کل طلبہ اپنے بورڈنگ کے سامنے کے حصے میں ایک چھوٹا سا باغ لگا رہے ہیں۔ فرصت کے اوقات میں تھوڑا سا وقت عملی کاموں میں بھی صرف کرایا جاتا ہے۔

کتب خانہ | کالج سے متعلق ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی ہے جس میں عربی کے مختلف فنون کی کتابوں کی اکثریت ہے۔ انگریزی، اردو اور تامل میں بھی بقدر ضرورت کتابیں موجود ہیں۔ کتب خانے میں عام طور پر وہی کتابیں ہیں جو درس و تدریس سے تعلق رکھتی ہیں۔ کالج کی طرف سے ایک مخصوص رقم ماہوار کتابوں کے اضافے پر صرف ہوتی ہے۔

ہندو اساتذہ | جمالیہ کالج کو مخصوص روایات کے ماتحت لانے کے لئے ہندو اساتذہ بھی رکھے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ وہ تمام رعایتیں روا رکھی جاتی ہیں جن سے مسلمان اساتذہ مستفید ہوتے ہیں۔ غالباً یہ جمالیہ کالج ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے مخصوص مقاصد کے مطابق بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے ہاں ہندو اساتذہ کو بھی جگہ دیتا ہے۔

اساتذۂ کالج | جمالیہ کالج کے اسٹاف میں مندرجہ ذیل اساتذہ ہیں:-

(۱) مولوی عبدالوہاب صاحب بخاری، افضل العلما، ایم۔ اے، ایل۔ ٹی (پرنسپل)

(۲) مولانا حسن محمد صاحب جمالی (۳) مولانا محمد یوسف صاحب جمالی (۴) مولانا محمد شریف صاحب جمالی

(۵) مولانا محمد حسین صاحب باقوی، افضل العلما (۶) مولوی رحیم احمد صاحب، افضل العلما، بی۔ اے۔

(۷) مولانا کمال الدین صاحب جمالی (۸) مسٹر ورداجاریا بی۔ اے (ہیڈ ماسٹر) (۹) مسٹر اللہ پچے۔ بی اے، بی۔ ایل (۱۰) مسٹر پی۔ وی محمد صاحب بی۔ اے (۱۱) مسٹر ایس پرماسیوم (۱۲) مسٹر عبدالصمد (۱۳) خلیل احمد

جمالیہ کی حیثیت | نصاب کی مخصوص تبدیلیوں اور ان میں خاطر خواہ کامیابی کی توقع پر جمالیہ عربک کالج کو بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جنوبی ہند کے مدارس بھی جمالیہ کو ایک کامیاب اور مفید درسگاہ سمجھتے ہیں۔

جمالیہ کا مستقبل | کالج کی صورت اختیار کر لینے کے بعد جمالیہ کے منتظمین اپنے کالج کو ترقی کے انتہائی درجوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا نصب العین دین و دنیا دونوں ہی ہیں۔ اس لئے ان کی جد و جہد دونوں چیزوں کے وابستہ کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

جمالیہ کے منتظمین کی ان بزرگوں سے جنھیں مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی ہے یہ درخواست ہے کہ اگر وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفید فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے تو ان مشوروں کو خلوص قلب کے ساتھ قبول کیا جائے گا اور ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔

غول بیابانی

عرب کے نزدیک جن اور شیاطین میں فرق ہے بعض نے جن کو ایک جنس اور شیاطین کو دوسری جنس قرار دیا ہے۔ بعض نے یہ تفریق کی ہے کہ جن تو نیک اور طاہر روحیں ہیں اور موذی اور شریر روحیں شیاطین ہیں۔ شیاطین جو زیادہ خبیث ہیں انھیں مَارِدْ کہتے ہیں۔ ان ماردین میں جو زیادہ زورآور و تنومند ہیں عفریت کہلاتے ہیں۔

جن کی تعریف شیخ الرئیس بوعلی سینا یوں کرتے ہیں کہ جن وہ حیوان ہوائی ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ جنوں کو موت آتی ہے شیاطین کو نہیں آتی۔

حنّ (بجائے حطی) جنوں کا ایک قبیلہ ہے یا جنوں میں سے پلے، لفنگے، رذالے، کم ذات حنّ کہلاتے ہیں۔

شیصبان بھی جنوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اپنے سرگروہ کے نام سے مشہور ہے۔

عرب جاہلیت کی خرافات میں سے ہے کہ آدھے آدمی اور آدھے جن ایسی خلقت کو خُس کہتے ہیں۔

حنّ کے متعلق بھی ایک قول یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں میں ایک درمیانی خلقت ہے۔

جس کا آدھا جسم سِعلاۃ (دیونی، ساحرہ جن) کا اور آدھا آدمی کا ہو اسے غُلوق کہتے ہیں۔ اور جس کا آدھا جسم آدمی کا اور آدھا فرشتے کا ہو اسے عِلبان کہتے ہیں۔

جُرہُم کی پیدائش کو آدمی اور فرشتے سے خیال کرتے ہیں۔ جرہم اس قبیلے کے سردار تھے جو یمن سے آکر حوالی مکہ معظمہ میں بس گئے تھے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اسی قبیلے میں شادی کی تھی۔

پری اور آدمی سے جو نسل چلی ہے وہ نسناس سے نامزد ہے۔ سدّ آذربیجان کے اوپر نسناس اور ان کی نسل آباد ہے۔

پریوں اور یاجوج ماجوج کے متعلق خیال ہے کہ یہ بنات وحیوان کے ملنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ قریش رُوسا جن کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے قرآن شریف نے

ان کی اس بات کو بے عقلی ٹھہرایا۔

ذو القرنین کے متعلق کہا کرتے تھے کہ اس کی ماں قبرئے اور باپ عبرئے تھا۔ قبرئے کو فرشتہ اور عبری کو آدمی سمجھتے تھے۔ نکاح و جماع جن و انس میں واقع ہونا درست مانتے تھے۔

گھومنے پھرنے والے جنوں کو عرب نَظَرہ بولتے ہیں۔

کوئی جنّی (جن کا مفرد) یا جنّیہ جو کسی انسان کا پیچھا کرے اور ساتھ ساتھ پھرے اُسے تابع مؤنث ہو تو تابعہ کہتے ہیں۔

جو گھروں میں آدمیوں کے ساتھ رہتا ہے عامر کہلاتا ہے جمع عمار ہے۔

وہ جن جو بچوں کو چھیڑا کرتا ہے اسے ارواح کہتے ہیں (فقہ اللغۃ للثعالبی)۔

احقب ان جنوں میں سے ایک ہے جنھوں نے قرآن شریف سنا تھا۔

جنوں میں سے طاہر و نظیف و نیکوکار کو مَلَک سے تعبیر کرتے ہیں۔

شیاطین الجن میں سے جو مارد ہیں ان کی بھی نوعیں ہیں۔

انواع ذکور کے نام ہیں

عَیہَران ۔ دیو ۔ عیا ہیر جمع ۔ قُطرُوب یا قُطرُب۔

انواع اناث کے نام :۔

غول ۔ سعلاۃ ۔ قطربہ و شہام ہیں۔

بیان مذکور سے معلوم ہوا کہ غول (جنّیتی) جسے عرب مؤنث جانتے ہیں جن مارد میں سے ہے۔ یہ ساحرہ مشہور ہے۔ اردو زبان میں لفظ غول مذکر مستعمل ہے۔

غول طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح سعلاۃ کو بھی یہ قدرت حاصل ہے یہ بھی ساحرہ مانی جاتی ہے۔ جنگل بیابان میں مسافر کو راستہ بھلاکر اور سنسان جگہ میں لے جا کر اسے مار ڈالنے کی بہت سی حکایتیں غول کی طرف منسوب ہیں۔

عرب اس روشنی کو بھی غول ہی سمجھتے تھے جو دور سے جنگل میں نظر آیا کرتی ہے۔ قبرستانوں اور مرگھٹوں

میں دیکھی جاتی ہے ۔ اس کے پاس تک پہنچو تو ہٹ کر ادھر ادھر ہو جاتی ہے ۔

غول کے خیال نے آہستہ آہستہ مدارج تخیل طے کئے ۔ تصور نے اس کی شکل انسانی اور پاؤں گدھے جیسے بنائے حتیٰ کہ اس فرضی مخلوق کو بعض عربوں نے دیکھنے اور پہچاننے کا دعویٰ کیا ۔

تَابَّطَ شَرًّا قدیم شعرائے عرب میں سے ہے ۔ اس کے اشعار میں غول کا بہت ذکر آتا ہے یہانتک کہ بیاباں نوردی میں اکثر مواقع پر غول آپ کے رفیق طریق رہے ہیں (اغانی جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۹)

ایک مرتبہ ان سے غول نے شرارت کی ٹھانی ۔ یہ تاڑ گئے اور تلوار کے ایک ہی بھرپور ہاتھ سے اس کے ٹکڑے کر دئے ۔ تزدینی نے غول کو جن متشیطنہ کی قسم سے قرار دیا ہے ۔

حیوٰۃ الحیوان دمیری اور کتاب الحیوان جاحظ (مطبوعہ قاہرہ) میں غول کو عرب کی روایات مذکور کی بنا پر حیوانوں میں شمار کیا ہے ۔ اس کی جمع غیلان اور اغوال آتی ہے ۔

غول کی صفات مذکورہ کے لحاظ سے عربی زبان میں کئی لفظ پیدا ہو گئے ہیں مثلاً

تَغَوُّل طرح طرح کی صورتیں اختیار کرنا ۔ پھر معنی میں اور عموم ہوا تو رنگ بدلنے، حالت بدل جانے اور کیفیت اور ہو جانے کے لئے بھی آنے لگا مگر ان معنوں میں بھی ذم لازم رہا ۔ بری حالت سے اچھی حالت بدل جانے پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا ۔ چنانچہ کعب بن زہیر نے قصیدہ بردہ میں سُعاد کو اس کے تغیر و تلون کے لئے نہ تو غول سے تشبیہہ دی نہ مصدر تغول کا کوئی صیغہ برتا حالانکہ غول اس قصیدے کا قافیہ تھا ۔

اغتیال کسی کو دھوکے یا پراسرار طریق سے قتل کر ڈالنے کو کہتے ہیں ۔ یہ بھی ہر آفت و ہلاکت پر مجازاً بولا جانے لگا مگر وہی جو کسی کے شامت اعمال کے نتیجے میں آئے ۔

غول بھی ہر بھوت پریت کے لئے نہیں بولتے تھے یہ بیابان ہی کے لئے خاص تھا ۔

اسلام آیا تو غول کے معنی میں بڑا عموم آگیا ۔ اول تو غول کو جو ایک خاص ہیئت وصورت وہم نے دے رکھی تھی وہ مٹ گئی ۔ حضرت نبی کریمؐ نے فرمایا کہ لَاغُوْلَ وَلَاصَفَر یعنی غول کی (جس کی ہیئت جسمانی تو انسانی اور پاؤں گدھے جیسے مانے جاتے تھے) کوئی اصلیت نہیں اور صَفَر کے مہینے کی نحوست بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔ (لسان العرب صفحہ ۲۱)

اس فرمان سے عربوں کے توہم کا جو غول کے متعلق تھا ازالہ ہو گیا۔ البتہ وہ اب غول کو ایک مجازی ہستی ماننے لگے مگر معتزلہ اس کے بھی قائل نہ رہے (کشاف کلکتہ صفحہ ۱۲۰۵)

اہل سنت کے محققین کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جس طرح صفر کی نفی فرمائی ہے اسی طرح غول کی فرمائی ہے۔ صفر کا مہینہ تو ہے مگر اس کی نحوست سراسر وہم تھی۔ اسی کا رد منظور ہے علیٰ ہذا غول بھی ہے مگر اس کی ہیئت کذائی اور مقام کا تعین بیابان سے خصوصیت یہ سب واہمہ تھا۔ اس کا ازالہ کر دیا مثلاً جنگلوں اور راستوں میں ٹھگ آدمیوں کو حالت سفر میں دھوکے سے مار ڈالتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے لے لیتے ہیں۔ یہ غول ہیں۔ اسلام کے اثر سے اس لفظ کے معنی میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا چنانچہ قطر المحیط بطرس البستانی میں غول کے معنی لکھے ہیں "وکُلُّ ما اغتالَ الانسانَ فاہلکہٗ فھُوَ غولٌ" یعنی ہر وہ شے جو انسان کو فریب دے اور اس کی ہلاکت کا موجب ہو جائے وہ غول ہے۔

ہر نقصان دہ چیز پر غول کا اطلاق اسلام نے عام کر دیا تاکہ عرب کا توہم باقی نہ رہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے الغضب غول الحلم۔ غضب حلم و بردباری کے لئے غول ہے۔

حادثات ارضی و سماوی، وبا، مرض سب کو غول قرار دینا زبان نے جائز کر دیا۔ ایک حدیث میں آیا ہے اذا تغولت الغیلان فبادروا بالاذان۔ جب طرح طرح کے حادثے ہونے لگیں تو اذان اول وقت دیا کرو۔

بادروا کے معنی دو طرح سمجھے گئے ہیں ایک توجیہ میں نے کئے جس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ اول وقت نماز پنجگانہ کی اذان دینے سے اور فرض جماعت سے ادا کر کے جو وقت ملے اس میں نوافل ادا کئے جائیں۔ آیۂ کریمہ "تعاونُوا بالصَّبرِ والصَّلوٰۃ" کا مفہوم ان معنیٰ کا مؤید ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی حادثہ رونما ہو تو جلد اذان دینے لگو کہ اس کی آواز سے بلائیں بھاگتی ہیں۔)

غرضکہ اسلام کے بعد عرب سے خیالی و وہمی غول بالکل سدھار گیا اور زیر آشیانہ عنقا اس نے نشیمن اختیار کر لیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے:۔

الغولُ والخِلُّ والعنقاءُ ثالثۃٌ　　اسماءُ اشیاءَ لم توجد و لم تکن

غول اور سچی دوستی اور سیمرغ عنقا ایسی چیزوں کے نام ہیں کہ نہ وہ ہوتی ہیں نہ پائی جاتی ہیں۔

قرآن شریف میں لفظ غول بفتح غین شراب جنت کی تعریف میں آیا ہے۔ " لافیہا غولٌ ولا ہم عنہا ینزفون" نہ اس میں ہلاکت ہوگی اور نہ وہ اس سے متوالے ہوں گے۔ یہاں غول کے معنی ہیں ایسے طریقے پر ہلاک کرنا کہ محسوس نہ ہو۔ (مفردات راغب)

اسی طرح شیطان کے معنی میں اسلام کے بعد عربی ادب میں بہت وسعت آگئی۔ چور کو بھی شیطان کہنے لگے۔ حضرت ابوایوبؓ فرماتے تھے کہ شیطان میرے مچان سے کھجور چرالے جاتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں شیطان کا کھجور چرانا ثابت ہے۔

ایک شاعر نے تمام اہل شام کو شیاطین کہہ دیا ہے۔

ملائکۃ الارض اہل الحجاز   و اہل الشآم شیاطینہا

اہل حجاز تو زمین میں فرشتے ہیں اور اہل شام شیاطین ہیں۔ (فرائد اللغۃ)

اردو میں غول کا مرادف وہم معنی چھلاوا ہے۔ یہ اگیا بیتال کے معنی پر بھی اور مختلف صورتوں میں روپ دکھلانے کے معنی پر بھی حاوی ہے۔ اردو میں بھی جن اور بدروحوں کی کئی اقسام ہیں:۔ دیو، جن، بھوت، پریت، چنڈال، آسیب، غول، پرچھانواں مذکر ہیں۔ چڑیل، ڈائن، بھائی، دیونی، بھوتنی مؤنث ہیں۔ پری بھی مؤنث ہے اور ایک حسین اور غیر موذی مخلوق ہے۔ دیو یہاں فارس سے آیا ہے۔ سرکش اور متمرد انسان کو بھی دیو کہہ دیتے ہیں۔ بھوت وہ بدروح ہے جو جسم چھوڑنے کے بعد دنیا میں ماری ماری پھرتی ہے۔ مجازاً غصے کو اور برے بدصورت آدمی کو بھی کہتے ہیں۔

پریت ہر ناپاک روح کو بولتے ہیں۔ وہ روشنی جو پیچھے پیچھے آتی ہے اس کو اگیا بیتال کہتے ہیں۔ کافِ فارسی مشدد اور مخفف دونوں طرح ہے۔

چنڈال بھوت کی کمینی اور بدذات قسم ہے۔ ایک کمینے فرقے کا نام بھی ہے۔ آسیب بھی ہرمتی اور صدمے کے معنی پر آتا ہے۔

ڈائن اپنے بچوں کو آپ کھا جاتی ہے۔ زن جگر خوار، بدصورت عورت کو مجازاً کہتے ہیں۔

بھائی وہ روح جو خوشی اور غم کی باتیں کہہ کے بچوں کو سوتے جاگتے ہنساتی رلاتی ہے ؎

آئی محفل میں بھائی جو ہنسانے مجھ کو   طرفہ غمگین ہوں کہ روتی گئی وہ آہ شعور

ایران، مصر، طرابلس اور ترکی میں بھی عام طبقے غول کو مانتے ہیں۔ انگریزی میں بھی لفظ غول (Ghouls) پہنچ کر معرب ہو گیا ہے اور ogress کا مرادف بن گیا ہے۔

الف لیلہ میں سندباد جہازی قصہ سیف الملوک قصہ وزیر حاسد میں جن و غول کا بیان آتا ہے۔

لین صاحب نے اپنی کتاب مصریین حاضر میں غول کا قبریں تلاش کر کے مردوں کی لاش کو کھا جانا وہاں کے عوام کا مسلمہ بتایا ہے۔

مقریزی نے خطط میں ایک روایت کی ہے کہ دیو اور غول داء الکلب کی بیماری عارض کر دیتے ہیں۔

طیارہ

آئیے آج ہم اس پر غور کریں کہ ہوائی جہاز کا وجود دنیا میں کیسے ہوا جس نے آج دنیا کو اپنی کرشمہ سازیوں سے محو حیرت کر دیا ہے۔ صدیوں سے لوگوں کے دماغ میں یہ خیال چکر لگا رہا تھا کہ وہ ہوا میں اڑنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب معلوم کریں۔ چنانچہ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے کوششیں بھی کیں لیکن بے سود۔ سنہ ۱۷۸۲ء اور سنہ ۱۷۸۳ء میں دو بھائیوں مونٹ گولفیر (Mont Golfier) نے غبارے بنائے اور ان میں گرم ہوا بھر کر اڑائے جس میں انھیں کچھ کامیابی کی جھلک نظر آئی۔ تب تو ان کی ہمت بندھی اور ان میں سے ایک کو اس بات کی ہمت ہوئی کہ وہ خود کسی ایک غبارے میں بیٹھ کر اڑے۔ چنانچہ وہ کامیاب ہوا۔ پھر کیا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا غرضکہ اسی طرح لگاتار کئی سفر کئے گئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہائڈروجن کا ظہور ہوا جو اس مقصد کے لیے بہت زیادہ موزوں ثابت ہوئی۔ بہت بڑے بڑے غبارے تیار کئے گئے اور لوگوں نے اڑنا شروع کیا۔ اس طرح لوگوں نے ہوا میں اڑنے کا طریقہ تو معلوم کر لیا لیکن تقریباً سو سال تک یہ نہ معلوم کر سکے کہ غبارے کو قابو میں کیسے کیا جائے کیونکہ غبارے کے اڑنے کا دارومدار ہوا پر تھا اور جس طرف کو ہوا چلتی تھی اسی طرف کو وہ بھی اڑا چلا جاتا تھا۔ اس طرح بہت سی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔

غبارہ کس طرح ترقی پذیر ہوا؟

باوجود ان تمام نقصانات کے لوگوں نے شوق کی وجہ سے اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ کوئی عمدہ سے عمدہ طریقہ نکالا جائے۔ چنانچہ انھیں اس میں کامیابی بھی ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ اس درجے پر پہنچے کہ سنہ ۱۹۰۱ء میں دو جرمن سائنس دانوں نے اپنے غبارے کو ۷۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے اڑایا۔ اس کے بعد سب سے لمبا سفر جو ڈیڑھ ہزار میل کا تھا ایک فرانسیسی نے سنہ ۱۹۱۳ء میں پیرس سے اڑ کر روس تک پہنچ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ لوگوں نے ہوا کی لہروں اور گرمی و سردی کے درجوں کے متعلق اس قسم کے سفر سے بہت کافی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ یہ غبارے صرف اسی لیے نہیں

استعمال کئے گئے بلکہ ان سے جنگوں میں بہت کافی مدد لی گئی۔

سب سے بڑی کامیابی اس طرح حاصل کی گئی کہ غبارے کے ساتھ ایک ٹوکری بنائی گئی اور اس میں ایک انجن لگا دیا گیا جس میں پروپلر (Propeller) اور پتوار (Rudder) دونوں لگے ہوئے تھے۔ اس طرح سے انھیں اتنی کامیابی تو حاصل ہوگئی تھی کہ وہ معمولی ہواؤں میں جدھر چاہتے جاتے لیکن اگر کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تو پھر اس پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی جھونکے میں یا تو تباہ ہو جاتے یا اسی کی سمت میں اس وقت تک اڑے چلے جاتے جب تک کہ اس کا اثر باقی رہتا۔

دوسرا کامیاب قدم ایک برازیلی سینٹوس ڈومونٹ (Santos Domount) اور ایک جرمن کاؤنٹ زپلن (Count Zeppelin) نے اٹھایا۔ اس برازیلی نے ایک گوبھی کی شکل کا ایک غبارہ بنایا جس کا ایک گوشہ بڑھا ہوا تھا۔ اس نے ۱۹۰۱ء میں پیرس کے Eiffel مینار کے گرد نصف گھنٹے میں چکر لگایا۔ پھر وہ اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں سے وہ پہلے روانہ ہوا تھا۔ اس کے صلے میں اسے بیس ہزار ڈالر بطور انعام دئے گئے۔ اس بہادر موجد نے اپنی توجہ اب ہوائی جہاز کی طرف منعطف کی اور اس پہلی چیز سے بالکل بے پروا ہوگیا۔ دوسرے فرانسیسیوں نے بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنی کوششیں جاری رکھیں یہاں تک کہ ایک یورپی افسر میجر فان پرسی دل (Major Van Parseval) نے ایک غبارہ تیار کیا جس کو وہ اپنی خوشی کے مطابق ہر طرف لے جاتا تھا۔

کاؤنٹ زپلن کا تیار کردہ ایک بہت بڑا ہوائی جہاز

کاؤنٹ زپلن نے ایک جدید طرز ایجاد کیا۔ اس نے اپنے ہوائی جہازوں کا باہری حصہ بہت پتلے لوہے کا بنایا اور اندرونی حصے کو مختلف کروں میں تقسیم کر دیا جو گیس کے تھیلوں سے بھرے رہتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی خراب ہو جاتا تو دوسرے اسے اوپر ہی قائم رکھتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں ایک نیا طریقہ چڑھاؤ کا معلوم کیا گیا۔ دوسرے بہتر جہاز بنائے جانے لگے یہاں تک کہ ۱۹۱۰ء میں ایک سو میل کا سفر ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ عرصے میں طے کیا گیا۔ اس سفر کو زیادہ اہمیت اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ اس میں جہازراں کے ساتھ ساتھ دوسری سواریاں بھی تھیں۔ کاؤنٹ زپلن نے دوسرے بھی بہت سے جہاز بنائے جن سے بہت سے سفر کئے گئے ان میں

قلیوں کے علاوہ چوبیس سواریاں بھی ہوتی تھیں۔ بعض بعض وقت جہاز پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتا تھا۔ جہاز بہت بڑے اور بہت زیادہ وزنی ہوتے تھے اور ان میں سے بہت سے طلبند ہوا کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

دوران جنگ عظیم میں ان جہازوں کو جن کو زیلن نے بنایا تھا اور اب وہ زیلن کے نام سے مشہور ہو گئے تھے فوجی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا۔ وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ شمالی سمندر کو پار کر سکیں اور انگلستان کے مختلف حصوں پر بمب گرائیں یا فرانس کے اوپر سے اڑ کر پیرس پر حملہ کریں۔

ہوا سے بھاری مشین کا بننا یہ تمام مشینیں جو اب تک تیار ہوئی تھیں سب کی سب ہوا سے ہلکی ہوا کرتی تھیں لیکن ان کی کامیابی کا بہت بڑا حصہ اس بات میں مضمر تھا کہ وہ ایک ایسی مشین تیار کریں جو ہوا سے بھاری ہو۔ بہت سے لوگوں نے اس سوال کے حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل بہت سے لوگوں نے کہا کہ اونچائی سے اس طرح پھسلنا چاہئے جیسے کہ گلہریاں پھسلتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوا۔ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں دوسرے بہت سے لوگ بھی اس کام میں مشغول تھے چنانچہ ایک جرمن اوٹو لیلی تھل (Otto Lilienthal) اور ایک امریکی باشندہ اوکٹیو چینوٹ (Octave Chanute) نے ایک پھسلنے کا آلہ تیار کیا اور اس سے وہ پھسلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب وہ بہت بڑی بڑی جگہوں سے آسانی کے ساتھ اتر سکتے تھے۔ لیلی تھل اپنے مرنے سے قبل دو ہزار مرتبہ سے زیادہ اڑا ہوگا۔

مشہور و معروف انگریز موجد سر ہیرام میکسیم نے ایک مشین تیار کی جس میں ایک انجن لگا ہوا تھا۔ یہ ۱۸۹۴ء میں پہلی مرتبہ آزمائی گئی لیکن اس میں کوئی خرابی رہ جانے کی وجہ سے یہ تھوڑی ہی دور اڑ سکی اور سر ہیرام نے پھر تجربے کرنے چھوڑ دئے۔ واشنگٹن کی انسٹی ٹیوشن کے ایک پروفیسر ایس۔ پی۔ لینگلے نے جو اس وقت اس سوال کا حل سوچ رہا تھا وہاں کی کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ اسے پچاس ہزار ڈالر تجربوں کے لئے دے۔ اس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنائی تھیں جن میں انجن بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ بغیر کسی آدمی کے ہوا میں اڑتیں۔ آخر میں اس نے ایک بڑی مشین بنائی تھی جس میں ہوا باز بھی بیٹھ سکتا تھا جب اس کو آزمایا گیا تو مشین اڑتے وقت دو مرتبہ خراب ہو گئی اور وہ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ پروفیسر لینگلے نے وہ تمام رقم

جو اسے دگئی تھی خرچ کر ڈالی اور اس کی یہ ناکامی جرح تمسخر و مذاق کا سبب قرار پائی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے غم میں دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گیا۔ وہ بالکل صحیح راستے پر تھا کیونکہ اس کی وفات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اگر اس کی مشین میں چند تغیر کر دیے جاتے تو وہ ضرور اڑتی۔ پروفیسر موصوف کے متعلق یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اڑنے والی مشین کا ماہر تھا۔

اس کے بعد تقریباً تمام آدمیوں نے بازو کے سائز اور شکل کے متعلق بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی لیکن جن لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ بجلی استعمال کریں انھیں یہ معلوم ہوا کہ مشین کی مجموعی طاقت بڑھانے کے لئے یہ بہت زیادہ وزنی ثابت ہوئی۔ اس وقت تک گیسولین انجن جسے ہم موٹروں میں دیکھتے ہیں بہت ترقی پکڑ چکا تھا۔ دو امریکیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ وہ اس سے ہوائی جہاز بخوبی چلا سکیں گے۔

دو امریکیوں کا اس مسئلے کو حل کرنا

اورول اور ولبر رائٹ دو امریکیوں نے ڈےٹن اور اوہیو میں سائیکلوں کی مرمت کے لئے دو دکانیں کھول رکھی تھیں۔ انھیں موٹر سائیکل کا بھی کافی تجربہ تھا۔ انھوں نے ۱۹۰۰ء میں پھیلنے والے آلے سے تجربہ شروع کیا تاکہ وہ بازوؤں کی بہترین شکل و سائز معلوم کر سکیں۔ وہ شمالی کیرولینا کے سمندری ساحل پر گئے تاکہ ان کے کام میں کوئی حارج نہ ہو۔ آخرکار ۱۹۰۳ء میں ایک مشین بنائی گئی جو ہوا میں ایک آدمی سمیت ۵۹ سیکنڈ تک ٹھہری رہی۔ اس طرح مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کے بعد پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ رائٹ برادرس نے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں اور ۱۹۰۵ء میں ایک ۲۴ میل کا سفر طے کر کے پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے سفر طے کئے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں ولبر رائٹ نے لیمینس میں جو فرانس میں واقع ہے سب سے طویل سفر طے کیا جو ابھی تک کسی سے نہ ہو سکا تھا۔ اس نے ایک جہاز میں ۵۶ میل کا سفر طے کیا اور دوسرے میں وہ ۲ گھنٹے ۲۰ منٹ تک لگاتار ہوا میں مقیم رہا۔ ان دو امریکیوں نے اس کام کو بہ نسبت ایک تجربہ کار سائنس داں اور ایک ہوشیار کارکن کے نہایت خوش اسلوبی اور خوبصورتی سے انجام دیا۔

یکایک تمام دنیا نے اس بات کو معلوم کرلیا کہ ہوا پر بھی قبضہ کرلیا گیا اور وہ کس سے ؟ ایک بہت معمولی چیز سے جس میں ایک مشین 'پروپلر' (آگے ڈھکیلنے کا آلہ) کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ پھر کیا تھا تمام مہذب ممالک نے اڑنے والی مشین بنانی شروع کردی۔ اس میں پیش پیش وہ لوگ تھے جو مشین کی تعلیم سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے بہت ہی کم عرصے میں کافی ترقی کرلی ہوائی جہاز جس میں دو بازو ہوتے ہیں اور اسے انگریزی میں مونوپلین کہتے ہیں بنائے گئے اور بعض تین بازوؤں اور چار بازوؤں والے ہوائی جہاز بھی بنائے گئے۔

لمبے فاصلے کی پہلی اڑان | سب سے پہلے فرانسیسیوں کو سرداری کے عہدے سے سرفراز کیا گیا۔ سینٹوس ڈومونٹ نے بہت سے غبارے اور ہوائی جہاز بنائے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک ہمت ور فرانسیسی بلیریوٹ نے آب رود انگلستان کو کیلے سے ڈوور تک پار کیا جس کا فاصلہ ۲۱ میل ہے۔ اس کے بعد انگریزوں کو جوش آیا اور ایک انگریز فارمن نے اڑ کر یہ معلوم کرلیا کہ اس کی کیا حالت تھی۔ جی ایچ کرٹس ایک امریکی باشندے نے یورپ اور امریکہ میں اپنی ہمت اور دلیری کی نمائش سے لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ مسٹر کرٹس نے بھی ایک ہوائی جہاز بنایا تھا جس کو ہائیڈروپلین کہتے ہیں (اگرچہ دوسرے لوگ بھی اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کام کرتے تھے لیکن ابھی تک کوئی کامیاب نہیں ہوا تھا) یہ ایک بہت طاقتور جہاز ہوتا ہے جس کے سامنے اڑنے والی کشتیاں بھی مضبوطی سے بندھی ہوتی ہیں۔ یہ نہایت آسانی سے پانی سے اوپر اڑ سکتا ہے اور بغیر کسی خطرے کے اتر سکتا ہے۔ یہ درحقیقت ایک اڑنے والی کشتی ہے۔

پہلے چند سالوں میں بہت سے جہازرانوں نے اپنی جانیں ضائع کردیں کیونکہ انھیں نہ تو ہوشیاری سے کام کرنا آتا تھا اور نہ ہوا کی لہروں سے واقفیت تھی۔ بہت سے حادثات پیش آنے کے بعد انھوں نے یہ معلوم کیا کہ جس قدر اوپر جائیں گے اسی قدر کم خطرہ ہے کیونکہ اتنی بلندی سے گرنے میں انھیں کافی وقت لگتا تھا اور وہ اس عرصے میں مشین کو دوبارہ ٹھیک کرلیتے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ خطرناک شکل انجن کے کسی حصے کے ٹوٹ جانے سے پیدا ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے ہوائی جہاز کی رفتار میں

رفتہ رفتہ کمی ہوتی جاتی، پھر نیچے جھکتا اور بالآخر گر پڑتا تھا۔

جہازراں گرنے سے محفوظ کیسے ہوگئے؟

فی زمانہ تجربہ کار جہازراں جانتے ہیں کہ ایسے موقعے پر کیا کرنا چاہئے۔ وہ لیور (مشین کا ایک حصہ) کی مدد سے جو اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے ایلیویٹر (مشین کا حصہ) نیچے کر دیتا ہے جس کی وجہ سے جہاز کا اگلا حصہ بالکل نیچے کی طرف جھکتا ہے۔ تماشائیوں کو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاز بالکل تباہ ہو جائے گا لیکن وہ زمین پر پہنچنے سے پہلے لیور کو دوسرا چکر دیتا ہے اور اپنی مشین کو سیدھا کرتا ہوا آہستہ آہستہ زمین پر نیچے اتر جاتا ہے۔ اس سے بھی محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ مشین کو گرتے وقت دائرے کی شکل میں گھماتے ہوئے اُتارے تاکہ جہازراں آسانی کے ساتھ اپنے اترنے کی جگہ کا بہترین انتخاب کر سکے۔

دوسری طرف وہ تمام خطرات جو ایک مبتدی کو پیش آیا کرتے تھے رفع کر دئے گئے۔ چھ سال تک کوئی جہازراں کسی ایسے خطرے میں جو ہوا کے تیز چلنے سے نمودار ہو جایا کرتے تھے گرفتار نہ ہوا۔ ایک دن ایک انگریز لیتھم نے اپنی مشین کو ایک خوفناک ہوا کے تند جھونکے میں ڈال دیا۔ چند منٹ تک وہ بری طرح سے اس جھونکے کے خلاف پھٹپھٹاتا رہا۔ یکایک مڑا اور ۷۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا کے جھونکے سے نکل گیا۔ اس کے بعد ہی اس ہمت ور جہازراں نے پھر اپنا جہاز اسی تند جھونکے میں لا ڈالا اور دس منٹ کے بعد اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہوا اتر آیا۔

ایک جہازراں جو کوہ آلپس کے اوپر سے گذر گیا

اس کے بعد کے سالوں میں چیوز نامی ایک شخص نے کوہ آلپس کی بلندی کو ہوائی جہاز سے پار کر کے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ اس نے کوہ آلپس کی دوسری جانب اُڑنے میں کسی خرابی کی وجہ سے اپنی جان دے ڈالی لیکن اس نے ثابت کر دیا کہ بلند سے بلند جگہ کو پار کرنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاز کے اوپر چڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے لیکن جب جہازراں دو اور تین میل کی بلندی پر پہنچتا ہے تو ہوا کا پھیلاؤ اسے مدہوش اور بیمار کر دیتا ہے۔ اوپر ہوا میں سردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن ان تمام بانوں کے باوجود ایک جہازراں بیس ہزار فیٹ کی بلندی پر جو تقریباً چار میل کے برابر ہے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

پہلے پہل لمبے سفر کی اڑان مشکل تصور کی جاتی تھی کیونکہ ہوائی جہاز اتنے مضبوط نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنے ساتھ اس قدر ایندھن لے جاسکیں جو اس طویل سفر میں انجن کے لئے درکار ہو لیکن رفتہ رفتہ وہ اس مشکل پر حاوی ہوگئے، اور لمبی اڑانوں میں سے سب سے پہلی اڑان ایک امریکی روگرس کے ذریعے سنہ ۱۹۱۱ء میں عمل میں آئی۔ وہ نیویارک سے اڑکر کنیپاس پہنچا جو ۲۶۰۰ میل ہے۔ اس سفر میں اس کی مشین کی مرمت میں پندرہ ہزار ڈالر صرف ہوئے۔ جب وہ کنیپاس میں پہنچا تو اس کی مشین کا شاید ایک پرزہ بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہ تھا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد جبکہ وہ کیلیفورنیا کے ایک مقام لونگ برانچ پر سمندر کا کنارہ دیکھ رہا تھا کہ سمندر کی ہوا کے ایک تند جھونکے نے رڈر اور مشین کے پچھلے حصے کو بھگو دیا جس کی وجہ سے رڈر کا حرکت کرنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ جب اس کی مشین گرنے لگی تو وہ ٹھیک نہ کرسکا اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔

ایک یادداشت کے ٹوٹنے کے بعد دوسری یادداشت

روگرس کی قائم کردہ یادداشت کے دو سال بعد ایک فرانسیسی ہیلم نے ۱۳۰۰۰ میل کا سفر ۳۹ دن میں طے کیا۔ اس طرح اس نے اپنی محنت سے پہلی یادداشت کی فاتحہ پڑھ دی۔ اب یہ ممکن ہوگیا تھا کہ ایک مشین ہوا میں ۱۲ گھنٹے آسانی سے ٹھہر سکتی ہے۔ اب تو لندن سے پیرس اور جرمن کے شہروں میں بغیر کہیں اترے ہوئے اڑکر پہنچ جانا ایک معمولی سی بات تھی۔ لوگ ایک انگریز اور ایک فرانسیسی کے جہاز کا قصہ بیان کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ہوائی جہاز ایک ملک سے اڑکر دوسرے ملک میں کس رفتار سے پہنچتا تھا۔

اگلے وقت میں چالیس پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار ایک ہوائی جہاز کے لئے بہت بڑی رفتار سمجھی جاتی تھی اور آج کل یہ ممکن ہوگیا ہے کہ ایک شخص بذریعہ ہوائی جہاز ۱۲۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکتا ہے اور خوش قسمتی سے ہوا بھی موافق ہو تب تو وہ ۱۵۰ میل یا اس سے بھی زیادہ فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکے گا۔

ایک جہاز راں کے لئے ہوش و حواس کا قائم رکھنا بہت زیادہ ضروری ہے

حواس کا ٹھیک رکھنا اس شخص کے لئے جو اڑنا چاہتا ہے نہایت ضروری ہے۔ اگر جہاز راں نڈر ہے تو حادثات بہت کم

وقوع پذیر ہوں گے۔ اس لئے آج کل اس جہاز کو مکمل مانا جاتا ہے جس کا چلانے والا بھی اس کے تمام کل پرزوں کو اپنے قبضے میں کرے۔

چند سال پہلے ایک فرانسیسی ہوا باز دارد ن میں اڑ رہا تھا کہ یکایک اس کی مشین کو ایک تیز ہوا کے جھونکے نے الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک اچھی خاصی بلندی پر تھا اور ایک تسمے سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھا، مشین کو ٹھیک کیا اور آہستہ سے صحیح و سلامت نیچے اتر آیا۔ اس کے چند مہینے بعد ہی ایک دوسرے فرانسیسی نے اپنی مشین کو الٹ لیا اور اوپر سے نیچے پلٹا کھانے لگا۔ آج کل یہ ایک معمولی کرتب سمجھا جاتا ہے۔ ایک جہازراں جس نے اس کو بار بار کیا کہتا ہے کہ جہاز کے اوپر سے نیچے پلٹا کھانے میں جب تم جھکاؤ سے روانہ ہوتے ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم خاموش بیٹھے ہو اور دنیا تمھارے گرد گھومتی ہے اور افق تمھارے قدموں کے نیچے غائب ہو جاتا ہے اور پھر دوبارہ تم اسے اپنے سر پر آتے ہوئے دیکھو گے۔ یہ تمام چیزیں اس قدر جلد ہو جاتی ہیں کہ تم ایک لمحے کے لئے نہیں سمجھ سکتے کہ کیا واقعہ پیش آیا اور تمھیں سوائے اس کے اور کوئی تکلیف نہ ہوگی کہ خون تیزی کے ساتھ آنکھوں میں دوڑنے لگے گا۔ اس سے بچنے کے لئے جہازراں کو چاہئے کہ اوپر سے نیچے کی طرف ایک کرسی میں اپنے آپ کو ایک فیتے میں باندھ کر دوسری طرف لٹک جائے۔

انسان ہوا میں توازن قائم رکھنا بھول جاتا ہے۔

یہ ایک تعجب خیز امر ہے کہ انسان ہوا میں توازن قائم رکھنے کے خیال کو بھول جاتا ہے۔ جہازراں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ کب اس کی مشین آگے یا پیچھے چلتی ہے لیکن اسے اس بات کی تمیز نہیں ہوتی کہ اس کی مشین دائیں یا بائیں جھکتی ہے۔ اپنی سطح کو وہ برابر قائم رکھنے کے لئے اپنے پاس ایک آلہ رکھتا ہے جس سے وہ بخوبی پتہ چلا لیتا ہے کہ اس کی مشین کس طرف کو جھکتی ہوئی ہے۔ زمین بھی اسے اپنی حالت محسوس کراتی ہے۔ جہازراں کہرے میں جانے سے بہت ڈرتا ہے اس لئے کہ وہ وہاں پہنچ کر تمام اطراف کی اٹکل بھول جاتا ہے۔ ایک جہازران اپنا تجربہ بیان کرتا ہے کہ وہ یکایک کہرے میں آ پڑا جس سے وہ اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے اپنی مشین کو الٹ لیا۔ اس کے باوجود بھی اسے اس کی تمیز نہ تھی کہ اس کا سر نیچے لٹک رہا ہے۔ لیکن جب فیتہ جس سے وہ

بندھا ہوا تھا کھنچ گیا اور اس کی جیب سے چیزیں نکل کر ہوا میں اڑنے لگیں تو اسے خیال ہوا کہ اس نے اپنی مشین الٹ لی ہے۔ پھر اسے سیدھا کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوائی جہاز کو جو پہلا عملی جامہ پہنایا گیا وہ لڑائی کے مقصد کے لئے تھا۔ ایک جنرل کے لئے اس سے زیادہ اور کیا قیمتی چیز ہو سکتی ہے کہ وہ ہوا میں ایک میل کی بلندی پر اڑ کر اپنے دشمنوں کی نقل و حرکت کا بالکل اسی طرح معائنہ کرے جیسے کہ ایک شخص نقشے میں مقامات کو دیکھتا ہے۔

جنگ میں ہوائی جہاز کی سب سے بڑی اہمیت

دوران جنگ عظیم میں ہر ایک فوج اپنی اڑنے والی پلٹن کے ساتھ جس میں سو سو جہاز راں ہوتے تھے شامل ہو گئی تھی۔ ان میں سے چند ہمت ور اسکاؤٹ تو وہی ہیں جنھوں نے اگلے وقت میں اپنے اپنے کرتب دکھلائے۔ اس زمانے میں اسکولوں کو خاص کر اسی لئے قائم رکھا گیا کہ لڑکوں کو جہاز رانی سکھلائی جائے۔ چنانچہ وہ تمام واقعات جن کو اڑنے والے اسکاؤٹوں نے تجربے سے معلوم کیا تاریخ جنگ عظیم کا سب سے زیادہ دردناک حصہ ہے۔

ہر روز علی الصباح اسکاؤٹ جہاز راں اپنے خیمے سے مشین میں باہر نکلتا اور ایک گول دائرہ بناتا ہوا وہ ایک میل کی بلندی پر چلا جاتا۔ بعض بعض مرتبہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اپنے کسی ایک ساتھی کو بھی ساتھ لے لیتا جس کی جگہ اس کے آگے ہوتی۔ اس کا کام صرف یہ ہوتا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے ان تمام حرکتوں کو جو اس کے نیچے ہوتی تھیں بغور ملاحظہ کرے۔ پھر یکایک مشین آگے چھٹتی تھی اور ان مہلک چیزوں کو جو وہ اپنے ساتھ رکھتی تھی دشمنوں کی فوج میں پھینک دیتی تھی۔ فوراً ہی دشمنوں کی فوجی بندوقیں چلنے لگتیں جن کی گولیاں بلا مبالغہ پانچ پانچ میل تک اوپر جاتی تھیں اور رائفلیں لگاتار چھوٹنے لگتیں۔ اس عرصے میں وہ کم سے کم چار ہزار فیٹ سے زیادہ بلندی پر پہنچ جاتے۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر دشمنوں کی فوجوں کا فوٹو بھی لیا کرتے تھے۔

پھر وہ اوپر جا کر یہ نہیں کہ خاموش اڑا کرتے بلکہ اوپر ہی اوپر دشمن کے علاقے پر نظر بھی رکھتے اور جب موقع ہاتھ آتا نیچے جھکتے اور ایک بم یا تو کسی ٹرین پر جو بارود سے بھری رہتی یا کسی فوج پر پھینک کر اڑ جاتے۔ ادھر سب چیزیں جل کر خاک سیاہ ہو جاتیں۔ بعض بعض وقت ہوائی جہازوں کا آپس میں مقابلہ

بھی ہوتا تھا۔ یہ ہوا بازوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک موقع تھا۔ ان میں سے ہر ایک کبھی جھپٹتا کبھی دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے گرد گھومنے لگتا۔ غرضکہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ اسے کوئی اچھا موقع ملے کہ وہ فوراً حملہ کردے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے کوئی نہ کوئی کامیاب ہوجاتا۔ ایک فرانسیسی مسٹر پیگوڈ جنھوں نے سب سے پہلے ہوائی جہاز سے اوپر سے نیچے ٹکر کھانے کا طریقہ معلوم کیا اس قسم کی بہت سی لڑائیاں لڑچکا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی مشین بالکل بے کار ہوگئی اور وہ دشمن کے علاقے میں گر پڑا اور اس کی مشین گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ یہ دیکھ کر اس کے اوپر ایک دشمن آپڑا۔ مسٹر پیگوڈ نے جس کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی فوراً جھپٹ کر دشمن کو جو ایک جرمن تھا مارا اور اس کے جہاز میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں پہنچ گیا لیکن اس کے چند ہی ہفتے بعد مسٹر پیگوڈ کا اس کے کسی دشمن نے بندوق سے خاتمہ کردیا۔ اس کے چند دن کے بعد اس کی قبر پر ایک پھولوں کا ہار جو عیسائیوں کے دستور کے مطابق مردے کے ساتھ بھیجا جاتا ہے، ہوائی جہاز سے گرا دیا گیا۔ ہار کے ساتھ ایک پٹھا دستیاب ہوا جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی "پیگوڈ جو اپنے دشمن کے ہاتھوں ایک بہادرانہ موت مارا گیا"

ہوائی جہاز کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا کوئی نہیں بتلا سکتا۔ ہاں فلموں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہوائی جہاز آگے چل کر گھر گھر اسی طرح پھرا کریں گے جیسے فی زمانہ موٹر چلا کرتے ہیں۔

مطالبات

نگاہِ محبت فزا چاہتا ہوں
مسافر ہوں اک رہنما چاہتا ہوں

تجلی نظر آشنا چاہتا ہوں
تجھے جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہوں

ستم چاہتا ہوں جفا چاہتا ہوں
کہ مشقِ طریقِ وفا چاہتا ہوں

نہ پوچھے کوئی مجھ سے کیا چاہتا ہوں
کہ اپنے کیے کی سزا چاہتا ہوں

ابھی خام ہے کچھ مذاقِ تمنا
کرم ہائے صبر آزما چاہتا ہوں

مجھے کوئی کافر مسلمان کر دے
مجازِ حقیقت ادا چاہتا ہوں

دلا دے کوئی یاد، بھولا ہوں کس کو
بتا دے کوئی، ہائے کیا چاہتا ہوں

خریدار ہے کون دنیا میں دل کا
کہاں اور کیا بیچنا چاہتا ہوں

خطا پر ندامت خطا در خطا ہے
خطا کر کے دادِ خطا چاہتا ہوں

کیا ہے محبت نے گستاخ کتنا
کہ تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں

ہوس چاہتی ہے تجلیِ عریاں
مگر میں نگاہِ رسا چاہتا ہوں

جو قیدِ مجاز و حقیقت اٹھا دے
وہ کیفیتِ دل کشا چاہتا ہوں

تمنا مری اور محدود کوکب
مقامِ ورا الورا چاہتا ہوں

رقابت

نسیمہ کو اپنے شوہر کریم سے غیر معمولی محبت تھی۔ کریم کی شریک زندگی بن کر وہ اپنے آپ کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتی تھی مگر قدرت ان دونوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کرنا چاہتی تھی........کریم کو اپنی بعض ضروریات کی تکمیل کے لئے وطن کو کچھ دنوں کے لئے خیرباد کہنا پڑا........ریل کا سفر تھا گاڑی اپنی پوری رفتار سے چل رہی تھی کہ ایک اسٹیشن کے قریب لائن ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے پہیئے پٹری سے اتر گئے اور گاڑی الٹ گئی۔ ڈبوں کے ٹکرانے سے بہت سی جانیں ضائع ہوئیں، کریم بھی انھیں جان دینے والوں میں سے تھا۔ لاش کو اس کے گھر پہنچایا گیا۔ بیوی جس نے جلد ملنے کی آرزو میں شوہر کو ہنستے ہوئے الوداع کہا تھا اب حسرت ویاس کے ساتھ اس کا استقبال کر رہی تھی۔

لاشے کی ہمراہی میں ایک ڈاکٹر اور دو سپاہی تھے۔ میت کو ورثا کے سپرد کرتے ہوئے ڈاکٹر نے نسیمہ کے ساتھ بہت ہی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ نصیحت کی کہ نعش کو ہرگز نہ دیکھنا تاکہ اس کی وہ زندہ تصویر جو تم نے اسے الوداع کہتے وقت اپنے تصور میں قائم کی تھی ہمیشہ کے لئے تمہارے ذہن میں رہے۔ نسیمہ اس نصیحت کی تلخی کو برداشت نہ کر سکی، بے ساختہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی لیکن اس نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ مسرت و انبساط کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس لئے ڈاکٹر کے مشورے کو مان لینا ہی بہتر ہے کیونکہ مرحوم کے بے حس و حرکت اور ٹکڑے ٹکڑے جسم سے۔ صحیح وسلامت جسم کی خیالی تصویر بدرجہا بہتر ہے۔

مرحوم گاڑی الٹنے کے بعد بھی چند منٹ تک زندہ رہے۔ ڈاکٹر نے کہا " اور جب ان کو اٹھایا گیا ہے تو ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی بیوہ کے حق میں کوئی وصیت نامہ لکھا ہے۔"

نسیمہ نے والہانہ انداز میں ڈاکٹر کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ خون آلود کاغذ میں پنسل سے

یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں، دیکھو! اُسے نہ بھولنا........

یہ الفاظ ایک معما تھے۔ نسیمہ ان کے حل کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر ناکام رہتی تھی۔ بس اس وقت سے اس کا یہ شغلہ ہو گیا کہ ان الفاظ کو بار بار دہراتی اور حل کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ مضطرب تھی کہ کس طرح یہ معما حل ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ کون عورت ہے جس کو میرا شوہر زندگی کے آخری اور نازک ترین لمحات میں بھی نہیں بھولتا۔

وقت گذر رہا تھا، حیرت و استعجاب اس کی رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا اور صرف چند گھنٹوں کے غم و الم نے اسے برسوں کا بیمار بنا دیا تھا۔

جنازے کو اول منزل کرنے کے لئے مجلس عزا برپا ہوئی اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ نسیمہ نے ایک نقاب پوش عورت کو دیکھا جو مجمعے کے بالکل سامنے کھڑی ہوئی تھی، سراپا رنج و اندوہ کی تصویر معلوم ہوتی تھی.........، تمام حاضرین کریم کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کر رہے تھے بعض لوگ مرحوم کی بیوہ کے ساتھ خود بھی شریک بین تھے لیکن اس نقاب پوش عورت کی کچھ ایسی بری حالت ہو رہی تھی جو دیکھی نہیں جاتی تھی،......... امام نے مجلس کو ختم کرنے کے لئے اپنی نصیحت آمیز تقریر شروع کی، نقاب پوش عورت شدت غم سے اس آخری حملے کو برداشت نہ کر سکی، پیر لڑکھڑائے اور دھم سے زمین پر آ رہی۔ کچھ لوگ دوڑے اور معبد سے باہر کھلی فضا میں لا ڈالا۔

نسیمہ کو یقین ہو گیا کہ میرے عزیز شوہر نے اسی عورت کے متعلق وصیت کی ہے، میرا فرض ہے کہ اس سے ملوں اور اس کے حالات معلوم کروں۔

نعش سپرد خاک کر دی گئی۔ نسیمہ اس حالت میں گھر کو پلٹی کہ چہرہ زرد تھا، کثرتِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نسیمہ کے ساتھ ایک اور شخص بھی ہو لیا تھا جو رشتے دار تھا اور کریم کا دوست بھی۔ نسیمہ نے شوہر کی آخری وصیت کی اسے اطلاع دی اور اس سے خواہش کی کہ کسی طرح اس عورت کا پتہ چلائے جس کی حالت آج کے مجمعے میں سب سے زیادہ نازک تھی۔

کریم کی یاد نے دوبارہ بے قرار کر دیا "اس شخص نے بہت ہی مایوس ہو کر کہا"........ غم

کی کیا حقیقت ہے میری رائے میں تو سب کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن ہو جانا چاہئے تھا......" نسیمہ کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور اس نے اس طرح اس شخص کی طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ "...... محبت کی کشمکش موت کی سختیوں سے کہیں زیادہ ہے......" ایک آہ سرد کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز سے کہا"...... کریم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں اس عورت سے تعارف پیدا کروں اور اس کی خبر گیری کروں ...... کیا معلوم کہ اس کے پاس کریم کی بولتی چالتی یا قابل دید کوئی نشانی ہو۔"

"اس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔" اس شخص نے کہا۔

نسیمہ۔ کریم سے اس کے تعلقات کا تمھیں علم ہے؟

شخص۔ ہاں! اس لئے تو میں عرض کر رہا ہوں کہ اس قصے کو مرحوم کے ساتھ ہی دفن کر دو تاکہ تمھاری زندگی اور اجیرن نہ ہو۔

یہ سننا تھا کہ نسیمہ کی سوزش قلب میں اور اضافہ ہو گیا لیکن اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ میں اپنے شوہر کی محبوبہ سے ضرور ملاقات کروں گی، گو مجھے ناقابل برداشت مصائب ہی کا کیوں نہ سامنا کرنا پڑے۔

تین دن کے بعد نسیمہ کے گھر ایک نوجوان لڑکی آئی جس کا نام امینہ تھا، سیاہ لباس زیب تن تھا، چہرے سے غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ نسیمہ نے بڑے زور شور سے اس کا استقبال کیا اور اس کے ساتھ رہنے کی خواہش کی۔

نسیمہ کے عزیز و اقارب کو یہ خبر پہنچی تو سب کے سب حیران ہو گئے۔ کوئی نسیمہ کی وسیع القلبی کی تعریف کر رہا تھا، کوئی اس نرمی پر اسے ملامت کر رہا تھا لیکن نسیمہ شوہر کی وصیت کے پورا کرنے ہی میں ہر چیز سے زیادہ مسرت محسوس کر رہی تھی۔

دن کا اکثر حصہ اس طرح پر گذرتا تھا کہ نسیمہ کریم کے متعلق امینہ سے گفتگو کرتی رہتی تھی۔ دونوں میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ ایک دوسرے کا غم غلط کرے۔

ہر صبح کو دونوں ساتھ ساتھ مرحوم کی قبر پر جاتیں، کچھ دیر وہاں ٹھہر کر اپنی گذشتہ زندگی کی یاد

کرتیں اور پھر گھر لوٹ آتی تھیں جہاں ان کا سارا دن مختلف تذکروں میں گذرتا تھا۔ ہر ایک کریم سے اپنی محبت کی داستان کو اول سے آخر تک پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرتی تھی یا پھر کریم کے خطوط کو پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد یہ رد عمل شروع ہوا کہ نسیمہ امینہ کی داستان سنتی، اپنے شوہر کے خطوط جو امینہ کے پاس بھیجے گئے تھے، پڑھتی،........ دل میں ایک اضطراب پیدا ہوتا اور آنکھیں حسرت سے نم ہو جاتی تھیں...... میں نے اس کے ریزہ ریزہ جسم کو دیکھنے سے اس لئے انکار کیا تھا کہ اس کی پیاری اور زندہ صورت میرے خیال میں موجود رہے لیکن اب میں دیکھتی ہوں کہ اس کی زندگی کس قدر آلودہ تھی، اس سے متعلق جو لفظ بھی سنتی ہوں وہ میرے دل پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے...... میں اس سے محبت کرتی تھی، اس کے خلوص پر مجھے اعتماد تھا، میں اپنے آپ کو اس کی موجودگی میں بڑا خوش قسمت سمجھتی تھی...... لیکن اب میں اپنے گذشتہ اعتماد پر متاسف ہوں....... یہ سوچتے سوچتے نسیمہ کا دل پھر مایوسیوں سے بھر گیا، اس کی زندگی پھر مکدر ہو گئی، دل ہی دل میں نادم تھی کہ میں نے امینہ کو کیوں پاس رکھا اور ان رنج دہ واقعات کو کیوں سنا....... اسے امینہ سے ایک نفرت سی ہو گئی کیونکہ وہ نشانیاں جو امینہ کے حصے میں آئی تھیں وہ نسیمہ کے حق زوجیت کو چھیننے والی تھیں، اس کی گذشتہ کامرانیوں میں ایک طرح کا سرقہ تھیں۔

ایک صبح کو نسیمہ تنہا کریم کی قبر پر چلی گئی، پہنچی ہی تھی کہ امینہ کو آتے ہوئے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا جسے مزار پر چڑھاتے ہوئے اس نے نسیمہ سے کہا، کیوں بہن! آج تم اکیلی ہی چلی آئیں؟

نسیمہ نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا، ہاں!......... اور اس وقت سے ہم ایک دوسرے سے قطع تعلق ہی کر لیں، تو بہتر ہے۔

امینہ پر سکتہ سا چھا گیا لیکن پھر بھی اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا، ہاں! ہمیں اس وقت سے پہلے ہی علیحدگی اختیار کر لینا چاہئے تھی!

نسیمہ۔ کاش.......... ۔ ۔ کریم کی موت کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہوتی......
..... سچ پوچھو تو آج دوبارہ کریم کو اپنے ہاتھوں سے کھو رہی ہوں.............
لیکن آج کا............ صدمہ............ اس کی موت کے دن کے صدمے
سے بدرجہا زیادہ ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب

نوجوان ورتھر کی داستان غم۔ حدیث ادب۔ تعلیم ونفسیات۔ مونا دانا کلید قرأت۔

لاالہ الا اللہ نفسیات مذہب۔

نوجوان ورتھر کی داستان غم | گوئٹے کا مشہور ناول مترجمہ ریاض الحسن صاحب ایم۔ اے۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۱۶، حجم ۱۴۴ صفحے، مقدمہ مترجم ۵۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ اچھا، قیمت عہ مجلد عا۔ شائع کردہ لٹریری سنڈیکیٹ نمبر ا بیلی روڈ الہ آباد۔

ورتھر گوئٹے کی نوجوانی کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ ان دنوں کچھ عمر کے تقاضے سے کچھ زمانے کی ہوا کے اثر سے گوئٹے رومانی رنگ میں سر سے پیر تک رنگا ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی موجودہ دور بگڑی ہوئی رومان پرستی کا دور ہے۔ اس لئے ورتھر ہمارے عام مذاق سے ملتی جلتی چیز ہے اور اس کے ترجمے کو لوگ دلچسپی سے پڑھیں گے۔ یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جو احساس کی تیزی اور جذبات کی شدت کا شکار ہو کر نہ صرف مفید عمل سے بلکہ صحیح مشاہدے سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ ایک طرف اس کا حساس دل محبت اور انس سے معمور ہے جذبات لطیف کی ہلکی سے ہلکی آواز کو سنتا اور سمجھتا ہے حسن فطرت اور حسن انسانی کے گوناگوں جلووں کا لطف اٹھاتا ہے مگر دوسری طرف روزمرہ کی زندگی میں وہ واقعات کے صحیح تناسب کے اندازے سے معذور ہے، اس کی قوت ارادی اور قوت عمل عام معیار سے بہت کم ہے۔ اس کا عشق میں مبتلا ہو جانا سونے پر سہاگا ہو جاتا ہے۔ اس کا احساس وہ چند قوی اور ادراک، ارادہ اور عمل اسی نسبت سے ضعیف ہو جاتا ہے۔ اضطراب اور التہاب بڑھتے بڑھتے بلائے جان ہو جاتا ہے اور وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں گوئٹے نے خود اپنی ایک داستان محبت بیان کی ہے اور سوائے خودکشی کے اور سارے واقعات خود اس پر گذرے تھے۔

ترجمہ گو انگریزی کے واسطے سے کیا گیا ہے مگر انگریزی عبارت سے قریب رہنے کی وجہ سے اصل سے زیادہ دور نہیں ہوا۔ البتہ روانی جو اصل کتاب کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے ترجمے میں نہیں پائی

جاتی۔ کہیں کہیں الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی ترکیب قابلِ اعتراض ہے۔ ذیل میں ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

صفحہ ۲ ۔ "میں اس کے ستونے مالک پر ایک اجڑے ہوئے کتاب خانے میں جو اس کی محبوب جگہ تھی اور آج میری ہے آٹھ آنسو بھی رو چکا ہوں۔"

صفحہ ۳ ۔ "جب گھاس کی پتیوں میں اس چھوٹی دنیا کا ترنم سن کر بے شمار کیڑوں اور مکوڑوں پر وقف تماشا ہوتا ہوں تو اس وقت میں اپنے ننھا نخانہ دل میں اس مجلی ہستی کی جھلک پاتا ہوں جس نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے اور جس کی ابدی رحمت ہماری زندگی کا ستون ہے۔"

صفحہ ۴ ۔ "درختوں کا جھرمٹ" ـــ "بطریقی تمدن"

(Patriarch جب کلیسا کے ایک مخصوص مذہب کے معنی میں ہو تو اس کا ترجمہ بطریق کر سکتے ہیں ورنہ سردارِ خاندان، سردار قبیلہ یا سرقبیلہ۔ بطریقی کی جگہ سرقبیلی کہہ سکتے ہیں جو جامعہ عثمانیہ کی ایک کتاب میں استعمال ہوا ہے۔)

صفحہ ۵ ۔ "تم نے اکثر پریشان ہو کر میرے چہرے کی کیفیت انتہائی رنج سے انتہائی خوشی میں اور معمولی دلگیری سے تند جذباتی میں بہ سرعت بدلتے دیکھا ہے۔"

... ...

کتاب کے ساتھ مبسوط مقدمہ ہے جس کا نام خدا جانے کیوں "ابتدائیہ" رکھا گیا ہے۔ مقدمے میں گوئٹے کی زندگی کے حالات، اس کی تصانیف کا مختصر اور ویرتھر کا کسی قدر مفصل ذکر اور گوئٹے کے فلسفۂ حیات کا لباب ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی مقدمہ نگار کی وسعت مطالعہ اور دقت نظر کا ثبوت ملتا ہے اور کتاب کی اہمیت پوری طرح پڑھنے والوں کے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

حدیثِ ادب | حضرت احسان بن دانش کا دیوان تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۶۰ صفحے، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت عہ مجلد عہ، شائع کردہ انجمن تعمیر ادب، ملنے کا پتہ: ذی شان بک ڈپو، مزنگ لاہور۔

حضرت احسان کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے باشندے ہیں اور غالباً لاہور میں مقیم ہیں۔ آپ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے شاگرد رشید ہیں جنھوں نے "اوائل عمری میں آپ کو زریں ارشادات سے احساس

کی دولت جاوید عطا کر کے فراق کی روح فرسا گھڑیوں کی سپرد کر دیا۔" آپ کے کلام سے واقعی شاعرانہ احساس اور تاثر کا ثبوت ملتا ہے اور ایک عرصے کی مشق اور کاوش کا پتہ چلتا ہے۔ زیادہ تر غزل کے مروجہ رنگ کی پیروی ہے البتہ بعض اشعار میں مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور کہیں کہیں کوئی ایسا شعر بھی نکل آتا ہے جو اہل ذوق کو پھڑکا دیتا ہے۔ اس مجموعے میں آپ کے " دور اولیں" اور " دور ثانی" کی غزلیں ہیں اور چند قطعے اور رباعیاں "حسن منتشر" کے عنوان سے۔ ذیل میں ہم چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں:-

تو مل گیا کہ ڈھونڈھنے والے نہیں رہے ہنگامہ کیوں وہ اب سر منزل نہیں رہا

مرے جہان تمنا کا آسرا تو ہے تری تمام اداؤں کا مدعا ہوں میں

خدا کے لئے اب تو بالیں پہ آؤ دعا کر رہے ہیں دوا کرنے والے

کہاں کی منزل مقصود، کارواں کیسا تری تلاش میں ہوں اپنی جستجو کے لئے

افسوس ہے کہ بعض اوقات حضرت احسان نے الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہو جائے گا:-

ع - چاندنی رات اور یہ قبرستاں کی سرزمیں

ع - ہٹا دے اس سیہ کارہ کا پہرا کعبۂ دل سے

اللہ اللہ سجدۂ پائے صنم کی کیفیت مجھ کو کعبے میں کبھی یہ محویت حاصل نہ تھی

ع - رب ارنی کی حدیں ضبط نے جب طے کرلیں

تعلیم ونفسیات | ازمیاں ظہور الدین احمد ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، پروفیسر فلسفہ و منطق اسمٰعیل کالج اندھیری، تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶، حجم ۴۵ صفحے، لکھائی چھپائی بہت معمولی، کاغذ اوسط درجے کا، قیمت ۸/، غالباً مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک لکچر ہے جو میاں ظہور الدین احمد صاحب نے بمبئی کارپوریشن کے اردو اسکولوں کے معلموں کے جلسے میں دیا تھا اور اب رسالے کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ اس میں عام فہم الفاظ میں دلچسپ طریقے سے تعلیم کا حقیقی مقصد اور تعلیم اور نفسیات کا باہمی تعلق سمجھایا گیا ہے۔ مقصد کی بحث میں تعلیم کا تعلق اخلاق اور معاشرت سے خوبی کے ساتھ دکھایا ہے۔ اس کے بعد ان نفسی قوتوں کا ذکر ہے جو عملی تعلیم میں معاون ہوتی ہیں۔ ان کے وظائف کی تشریح ہے اور ان سے کام لینے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ علاوہ مدرسوں کے ان سب حضرات کو جو تعلیم کے مسئلے سے ذوق رکھتے ہیں اس رسالے کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

مونا وانا (ڈراما) | مصنفہ میٹرلنک، مترجمہ جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم مع فرہنگ ۱۴۲ صفحے، قیمت ۱۲/

جلیل احمد صاحب قدوائی اس سے پہلے بھی یورپی زبانوں کے ادبی کارناموں کا ترجمہ کرکے اردو زبان کی خدمت کر چکے ہیں۔ مونا وانا ہمارے ادبی ذخیرے میں ایک اور قابل قدر اضافہ ہے۔ ڈراما کا موضوع ایک مشہور تاریخی واقعہ ہے اور میٹرلنک نے اس واقعے کو دلچسپ طریقے سے بیان کرنے کے علاوہ اخلاقی فرائض کی کشاکش اور محبت کا بے باک دلوں پر افسوں پھونکنا بھی بہت خوبی سے دکھایا ہے۔ تاریخ سے جنھیں شوق ہے وہ اطالیہ کی سیاسی اور ذہنی فضا کے مشاہدے سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

کلید قرارت | ازمولانا خلیل احمد صاحب فاضل دینیات، سائز جیبی، حجم ۴۵ صفحات، قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ، دہلی۔ یا مولانا خلیل احمد صاحب جمالیہ عربک کالج پرسوبارکس مدراس۔

فن تجوید و قرأت پر اس سے پہلے بھی اردو میں دو ایک رسالے نکل چکے ہیں لیکن مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ رسالہ جدید اسلوب پر لکھا ہے۔ زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے اور ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی دئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ بچوں کے لئے یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا۔

لاالہ الااللہ | از مولوی محمد ادریس خاں صاحب نجیب آبادی تقطیع خورد، حجم ۔ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی، قیمت ۵ر ملنے کا پتہ : منیجر مکتبہ عبرت نجیب آباد ۔

اس رسالے کا مقصد خود مصنف کے الفاظ میں حسب ذیل ہے ۔

"اس رسالے میں توحید باری تعالیٰ اور شرک کا بیان ہے تاکہ مسلمان شرکیہ عقاید و اعمال سے پرہیز کر سکیں ۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اس رسالے میں "بداعمالیوں اور بدعقیدگیوں کا رد ہے لیکن کسی خاص شخص یا جماعت کو نشانہ نہیں بنایا گیا نہ کسی خاص شخص کا نام لیا گیا ہے، نہ کسی شخص یا جماعت کا خصوصی تصور اس رسالے کی نگارش و تالیف کے وقت ذہن میں موجود تھا ۔ اگر ایسا ہوتا تو رسالے کے مضامین کا اثر ناقص اور اس کے منافع کم ہو جاتے ۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں خواہ وہ ہندوستان کے ہوں یا کسی دوسرے ملک کے قرآن و حدیث سے بے توجہی بڑھتی جا رہی ہے ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ طرح طرح کے عقائد و توہمات نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے جن کا صحیح اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں ۔ جناب مصنف کا مقصد اس رسالے سے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس دین مبین سے روشناس کریں جو قرآن و حدیث میں ہے ۔ کتاب کی موٹی موٹی سرخیاں یہ ہیں، ہستی باری تعالیٰ اور شرک، اسلام، اختلاف مذاہب کی حقیقت، توحید فی العبادۃ، شرک کی حالت زار، مشرکین کے احوال و اقوال قرآن مجید کی روشنی میں، تمام مشرکوں کی ایک ہی آواز، قرآن مجید سے مشرکوں کا اعراض، کیا واقعی قرآن مجید کا سمجھنا سخت دشوار ہے، مسلم نما مشرکین کے اقوال و عقاید وغیرہ ۔"

یہ عنوانات بجائے خود کتاب کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں ۔ ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے استدلال اور استناد اکثر و بیشتر قرآن مجید اور صحیح احادیث سے کیا ہے ۔ طرز بیان بھی سنجیدہ، صاف، سلیس اور سلجھا ہوا ہے ۔ مناظرہ کا رنگ اختیار نہیں کیا گیا ہے ۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے مفید ہے ۔

نفسیات مذہب | از جناب سید وہاج الدین صاحب بی ۔ اے، بی ۔ ٹی، استاد عثمانیہ کالج اورنگ آباد، تقطیع خورد، ضخامت ۶۰ صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ، کاغذ متوسط، قیمت ۸ر ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی ۔

یہ مقالہ پروفیسر وہاج الدین صاحب نے جنوری ۳۲ء میں اردو اکادمی کے جلسے میں پڑھا تھا ۔

نفسیات مذہب بظاہر ایک خشک علمی مضمون ہے لیکن پروفیسر صاحب کے طرز بیان نے اس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کردی ہے۔ جامعہ کے پچھلے نمبروں میں اس مقالے کا ملخص بھی شائع ہو چکا ہے اس لئے ہم کسی تفصیلی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتے ناظرین نے خود ہی اندازہ کرلیا ہوگا۔

رسائل و اخبارات

ترجمان القرآن۔ طبیب روحانی۔ بہار (ہفتہ وار)۔ محدث (ماہوار)۔ بالیات (ماہوار)۔ افسانہ (ماہوار)۔ گہوارۂ ادب

ترجمان القرآن | ایڈیٹر سید ابوالاعلیٰ مودودی، سائز جامعہ کا، ضخامت ۶۴ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت عہ سالانہ۔

ترجمان القرآن پر جامعہ کی کسی اشاعت میں ریویو ہو چکا ہے۔ دوسری جلد کے آغاز سے اس میں اہم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ سائز بڑا کر دیا گیا ہے۔ ادارت مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو تفویض ہوئی ہے مضامین میں بھی خاص تنوع ہے۔ کتابت وطباعت بھی آتنی بہتر ہے کہ غالباً اس سے بہتر حیدرآباد میں ممکن نہیں۔ ہم اس اعلیٰ علمی اور مذہبی رسالے کے مطالعے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

طبیب روحانی | ایڈیٹر پروفیسر واقف شمس الافاضل ضخامت ۵۶ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۸، چندہ سالانہ عہ، مقام اشاعت لاہور۔

یہ رسالہ لاہور کے مشہور عامل جناب کریم الدین صاحب کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ پہلے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے بند ہو گیا تھا۔ اب پھر جاری ہوا ہے۔

بہار ہفتہ وار | چیف ایڈیٹر لالہ رگھوناتھ رائے ایم۔ اے۔ یہ ہفتہ وار رسالہ بچوں اور بچیوں کے لئے لاہور سے نکلتا ہے۔ زیر نظر نمبر لطیفہ نمبر ہے۔ اس میں بچوں کی دلچسپی کے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم کی ایک نظم (پیام عمل) کے دو شعر جناب ایڈیٹر نے اکبر مرحوم کی طرف منسوب کردئے ہیں۔

محدث (ماہوار) | ایڈیٹر عبدالحلیم ناظم صدیقی رحمانی حجم ۱۶ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت متوسط، کاغذ معمولی، مقام اشاعت دارالحدیث رحمانیہ دہلی۔

یہ رسالہ دہلی کے مشہور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ کا آرگن ہے۔ جناب شیخ عطاء الرحمٰن صاحب اس کے مالک اور مولانا احمداللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ نگراں ہیں۔ اس کا پہلا نمبر پیش نظر ہے۔ شروع میں 'مناسبات' کے عنوان سے جناب ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ ہے اور اس میں اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ مضامین سب مذہبی ہیں اور نہایت آسان اور سادہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ چند عنوانات یہ ہیں: توحید باری، موجودہ مسلمان اور قرآن، صحابۂ کرام اور حبِ نبوی، محرم میں مسلمانوں کا حقیقی لائحۂ عمل وغیرہ۔ عام افادے کی غرض سے رسالے کی قیمت کچھ نہیں رکھی گئی ہے صرف ۱؍ کے ٹکٹ دفتر میں بھیج دینے پر رسالہ غالباً سال بھر کے لئے مفت جاری ہو جائے گا۔

مالیات (ماہوار) | ایڈیٹر سید حفظ الرحمٰن، ضخامت ۵۰ صفحات، تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت و طباعت اچھی، چندہ سالانہ ۲؍، مقام اشاعت دی پریمیر انشیورنس کمپنی لمیٹڈ، پٹنہ۔

ہندوستان میں بنکنگ اور بیمہ کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ رسالہ انھیں چیزوں کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچانے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ اس کے سرپرست بہار کے مشہور رہنما قاضی احمد حسین صاحب اور نگراں بابو سید محمد جلیل صاحب ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں نثر و نظم کے کل ۱۹ مضمون ہیں اور تمام کے تمام کسی نہ کسی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان میں مالیات، بیموں کی تاریخ، ممالک اسلامیہ میں بیمہ کا رواج، بنکنگ، مسلمانوں کے مالی تنزل کے اسباب، صرف عامرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ غرض رسالہ اپنے مقصد کے اعتبار سے کامیاب ہے اور محنت سے مرتب کیا جاتا ہے۔ جن حضرات کو ان مسائل سے دلچسپی ہو ان سے ہم اس کے مطالعے کی سفارش کریں گے۔

افسانہ (ماہوار) | سرپرست جناب سردار سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب، مدیران اعزازی ملک محمد اسلم خاں ایم۔ اے کینٹب و سردار موہن سنگھ ایم۔ اے، پی ایچ ڈی و سید عابد علی عابد ایم۔ اے، مدیر مسئول سید

نذیر نیازی صاحب بی۔ اے (جامعہ) قیمت سالانہ اعلیٰ ایڈیشن تین روپے معمولی دو روپیہ۔

یہ رسالہ فن افسانہ نگاری کو ترقی دینے کے لئے نکالا گیا ہے۔ شروع میں سر اکبر حیدری، سر فضل حسین، سید راس مسعود، سر جوگندر سنگھ، مسٹر گوکل چند نارنگ، ڈاکٹر ٹیگور وغیرہم کے پیغامات ہیں۔ اس کے بعد کوئی بارہ مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضامین کی ابتدا تقریب سے ہوتی ہے۔ اس میں جناب ملک عبدالقیوم صاحب نے رسالے کے مقصد کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:۔

"ہندوستان میں فن افسانہ نگاری کے نام لیوا زمانۂ قدیم سے موجود ہیں مگر ان افسانہ نگاروں کی تصانیف کا بیشتر حصہ ذوق سلیم سے گرے ہوئے اجزا پر مشتمل ہے۔ بس ضرورت ہے کہ اس فن کی ضرورت زمانے کے مطابق تجدید کی جائے اور شائقین فن کے لئے ایک خوان ادب ترتیب دیا جائے جس سے ایک طرف اردو ادب کے قرار و قیام میں مدد ملے تو دوسری طرف تہذیب اخلاق ایسے مہتم بالشان مقصد کی توسیع ہو۔۔۔۔۔ الخ"

ہماری بھی دعا ہے کہ "افسانہ" اپنے ان اعلیٰ مقاصد میں کامیاب ہو۔ رسالے کا اٹھان اچھا ہے امید ہے کہ آئندہ اور ترقی کرے گا۔

گہوارۂ ادب (مصور) | ایڈیٹر ایم۔ اے سبزواری و شانتی نرائن ورما ضخامت ۶۰ صفحات تقطیع [illegible]، قیمت فی پرچہ ۶/، مقام اشاعت بھوپال۔

یہ الگزنڈرا (جہانگیر) ہائی اسکول بھوپال کا آرگن ہے اور غالباً سالانہ نکلے گا۔ مضامین نظم و نثر کی تعداد ۲۹ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر اسکولوں کے طلبہ ہی نے لکھے ہیں خصوصاً دسویں درجے کے لڑکوں کا حصہ زیادہ ہے۔ مضامین کی ترتیب میں ہر قسم کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ طلبہ کی بعض نظمیں خاص طور سے اچھی ہیں خصوصاً شکر نعمت اور جامعۂ عثمانیہ۔ عزم انسانی کے عنوان سے ایک نظم مولانا فہمی ترمذی کی ہے اور بہت اچھی ہے۔ غرض رسالہ مجموعی حیثیت سے بہت بہتر ہے۔ ہم اس اسکول کے طالب علموں کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی یہ ادبی کوششیں اسی طرح جاری رہیں گی۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

یورپ اور آنے والی جنگ؟ ابھی تین ہی برس ہوئے ہیں کہ دنیا کی تقریباً تمام متمدن قوموں نے مل کر ایک عہد کیا تھا (میثاق کیلاگ) کہ اب دنیا میں کبھی جنگ نہ ہوگی! آج دو براعظموں میں جنگ ہو رہی ہے!! ۴۳ قوموں نے متفقہ طور پر چین میں جاپان کے اقدام کو برا بتلایا مگر جاپان کی فوجیں چین میں شہر پر شہر فتح کرتی جاتی ہیں اور منچوریا کے علاوہ ملک کے بہت بڑے حصے پر قابض ہو چکی ہیں۔ آج سے تین سال پہلے موسیو بریان کی "ریاستہائے متحدہ یورپ" کا چرچا تھا۔ آج یورپی ریاستوں میں خفیہ معاہدے ہو رہے ہیں اور آنے والی جنگ کی پیش بندیاں۔ یورپی ممالک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے، معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم دوسری قوم سے خائف ہے اور خصوصاً جب سے جرمنی میں ہٹلر کی جماعت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے جنگ کے امکان پر ہر طرف گفتگو ہو رہی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ یہ اندیشہ اس قدر عام کیوں ہے؟

جرمنی سب سے پہلے جرمنی کو لیجئے۔ جرمنی نے صلحنامہ ورسائی کو کبھی بھی قطعی تسلیم نہیں کیا تھا۔ فاتحوں نے فتح کے خمار میں مفتوح پر ایسے شرائط عائد کئے تھے کہ کوئی خوددار قوم انھیں ہمیشہ کے لئے تسلیم نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ صلحنامے پر دستخط ہونے کے وقت سے جرمنی میں اس کے خلاف پیہم احتجاج ہوتا رہا۔ اس سے جرمنی کے مشہور مدبر اشتریزیمان نے بہت کام بھی نکالا اور اپنی قوم کے لئے طرح طرح کی رعائتیں حاصل کیں مگر مفتوح قوم ہونے کا احساس، عدم مساوات کا برتاؤ، جرمنی پر جنگ کی ذمہ داری کا عاید کرنا یہ باتیں ایسی تھیں کہ ان کی تلخی اشتریزیمان کی سیاسی کامیابیوں سے مٹ نہ سکتی تھی۔ ہٹلر نے وعدہ کیا کہ وہ جرمنی کے دامن سے یہ داغ دھو دے گا۔ جو لوگ برسر اقتدار تھے وہ قومیت کے اس چڑھتے ہوئے طوفان سے ڈرا ڈرا کر دوسری دول سے جرمنی کے لئے رعائتیں حاصل کرتے تھے۔ رعائتیں مل جاتیں تو ہٹلر کی جماعت اسے اپنی ہی کامیابی سمجھتی، رعائتیں نہ ملتیں تو دوسری جماعتیں مطعون ہوتیں اور ہٹلر کو تقویت ہوتی۔ غرض پچھلے چند سال کے ہر اہم واقعے نے اس قومی اشتراکی جماعت کو قوت پہنچائی اور یہ بالآخر برسر اقتدار آگئی۔ اسے حکومت نہ ملتی تو خالص کمونسٹ جماعت فروغ پاتی اور

دونوں صورتیں امن عالم کے لئے یکساں مضر تھیں۔

ہٹلر کے پروگرام میں کئی مطالبات ہیں جن سے امن عالم بڑے خطرے میں ہے۔ ایک تو وہ جنگ عظیم کے صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے۔ دوسرے جرمن نوآبادیوں کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ آسٹریا اور جرمنی کے اتحاد کا حامی ہے۔ تاوان جنگ کے مسئلے کو یکسر ختم کرنا چاہتا ہے اور پولینڈ کو جرمنی کا جو حصہ ملک کے بیچ میں سے دے دیا گیا ہے اس کی واپسی کا طالب ہے۔

ان مطالبوں میں سے بعض تو ضرور پورے ہو جائیں گے۔ صلحناموں میں تو ایک ایک کرکے بے شمار تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ جنگ کی ذمہ داری والی دفعہ کے بدلنے میں ذرا دشواری ضرور ہوگی لیکن مادی خطرات کے مقابلے میں کوئی ملک بھی اس اخلاقی معاملے پر کیوں مصر ہوگا! تاوان جنگ کا مسئلہ عملاً ختم ہو ہی چکا۔ البتہ اسٹریا اور جرمنی کا اتحاد اور پولینڈ سے اپنے ملک کی واپسی ایسے مسائل ہیں کہ ان سے بین الاقوامی سیاست میں سخت پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

آسٹریا سے جرمنی کے اتحاد کو فرانس پسند نہیں کرتا اور ۱۹۱۹ء سے برابر اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ فرانس نے کبھی نہیں سوچا کہ اگر اسٹریا جرمنی کے ساتھ مل جاتا تو شاید ہٹلر کی حکومت کی نوبت نہ آتی اور اسٹریا کی جمہوری سیاسی جماعتوں سے جرمنی کی معتدل جماعتوں کو بہت سہارا ملتا۔ فرانس نے ہمیشہ یہ سوچا کہ اگر یہ اتحاد ہو گیا تو جرمنی کو اس سے زیادہ رقبہ مل جائے گا جتنا جنگ میں اس سے چھنا تھا۔ اور ساڑھے چار کروڑ فرانسیسیوں کے مقابلے میں کوئی سات کروڑ جرمن ہو جائیں گے! چنانچہ علاوہ صلحنامہ ورسائی کے ان دفعات کے جن میں یہ اتحاد جمعیۃ اقوام کی متفقہ رائے کے بغیر ممنوع ہے اسٹریا سے کئی بار عہد لیا گیا ہے کہ وہ اس اتحاد میں شریک نہ ہوگا اور اسی اتحاد کو روکنے کے لئے فرانس اور چکوسلوواکیا میں بھی باہم معاہدہ ہو چکا ہے۔

دوسری گتھی پولینڈ کی ہے۔ جرمن قوم پرستوں کا خیال ہے کہ ان کے ملک کا جو حصہ خواہ مخواہ پولینڈ کو دیا گیا ہے اس کی واپسی کی خاطر انھیں جنگ تک کرنی چاہئے۔ پولینڈ والے کہتے ہیں کہ یہ علاقہ حقیقتاً پولش ہے اور جب فریڈرک اعظم نے اسے جرمنی میں شامل کیا تو یہ صدیوں تک پولینڈ کے ہاتھ میں رہ چکا تھا۔ اس کی آبادی میں ۰۰ فی صدی سے اوپر پول بستے ہیں اور پولینڈ کے لئے سمندر تک پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ پولینڈ کی حکومت نے اس علاقے سے بہتیرے جرمن زمینداروں کو نکال بھی دیا ہے اور قدم قدم پر جرمنوں کے لئے جو رکاوٹیں ہیں انھوں نے جرمنی میں جذبات کو اور بھی مشتعل کر رکھا ہے۔ ادھر ڈانزک

کا بندرگاہ جسے جرمنی سے الگ کرکے ایک خود مختار بلدیہ بنا دیا گیا ہے بالکل جرمن ہے اور ہرچند علیحدگی سے اس کی تجارت کو بہت ترقی ہوئی ہے مگر یہ جرمنی ہی میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ ان وجوہ سے بعض لوگ تو یہاں تک پیش گوئی کر چکے ہیں کہ یورپ کی آیندہ جنگ اسی علاقے میں شروع ہوگی۔

اٹلی | جدید اٹلی کی سیاسی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اس میں دو مختلف رجحانات نمایاں معلوم ہوں گے بری رجحان اور بحری رجحان۔ کبھی اٹلی براعظم یورپ کی طرف رخ کرتا ہے اور اپنے مستقبل کو خشکی پر استوار کرنا چاہتا ہے اور کبھی بحر روم میں تفوق حاصل کرکے بحری عظمت حاصل کرنے کا خیال اسے آتا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اگر سیاست کی باگ کسی شمالی مدبّر کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو بری رجحان غالب ہوتا ہے اور کسی جنوبی کے ہاتھ میں ہو تو

بحری رجحان۔ کرسپی جنوبی تھا اسی لئے اٹلی نے جرمنی اور آسٹریا سے معاہدہ کرکے اتحاد ثلاثہ کی بنیاد رکھی تھی اور براعظم کی طرف سے یوں یکسو ہوکر بحر روم میں اپنا اثر بڑھایا تھا اور آسٹریا کے علاقوں پر دعویٰ چھوڑ کر اپنی افریقی نوآبادیاں حاصل کی تھیں لیکن ۱۹۱۵ء میں جب اٹلی اپنے ساتھیوں کو دغا دے کر فرانس اور انگلستان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا تو اس وقت بری رجحان ہی نے ہوا کا رخ پلٹا تھا اور ساحل ایڈریاٹک پر تسلط کی خواہش نے اٹلی کی سیاست کو بالکل بدل دیا تھا اور اس صورت حال کے پیدا کرنے میں مسولینی کا بڑا حصہ تھا جو شمالی ہے! اٹلی کو ٹریسٹ، پولا اور فیوم کے بندرگاہ مل گئے اور اس کی سرحد بھی اتنی آگے بڑھ گئی کہ کوئی دس لاکھ سلافی اور کوئی ۳ لاکھ جرمن بھی اٹلی کی رعایا بن گئے!

یہ بڑی کامیابی تو ہو ہی چکی پھر جب مسولینی برسراقتدار آیا تو اس نے چاہا کہ اس کامیابی کو تو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ہو سکے تو بحری کامیابی کی طرح ڈالے۔ چنانچہ جس شخص نے دو سال پہلے ایک وزارت کو اسی وجہ سے شکست دی تھی کہ وہ یوگوسلاویا سے معاملات صاف کرکے خشکی کی طرف سے یکسوئی چاہتی تھی، اسی نے یوگوسلاویا کے ساتھ معاہدے کی تصدیق کی اور ادھر سے توجہ ہٹا کر بحر روم کی سیاست کو مرکز توجہ بنایا۔ لیکن یوگوسلاویا نے ایسا نہ ہونے دیا اور فرانس سے معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ اٹلی اب مجبور ہے کہ براعظم کے معاملات میں دخل دے اور مختلف دول سے تعلقات پیدا کرکے پھر ایک توازن قوائے یورپ میں قائم کرے اور جس فرانس کی خاطر اٹلی نے اپنے پرانے ساتھیوں کو چھوڑا تھا اسی کے خلاف پھر ساز باز کرے۔ چنانچہ آج اٹلی بھی مختلف صلحناموں اور معاہدوں میں ترمیم کا اتنا ہی حامی ہے جتنا کہ قوم پرست جرمنی اس لئے کہ اٹلی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ایک طرف فرانس ہو اور دوسری طرف فرانس کا دوست یوگوسلاویا اور براعظم میں اٹلی کا کوئی یار و مددگار نہ ہو! گویا یورپی سیاست میں ایک فریق تو وہ ہے جو صلحناموں میں بنیادی تغیر چاہتا ہے اور اس کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس میں اہم ملک جرمنی اور اٹلی ہیں اور ان کا ساتھ غالباً آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، یونان، البانیا اور ترکی دیں گے۔

فرانس | دوسرا گروہ وہ ہے جو جنگ کے بعد کی حالت کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ اس کا سرگروہ فرانس ہے اور اراکین پولینڈ، چکوسلوواکیا، رومانیا، یوگوسلاویا اور بیلجیم۔ ان سب کے پاس کوئی ۱۷ لاکھ فوج تو مسلح تیار ہے اور کوئی سوا کروڑ تربیت یافتہ محفوظ فوج ہے! یہ سب صلحناموں کو مقدس منوانا چاہتے ہیں اور ان کو برقرار رکھنے کے لئے میدان جنگ میں اترنے کو تیار ہیں لیکن باوجود اس فوجی قوت کے

پہلے نے مضبوط نہیں ہیں جتنا لوگ خیال کرتے ہیں۔ پولینڈ کو روس اور یوکرینیا کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہے۔ چکوسلوویکیا تیرے ملک کے دو طرف جرمنی علاقہ ہے اور یوگوسلاویا پر روپیہ اور فوجی سلموں کی وجہ سے فرانس کا سب سے زیادہ اثر ہے لیکن اس میں اندرونی مناقشات بے شمار ہیں اور اس کے چاروں طرف اٹلی کے ساتھی ہنگری، بلغاریہ، البانیہ اور یونان ہیں۔ فرانسیسی نظام کی یہ کمزوریاں بس اس طرح پوری ہو سکتی ہیں کہ فرانس کو بحر روم میں تفوق حاصل ہو لیکن وہاں اٹلی رقیب موجود ہے!
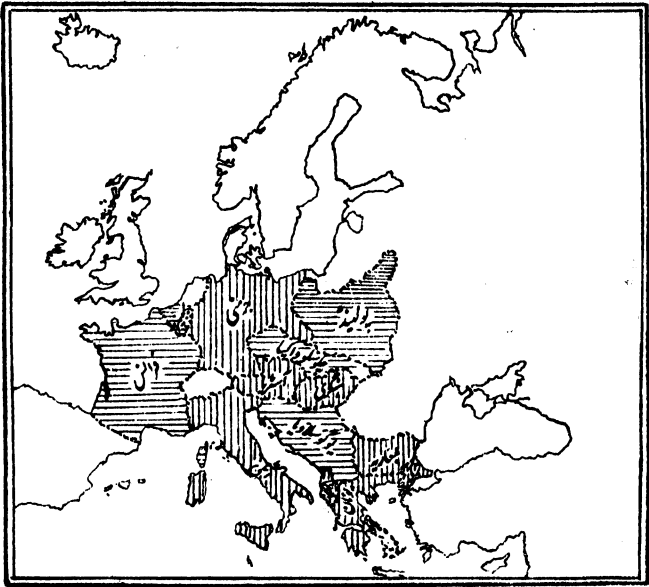
برطانیہ یورپ اس طرح دو متخاصم گروہوں میں بٹ گیا ہے۔ ان گروہوں میں برطانیہ کا نام کہیں نہیں آیا۔ اس لئے کہ برطانیہ کے شاطران سیاست ابھی دونوں سے الگ ہیں اور دونوں کے ساتھ۔ اگر جرمنی ذرا زور باندھتا ہے تو یہ اسے ڈانٹ دیتے ہیں کہ خبردار حد جائز سے آگے نہ بڑھو، اور فرانس کو خیال ہوتا ہے کہ ہمارے 'تحفظ' کی جو ذمہ داری انھوں نے اپنے سر لی ہے وہ کچھ تو پوری کر رہے ہیں۔ پھر یہ فرانس سے کہتے

ہیں کہ جرمنی کا یہ مطالبہ مانو ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی اور جرمنی سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ یہ خود بظاہر جھگڑے سے الگ رہنا چاہتے ہیں اور دونوں کو سمجھاتے ہیں کہ لڑنا جھگڑنا بری بات ہے، اسلحہ کم کرو اور امن سے رہو۔ لیکن یہ صورت زیادہ دن چل نہیں سکتی۔ یہ فرانس سے بگاڑنا نہیں چاہتے کیونکہ فرانس کی دوستی انگلستان کے لئے سب سے قیمتی دوستی ہے۔ ایک انگریز مدبر کا قول ہے "فرانس ہمارے ساتھ ہو تو پھر کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔ فرانس کہتا ہے کہ اگر تمہارے کہنے سے ہم نے اسلحہ کم کر دئے تو اٹلی اور جرمنی دو دن میں صلحناموں کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ لہذا برطانیہ اگر یہ کر سکے کہ پرامن طریق پر صلحناموں میں ایسی ضروری ترمیمیں کرا دے جس سے جرمنی اور اٹلی اور ان کے ساتھی کم و بیش مطمئن ہو جائیں اور پھر فرانس کو یقین دلا سکے کہ مزید ترمیم کی کوشش کی گئی تو برطانیہ اپنے روپے اور فوج سے اس کی پوری مخالفت کرے گا تو شاید ان مسلح ٹولیوں میں تصادم ملتوی ہو جائے ورنہ سب سامان تیار ہے ایک چنگاری کی دیر ہے اور کوئی غیر متوقع واقعہ بھی چنگاری بن سکتا ہے!

جرمنی میں یہودی | ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت کے برسر اقتدار آتے ہی یہودیوں کے ساتھ بدسلوکیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو ابھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی میں بحیثیت جماعت کے یہودیوں کا وجود مشکل ہی سے قائم رہ سکے گا۔ ہسپتالوں سے یہودی ڈاکٹر برخاست کر دئے گئے ہیں عدالتوں سے یہودی اہلکار علیحدہ کئے جا رہے ہیں۔ یہودی طالب علموں پر مدرسوں اور جامعات کے دروازے بند ہوتے جاتے ہیں۔ یہودی دوکانوں سے لوگ مال نہیں خریدتے۔ یہودی مصنفوں کی کتابیں کتب خانوں سے نکال کر چوراہوں پر جلائی جا رہی ہیں۔ غرض یہودیوں کے لئے اس متمدن ملک میں زمین تنگ ہے۔

یہودیوں کے خلاف جرمنی میں اور تقریباً تمام مسیحی ممالک میں ایک تعصب تو ہمیشہ سے موجود ہے۔ اس کی تاریخی اصل بلاشبہ مذہبی ہے لیکن اس کی موجودہ وجہ زیادہ تر معاشی ہے۔ یہودیوں کی سیاسی بے سروسامانی، ان کا اپنا وطن نہ ہونا، ان کی اپنی ریاست نہ ہونا یعنی سب وہ چیزیں جن کی وجہ سے ان پر آج یہ ظلم ممکن ہے اور ہمیشہ مسیحی دنیا میں ممکن رہا ہے یہی مغضوبیت جس کی وجہ سے وہ خدا کی وسیع زمین میں ہر جگہ پردیسی کی طرح رہتا ہے اسی میں اس کی معاشی ترقی کا راز بھی پنہاں ہے۔ معاشی فروغ کے لئے پردیسی ہونے سے بڑی مدد ملتی ہے اور دنیا کی معاشی تاریخ میں ہر جگہ پردیسیوں کا بڑا حصہ ہے۔ پردیسی کے سر پر روایات ملکی کا بار

نہیں ہوتا، مروت کی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں، ہم چشموں کا خیال اسے کسی چیز سے نہیں روکتا۔ وہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے اور دولت کمانے کے لئے کوئی راہ اچھی ہو یا بری، اس پر بند نہیں ہوتی۔ ایک ملک سے دوسرے کو جاتے ہیں، ایک پیشہ بدل کر دوسرا اختیار کرتے ہیں، نفع اگر ایسے کاروبار میں حاصل ہو جو مفاد عام کے خلاف ہے تو بھی اس سے نفع اٹھانے میں پردیسی کو تامل نہیں ہوتا۔ چنانچہ معاشی زندگی میں خالص نفع طلبی کی ذہنیت کو جو عہد جدید کے نظام سرمایہ داری کی مخصوص ذہنیت ہے پردیسیوں نے اور خصوصاً یہودیوں نے بہت مدد دی ہے۔ یہی بین الاقوامی تجارتی تعلقات قائم کرنے میں سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ سامانِ تعیش، جواہر اور ریشم کی تجارت سے انھوں نے مغربی طرزِ معاشرت پر خاصا اثر ڈالا ہے۔ دوسری طرف تنباکو، شراب، غلہ، اون اور شکر کی تجارت پر یعنی ان چیزوں کی تجارت پر بھی ان کا قبضہ رہا ہے جو بڑے پیمانے پر پیدا کی جاسکتی ہیں اور عام استعمال میں آتی ہیں۔ سوتی کپڑے، نیل اور روئی کی تجارت سے انھوں نے اکثر مغربی ممالک میں روایتی معیشت کو درہم برہم کردیا ہے۔ جہاں کہیں تو آبادیاں بسیں وہاں یہ پہنچے ہیں نئی دنیا میں سب سے پہلے تاجر یہی یہودی تھے۔ امریکہ کے سب سے پہلے صنعتی کارخانے یہودیوں نے قائم کئے غرض سرمایہ داری کے نظام معاشی کے نشو و نما میں یہودیوں نے اپنی تعداد سے کہیں زیادہ حصہ لیا۔

جرمنی میں یہودیوں کی کل تعداد ۶ لاکھ کے قریب ہے یعنی آبادی میں ایک فی صدی لیکن بڑے صنعتی کارخانوں کے نگرانوں اور منصرموں میں یہ کوئی ۱۴ فی صدی ہیں۔ بجلی کے بڑے کارخانوں کے مالکوں اور نگرانوں میں یہودی ۲۳ فی صدی سے اوپر ہیں، دھاتوں کے کارخانوں میں ۲۵ فی صدی، چمڑے اور ربر کے کاروبار میں ۳۱ فی صدی، بنک تو اکثر و بیشتر ان کے ہاتھ میں ہیں۔ صرافی کی بڑی بڑی دوکانیں تقریباً سب کی سب یہودیوں کی ہیں۔

یہ باتیں معمولی جرمن کو بہت کھلتی ہیں اور مذہبی اور نسلی تعصبات کے ساتھ یہ معاشی محرکات مل کر انھیں بہت قوی کردیتے ہیں۔ ہٹلر کی جماعت نے اس نفرت کو بہت کچھ اکسایا ہے اور پھر جرمن قوم کی ہر مصیبت کا ذمہ دار یہودیوں ہی کو ٹھہرایا ہے۔ سالہا سال سے نفرت کی اس آگ کو بھڑکایا جا رہا تھا، اب اس کے شعلے قابو سے باہر ہوگئے ہیں۔ غالباً اکثر یہودیوں کو جرمنی سے رفتہ رفتہ ہجرت کرنی ہوگی اور خیال ہے جس ملک کی طرف یہ رخ کریں گے وہاں کی معاشی زندگی میں سرمایہ داری نظام کو غیر معمولی تقویت پہنچے گی۔ لیکن اس خانماں بردوش قوم کے ساتھ "بیسویں صدی" کی مہذب دنیا کا یہ سلوک انسانیت کے لئے درس عبرت کا کام دے گا!

ممالک اسلام

عرب سعودی | ابھی یہ حقیقت غالباً عام طور پر لوگوں کو نہیں معلوم ہے کہ ملک ابن سعود نے اپنے مقبوضات کا سرکاری نام اب بجائے نجد و حجاز کے "عرب سعودی" رکھ دیا ہے۔ یہ تبدیلی تو خیر لفظی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آج کل وہاں چند بہت اہم واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ مسٹر جان فلبی جو ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ملک ابن سعود کے ذاتی دوست ہیں اس سال ایام حج میں مکہ پہنچے ہیں۔ وہاں کے حالات پر انھوں نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے جو لندن ٹائمز اور اسٹیٹسمین میں شائع ہوا ہے۔ اس کا اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں:۔

"عرب کی معاشی حالت کا دارومدار اب تک حاجیوں کی تعداد پر رہا ہے۔ وہابی حکومت کے پہلے تین سال میں تو حالت اچھی رہی لیکن اس کے بعد عام کساد بازاری کی وجہ سے حاجیوں کی تعداد کم ہونے لگی۔ حکومت کے پاس پس انداز کچھ نہیں تھا اس لئے حالت دن بدن خراب ہی ہوتی گئی ۱۹۳۱ء سے دشواریوں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ پہلے حاجیوں کی تعداد اوسطاً ایک لاکھ ہوتی تھی لیکن ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد چالیس ہزار کے قریب رہ گئی اور دوسرے سال اس میں بھی کمی ہوئی۔ ۱۹۳۱ء کے موسم حج میں ایک اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ صرافوں نے مل کر کچھ ایسی ترکیب کی کہ عربی فلس کی قیمت کم ہونے لگی۔ سرکاری طور پر ایک نقرئی ریال کے بدلے میں ۲۲ فلوس ملتے تھے لیکن اس دن ۶۰ تک نوبت پہنچ گئی۔ حکومت چاہتی تو سٹے بازی کو روک سکتی تھی مگر اس کے مشیر اچھے نہ تھے۔ روکنا تو درکنار اس نے خود اس حالت سے فائدہ اٹھانا شروع کیا۔ ایک شاہی فرمان کے ذریعے سے ریال کی قیمت ۴۴ فلوس مقرر کر دی گئی اور حکومت کے نمایندوں نے چاندی کے بدلے فلوس خریدنے شروع کئے۔ تعداد تو ۴۴ مقرر تھی مگر انھیں بعض اوقات ایک ریال کے بدلے ۶۰ فلوس تک ملے۔ ایک دن تو یہ کیفیت رہی اور دوسرے دن حکومت نے یہ ستم ظریفی کی کہ ریال کی قیمت پھر ۲۲ فلوس کر دی۔ اس طرح حکومت اور صرافوں کو تو بہت فائدہ ہوا لیکن بیچارے غریب لوگ مارے گئے۔ یہی نہیں بلکہ عربی سکوں سے لوگوں کو ایک قسم کی بدگمانی بھی پیدا ہو گئی۔ بنکوں نے مقامی سکوں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ریال کی قیمت کم ہوتے ہوتے اتنی رہ گئی جتنی اس میں چاندی تھی۔ پہلے ایک طلائی پاؤنڈ کے عوض صرف ۱۰ ریال ملتے تھے لیکن آج کل ہر جگہ آسانی سے ۲۰ ریال مل سکتے ہیں۔ اس طرح جن لوگوں کے

پاس صرف چاندی کے سکے تھے ان کے لئے اشیا کی قیمت گویا دوگنی ہو گئی۔

حاجیوں کی تعداد کم ہو جانے کی وجہ سے حکومت کی آمدنی بھی کم ہو گئی اور بڑی دقت پیش آئی۔ اس وقت حکومت کے ذمے تمام قرضہ ۳ لاکھ طلائی پاؤنڈ تو تھا ہی اس پر طرہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہیں باقی رہنے لگیں۔ نومبر ۱۹۳۱ء میں جو حساب لگایا گیا تو پورے چھ مہینے کی تنخواہیں باقی تھیں۔ اب حکومت کو بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ قرضے کی ادائگی کے التوا کا اعلان کرتی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن نہ تو دنیا کی عام کساد بازاری کم ہوئی اور نہ حاجیوں کی تعداد بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ اس وجہ سے التوا کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی حکومت نہ تو قرضے کی قسط ادا کر سکی اور نہ ملازموں کی تنخواہیں۔ یہ بات واقعی قابل قدر ہے کہ سرکاری ملازموں نے کوئی غیر معمولی صورت ناجایز آمدنی کی نہیں نکالی۔

اب حکومت کے لئے صرف دو صورتیں ممکن تھیں۔ یا تو وہ اتنا ہی پاؤں پھیلاتی جتنی چادر تھی یا چادر کو بڑھانے کی کوشش کرتی۔ دوسری صورت زیادہ دلکش تھی اور نئے وسائل کی تلاش بھی اتنا مشکل کام نہیں تھا جتنا کہ سمجھ لیا گیا تھا۔ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ عرب کی معاشی حالت صرف حاجیوں پر ہی منحصر ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ دوسرے وسائل بھی موجود ہیں مگر اب تک عرب ان کی طرف محض اس لئے توجہ نہیں کرتے تھے کہ ان کے خیال میں ان وسائل سے صرف غیر ملکی کفار ہی کام لے سکتے تھے اور ان کی ہوس ملک گیری اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کا داخلہ عرب میں بہر صورت خطرناک ثابت ہوتا۔ اب سخت احتیاج نے اس راسخ عقیدے پر نظر ثانی کرائی اور اس راہ میں پہلا قدم خود ملک عبدالعزیز بن سعود نے اٹھایا۔

تقریباً دو سال سے بعض خیالات گدگدی پیدا کر رہے تھے اور حکومت آہستہ آہستہ اس راستے پر چل رہی تھی جو اب تک ممنوع تھا۔ "رعایات" کو لوگ اب تک "غیر ملکی تجارتی اقتدار" کا مرادف سمجھتے رہے ہیں اور اس لئے انھیں ملکی آزادی کا منافی سمجھا گیا ہے۔ جدید طرز عمل سے ان خیالات کی تردید شروع ہو گئی ہے اور اس وقت جبکہ تباہی قریب تھی حکومت نے ایسی نئی تجویزیں پیش کی ہیں جن کی کامیابی تو ابھی بالکل یقینی نہیں ہے لیکن ان سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب نامساعد حالات سے مغلوب ہونے والے نہیں ہیں اور ابھی ان میں زندگی موجود ہے۔ انھوں نے اپنے وسائل کو بڑھانے کا ارادہ کر لیا ہے اس لئے کہ یہی ایک صورت ان کے زندہ رہنے کی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا "رعایات" صرف مسلمانوں کو دی جائیں گی لیکن جب غیروں کا داخلہ حکومت کے لئے مفید ہوگا تو انھیں بھی ایسے شرائط پر داخل کیا جائے گا جن سے عربی

آزادی میں خلل نہ پڑے۔

اس طرح عرب میں ایک نیا باب کھل رہا ہے اور اس کی ابتدا مناسب طور پر ذرائع آمد و رفت کی ترقی سے ہوتی ہے۔ جدے اور مکے کے درمیان ریل جاری کرنے کا خیال نیا نہیں ہے۔ اس صدی کے شروع میں سلطان عبدالحمید نے قسطنطنیہ کو مرکز اسلام سے ریل کے ذریعے منسلک کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ۱۹۱۴ء میں ریل مدینے تک پہنچ گئی تھی مگر مقامی عربوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اب آخر کار اگر کوئی حادثہ نہ پیش آگیا تو ۱۹۳۵ء کے وسط تک جدے سے مکے تک ریل جاری ہو جائیگی۔ پہلا قدم اٹھ چکا ہے۔ "رعایات" ہندی مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس شرط پر عطا ہوئی ہیں کہ پچاس برس کے بعد ریل اور اس کے تمام متعلقات حکومت کی ملک ہو جائیں گے۔ چھ مہینے میں مستقل تعمیرات تکمیل پر پہنچ جائیں گے اور اس طرح بہت سے بے کاروں اور بھوکوں کے لئے کام مہیا ہو جائے گا۔

حکومت کی معاشی دشواریوں کا صرف ایک حل ہو سکتا ہے اور وہ ایک سرکاری بنک کا وجود ہے۔ شریف حسین بھی عرصے تک اس خیال میں رہے۔ بہت سے امیدوار اٹھے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اب آخر کار سابق خدیو مصر عباس حلمی کی تجویز منظور ہوئی۔ سرکاری بنک کے قیام کے لئے ایک معاہدہ مرتب ہو گیا ہے اور اس پر سرکاری مہر بھی ثبت ہو چکی ہے۔ شرائط بھی ایسے ہیں کہ حکومت اور ملک کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اب یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جلد حکومت کا قرضہ ادا ہو سکے گا۔ محاصل درآمد وغیرہ بھی بار کفالت سے آزاد ہو جائیں گے۔ سابق خدیو نے اس تجویز کو اٹھا کر 'مرکز اسلام' کی جو خدمت کی ہے اس پر وہ تمام عالم اسلامی کے شکریے کے مستحق ہیں۔"

سرکاری بنک کی کیا نوعیت ہوگی اور اس کے منافع کہاں سے آئیں گے، اس میں سود لیا اور دیا جائے گا یا نہیں اور ان کا سرمایہ کن پیدا آور کاموں میں لگایا جائے گا یہ سب تفصیلات اس مضمون سے نہیں معلوم ہوتیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہو گا۔

دوسرے ذرائع سے یہ خبر معلوم ہوئی ہے کہ ریل کے ٹھیکے پر تقریباً ½ لاکھ روپیہ سلطان ابن سعود کی حکومت کو پیشگی منافع کی صورت میں ملے گا اور سرکاری بنک کے لئے سابق خدیو عباس حلمی نے ۳۵ لاکھ ڈالر (تقریباً سوا کروڑ روپیہ) کے سرمایے کی ضمانت کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرمایہ اور کہاں سے آتا ہے اور اس نظام سرمایہ داری کا اثر عربوں پر کیا پڑتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غریب عرب

نہ تو اس نظام کی پیچیدگیوں سے واقف ہے اور نہ اسے اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔ اب رہی حکومت سو اس کو تو نفع ضرور ہوگا مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ایک دفعہ اس چکر میں پڑ کر وہ غریبوں کے مفاد کا بھی خیال رکھے گی۔ قعر دریا میں تختہ بندی کے بعد دامن کا تر نہ ہونا آسان نہیں ہے۔

شذرات

علوم اسلامیہ سے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہیں وہ عرصے سے اپنی اپنی جگہ پر ایک ایسے مرکزی ادارے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان علوم کی چھان بین کرنے والوں میں اتحادِ عمل پیدا کر سکے۔ بیشتر حضرات تو اس خیال کو اپنے سینے میں چھپائے ہی رہے مگر لاہور کے اہلِ علم نے خیال پیدا ہوتے ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں چند حضرات نے جمع ہو کر ایک ' ادارۂ معارف اسلامیہ' کی بنیاد رکھی۔ یہ کام تو آسان تھا مگر مسلمانوں میں ایسے ادارے کی ضرورت کا احساس پیدا کرنا اتنا ہی مشکل ثابت ہوا اور چار برس کے بعد گذشتہ اپریل میں اس کی نوبت آئی کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا اجلاس منعقد ہو سکے۔

... ...

اس ادارے کے مقاصد یہ ہیں :-

(۱) ہندوستان کے تمام محققین اسلامیہ کے درمیان اشتراکِ عمل، اتحادِ ذہنی و اجتماعی اور وسائل امدادِ باہمی کے قیام میں سہولتیں بہم پہنچانا۔

(۲) محققین کی ایسی مشکلات کو جو بسا اوقات ان کے مشاغل علمیہ میں پیش آتی ہیں، حتی الامکان رفع کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) محققین کو نتائجِ تحقیقات علمیہ کی اشاعت کی غرض سے جمع کرنا۔

(۴) بیرونی ممالک کے مستشرقین کو وقتاً فوقتاً افادۂ علمیہ کی غرض سے دعوت دینا۔

(۵) ارتقائے تمدن اسلامی کے سلسلے میں اسلام کی مختلف خدمات کو منظرِ عام پر لانا۔

(۶) عام طور پر اسلامی تحقیقات کے لئے قوم میں تحریص و تشویق کی تحریک جاری رکھنا۔

(۷) آمدنی کافی ہونے پر ایک دار الکتب، ایک دار الاشاعت اور ایک مشرقیات کا دار النفائس (میوزیم) کھولنا۔

... ...

ان مقاصد کے اہم اور مفید ہونے میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ اب تک تو ان سے بحث محض ایک

علمی بحث ہوتی مگر اب کہ اس ادارے نے پہلا اجلاس کر کے ایک عملی قدم بھی اٹھا دیا ہے ان مقاصد کی اشاعت اور حتی المقدور ان کے حصول کی کوشش نہ کرنا کسی طرح جائز نہیں ہے۔ "امم سابقہ کے عروج و زوال اور ترقی و تنزل کے افسانے آنے والی نسلوں کے لئے ہمیشہ سبق آموز ہوتے ہیں ..... ان سے بڑھ کر کسی قوم کے لئے کوئی درس ترقی نہیں ہو سکتا؟ جب یہ ہے تو پھر ایک قوم کے لئے خود اپنے ماضی کی روایات کی تحقیق اور ان کے برقرار رکھنے کی سعی کتنی اہم ہو سکتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی کوشش تحصیل حاصل ہوگی۔

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کا پہلا جلسہ ۱۵ اپریل ۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوا۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور علامہ سر محمد اقبال نے باقاعدہ افتتاح فرمایا۔ اس موقع پر جناب موصوف نے جو تقریر فرمائی اس میں اس ادارے کے اغراض و مقاصد اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور تمدن عالم میں اسلامی تمدن کی حیثیت اجمالاً بیان فرمائی۔

ادارے کا یہ اجلاس دو دن تک جاری رہا اور کئی مضامین پڑھے گئے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے پورے مضامین نہیں پڑھے جا سکے اور چونکہ بیشتر حضرات نے اپنے مضمون کا کوئی خلاصہ تیار نہیں کیا تھا اس لئے سننے والوں کو کچھ بہت زیادہ فائدہ ان کی تحقیقات علمیہ سے نہیں پہنچا۔ امید ہے کہ آئندہ اجلاس میں نہ صرف حضرات منتظمین بلکہ اصحاب مضامین بھی اس نقص کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ ایسے علمی جلسوں میں جہاں ہر شخص کا مضمون ایک مختلف شعبے سے متعلق ہوتا ہے عام افادے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر صاحب مضمون اپنے مضمون کا ایک خلاصہ قبل از وقت تیار کر کے بھیج دے اور وہ خلاصہ اجلاس میں شریک ہونے والوں کو پہلے سے دے دیا جائے تاکہ اگر انھیں کچھ بحث کرنا ہو تو وہ اس کے لئے تیار ہو کر آئیں ورنہ ان مضامین کو سنانے اور سننے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ہر علمی مضمون پڑھ کر سنانے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ مضمون تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہو لیکن سنانے سے وہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے اور سننے والوں کو کوفت ہو۔ ایسے مضامین کے خلاصے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

... ...

ایک اور اہم نقص اس اجلاس کی کارروائی میں یہ تھا کہ صدر مجلس استقبالیہ کا خطبہ افتتاحی تقریر اور اکثر مضامین کی زبان انگریزی تھی۔ ان حضرات میں سے ہر ایک کی مادری زبان اردو ہے اور اگر یہ چاہتے

تو اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح اور بعض صورتوں میں تو یقیناً انگریزی سے بہتر طور پر اردو میں ادا کر سکتے تھے، لیکن ہماری ذہنی غلامی کی یہ ایک نہایت افسوس ناک مثال ہے کہ ہم جب اپنے علوم و معارف کی ترویج کے لئے بھی اٹھتے ہیں تو ایک غیر زبان سے کام لیتے ہیں۔ اگر اس اجلاس میں علوم جدیدہ یا سائنس کے مسائل پر بحث کی گئی ہوتی تو ہم یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتے کہ ابھی "ظرف تنگنائے" اردو "بقدر شوق" نہیں ہے اور اہل علم حضرات کے بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہئے لیکن اس ادارے کا نام تھا "ادارۂ معارف اسلامیہ" اور جن مسائل سے بحث کی گئی وہ تھے اسلامی تاریخ اور اسلامی آداب سے متعلق۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو ہم دوسروں کے مقابلے میں اردو کی حمایت میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف خود اس زبان سے ایسی لاپروائی برتتے ہیں تو شیخ سعدی کا یہ قول یاد آتا ہے:-

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　سعدی از دست خویشتن فریاد

... ...

ادارۂ معارف اسلامیہ کے اس پہلے اجلاس میں بجز ان دو نقائص کے اور سب محاسن ہی تھے۔ حسن انتظام، مہماں نوازی اور خوش اخلاقی ہر طرف نمایاں تھی۔ جلسے وقت پر ہوئے اور کامیاب رہے۔ سب سے زیادہ جو چیز پسند کی گئی وہ مخطوطات اور تصاویر کی نمایش تھی۔ اس نمایش کا انتظام بہت اچھا تھا اور چیزیں بہت سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ ان میں بعض قدیم مخطوطات کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی صاحب نے سکوں کا جو مجموعہ پیش کیا تھا وہ واقعی قابل دید تھا۔ ایسے اہم اور مختلف النوع سکے اتنی تعداد میں کسی عجائب خانے میں بھی مشکل سے ملیں گے چہ جائیکہ کسی ایک شخص کے ذاتی مجموعے میں۔ نمائش میں جو چیزیں رکھی گئی تھیں ان کی فہرست بھی اجلاس کی روداد کے ساتھ شائع ہونے والی ہے اس لئے ہم اس وقت تفصیلات سے احتراز کرتے ہیں۔ امید ہے کہ اس ادارے کا دوسرا اجلاس جہاں بھی ہوگا حضرات منتظمین اس قسم کی ایک نمائش کا بھی ضرور انتظام فرمائیں گے۔

... ...

ہمیں امید ہے کہ ادارۂ معارف اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کے اراکین جن میں علامہ سر محمد اقبال اور سر شیخ عبدالقادر بھی شامل ہیں اس ابتدا کے بعد خاموش نہ بیٹھیں گے بلکہ اس کے اغراض و مقاصد

کی ترویج جاری رکھیں گے اور اس کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ادارے کے لئے ایک کتبخانے کا وجود ناگزیر ہے اور علوم اسلامیہ کا ایک ایسا کتب خانہ ہندوستان میں کہیں بھی نہیں ہے جس سے کام کرنے والوں کو ضروری کتابیں مل سکیں۔ ایسی حالت میں اس باب میں اور زیادہ جلدی کی ضرورت ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر علامہ اقبال محمد علی دمشق، گب میموریل، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، مجلس السانی مشرقی (D. M. G.) اور اسی قسم کے دوسرے ہندوستانی اور بیرونی اداروں سے درخواست فرمائیں تو وہ ضرور اپنی مطبوعات ادارے کے کتب خانے کے لئے بلا قیمت عطا کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ حکومت مصر سے یہ درخواست کرنی چاہئے کہ عربی کتابوں کی ایک معتد بہ تعداد اس کتب خانے کو عطا کرے۔

... ...

ان سب انتظامات اور خط و کتابت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی شخص مستقل طور پر اسی کام کے لئے متعین ہو۔ پنجاب یونیورسٹی کے اساتذۂ علوم مشرقیہ میں سے ہر شخص خود اپنے فرائض منصبی اور اپنے علمی مشاغل میں اس قدر مصروف رہتا ہے کہ ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ کافی وقت اس کام میں صرف کر سکیں گے زیادتی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ اراکین مجالس انتظامیہ جلد سے جلد کم از کم اتنا سرمایہ تو ضرور ہی فراہم کریں گے کہ ادارے کے لئے ایک مستقل ناظم کا تقرر ممکن ہو سکے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے اور وہ یہ کہ ادارے کے ہر عام اجلاس کے موقعے پر ایک عام کاروباری جلسہ بھی ہونا چاہئے جس میں ادارے کی ترقی کے لئے باہر کے لوگوں سے بھی مشورہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ بعض مفید مشورے مل جائیں گے بلکہ یہ بھی ہوگا کہ عام طور پر لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا اور وہ اپنی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کریں گے

... ...

اس ادارے سے متعلق ہم نے جو اپنی رائے اس تفصیل سے پیش کی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں اور اس کی ترقی کا خیال ہمیں ہر وقت رہتا ہے۔ ہم ادارۂ معارف اسلامیہ کے ارباب حل وعقد کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے کارکن اپنی استطاعت کے مطابق اسے ہر قسم کی مدد دینے کے لئے آمادہ ہیں اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ ادارہ ہندوستان میں

علوم اسلامیہ کے احیا کا ذریعہ بنے گا۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　　　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

---

۱۵ مئی سے جامعہ میں کالج کی جماعتوں میں تعطیل ہوگئی اور یکم جون سے اسکول بھی بند ہو جائے گا۔ یکم اگست کو حسب معمول کالج اور اسکول دونوں کھل جائیں گے۔

... ...

جامعہ کے بعض اساتذہ تعطیل کے زمانے میں بھی اس آرام سے محروم رہتے ہیں جس کا انھیں سال بھر کی شدید محنت کے بعد استحقاق ہو جاتا ہے اور اپنا وقت زیادہ تر ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے میں صرف کرتے ہیں تاکہ جامعہ کے مقاصد کی اشاعت کریں اور اس کے لئے مالی امداد حاصل کریں عام دستور تو یہ ہے کہ قومی تعلیم گاہوں کی سفارت کا کام ملک کے مقتدر رہنما انجام دیتے ہیں اور اساتذہ اس خدمت سے معذور رکھے جاتے ہیں لیکن جامعہ ملیہ مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے جن کے رہنما عموماً علمی کاموں سے پرہیز کرتے ہیں یا اگر ان کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں تو اسی وقت جب ان کے ذریعے سے حکام وقت کا تقرب اور اعزاز و منصب حاصل ہونے کی امید ہو۔ جامعہ ملیہ کی خدمت کرنے میں سراسر زحمت ہے اور کسی قسم کے ذاتی فائدے کی امید نہیں اس لئے اگر یہ حضرات اس سے پہلوتہی کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن چونکہ جمہور ملت جامعہ ملیہ کی ضرورت کو دل سے محسوس کرتے ہیں اس لئے ان کا دست فیض اکابر قوم کے توسط کے بغیر جامعہ کی مدد کے لئے خود بخود بڑھتا ہے۔ پھر بھی ہر کام کے لئے کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے خصوصاً چندہ جمع کرنے کا کام اس زمانے میں اس قدر دشوار ہے کہ اس کے لئے بڑے مستقل مزاج، جفاکش، مخلص لوگ درکار ہیں۔ اس لئے جامعہ کے چند اساتذہ قریب قریب ہر سال تعطیل میں بھی راحت و آرام، بال بچوں، عزیزوں دوستوں کی صحبت کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں اور جہاں تک اپنی فرصت اور محنت اور قوم کی توفیق اور ہمت کفایت کرتی ہے ایک رقم جمع کرلیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سال یہ دمن کے پکے تعطیل کے زمانے میں صوبۂ متحدہ کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ مختلف مقامات پر ہمدردان جامعہ کے حلقے قائم کریں۔

... ...

ہمدردان جامعہ کی تحریک جیسا ہم کسی پچھلے پرچے میں لکھ چکے ہیں گذشتہ سال اکتوبر سے شروع ہوئی

ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جن جن مقامات پر مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں ان لوگوں کے حلقے قائم کئے جائیں جو جامعہ ملیہ کے تعلیمی نصب العین کے حامی ہیں۔ یہ حضرات ایک چھوٹی سی ماہانہ رقم جسے وہ نہایت آسانی سے ادا کر سکتے ہوں جامعہ کی امداد کے لئے دیتے ہیں اور یوں بھی ہر طرح کی کوشش ان خدمات کی تائید میں کرتے ہیں جو جامعہ ملیہ انجام دے رہی ہے۔ اس بار وسط مئی سے آخر جولائی تک اساتذۂ جامعہ کے وفود صوبہ متحدہ وغیرہ کا دورہ کریں گے۔ اس وقت حسب ذیل پروگرام پیش نظر ہے اور حتی الامکان اس کی پابندی کی جائے گی:۔

مئی۔ آخری دو ہفتے: فرخ آباد، ایٹہ، مین پوری، بلند شہر۔

جون۔ پہلا اور دوسرا ہفتہ: سہارنپور، دہرہ دون، بجنور۔

" ۔ تیسرا ہفتہ: شملہ۔

" ۔ چوتھا ہفتہ: بارہ بنکی اور گونڈا۔

جولائی۔ اعظم گڈھ، جونپور، غازی پور، بلیا، مرزاپور، گورکھپور، بنارس، الہ آباد۔

ہمیں امید ہے کہ رسالۂ جامعہ کے قارئین کرام جو ان مقامات پر موجود ہیں ان وفود کی ہر طرح امداد کریں گے کیونکہ ان سے بڑھ کر جامعہ ملیہ کی تعلیمی اور ذہنی تحریک کا قدردان کوئی نہیں ہو سکتا۔

... ...

اس وقت تک ہمدردان جامعہ کی تحریک کو خدا کے فضل سے اچھی کامیابی ہوئی ہے۔ خاص شہر دہلی میں اس حلقے کے رکن پانچ سو سے زائد ہو چکے ہیں۔ میرٹھ میں حلقہ قائم ہو گیا ہے اور شہر کے اکثر حضرات جو تعلیمی ذوق اور قومی درد رکھتے ہیں اس میں شریک ہو گئے ہیں۔ علی گڈھ جو وفد گیا تھا اسے حسب توقع پوری پوری کامیابی ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کے قریب قریب کل اساتذہ جو پہلے سے جامعہ کے حقیقی ہمدرد تھے اب اصطلاحی ہمدرد بھی بن گئے۔ امید ہے کہ جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شروع جون میں حیدرآباد تشریف لے جائیں گے۔ وہاں جامعہ کے سچے بہی خواہ اور سرپرست بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں اس لئے یہ تحریک انشاء اللہ وہاں خوب سرسبز ہوگی۔

نذر دربار رسالت

شعرائے اسلام سے اپیل

میلاد کی محفلوں میں جو نعتیں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں وہ اگرچہ عاشقان نبیؐ کے والہانہ جذبات کی آئینہ دار ہونے کے لحاظ سے قابل قدر ہیں لیکن بعض بعض اشعار کے مضامین اور تیور ایسے سوقیانہ اور بے باک پائے جاتے ہیں جو سلیم المذاق سامعین کو بار گذرتے ہیں بعض اشعار وفور محبت و عقیدت سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں کہ حدود شریعت سے تجاوز کا لحاظ نہیں رہتا۔ اکثر نعت خواں اصحاب خود انتخاب کرنے سے معذور ہوتے ہیں اس لئے ارکان سیرت کمیٹی جالندھر نے محسوس کیا ہے کہ ایک مجموعۂ نعت شائع کرنے کی ضرورت ہے جو پاکیزہ جذبات کا حامل ہو اور جس میں احترام نبویؐ کا ل طور پر ملحوظ رہے۔ سرکار کائنات صلعم کی حیات طیبہ کے ان روشن واقعات کی جانب لطیف اور پر کیف اشارات ہوں جن سے اقوام عالم کو فلاح دارین کا سامان میسر آیا اور حضورؐ کے رحم و کرم، عدل، بذل، شجاعت، فصاحت، عفو، فقر، امانت و دیانت، بردباری، تحمل، محبت رواداری، مساوات اور ان جملہ اخلاق حمیدہ کا تذکرہ ہو جو انسانیت کی تکمیل کا باعث اور دنیا کے لئے مشعل ہدایت ہیں اور ذکر حبیبؐ بھی اس انداز میں ہو کہ ہادیٔ برحق کی رفعت و عظمت، وابستگان دربار رسالت کی سعادت اور اسلام کی عالمگیر رحمت کا نقشہ پیش نظر کر کے مردہ قوم میں از سر نو روح پھونک دی جائے اور ساز دل کے تار تار سے نغمۂ محبت نبویؐ پیدا ہو جائے لیکن ضعیف اور غیر مثبتہ روایات سے احتراز کیا جائے۔

اس مجموعے میں ایسی نظمیں بھی شامل ہوں گی جو حیات نبوی کے مختلف واقعات کے متعلق ہوں۔ ایک حصہ ایسی نعتوں اور نظموں کے لئے مخصوص ہوگا جو بچوں کے لئے آسان زبان اور پیرایے میں لکھی گئی ہوں۔ کچھ ایسی نعتیں اور نظمیں بھی ہوں گی جو بچیوں کے لئے لکھی جائیں اور ان سے وہ برکات ظاہر ہوں جو رسول کریمؐ کی ذات سے فرقۂ اناث کو حاصل ہوئیں۔

تمام نعت اور نظمیں ایسی بحروں میں ہوں جو ترنم کے لئے موزوں ہوں۔ انشاء اللہ یہ مجموعہ یوم النبیؐ سے قبل بہ اہتمام خاص، پاکیزہ کتابت، نفیس طباعت اور عمدہ کاغذ پر شائع ہو جائے گا۔ تمام شعرائے اسلام سے استدعا ہے کہ اپنی اپنی نعتیں اور نظمیں مرحمت فرما کر سعادت دارین حاصل کریں۔ بارگاہ رسالت کے لئے یہ نذر تیار ہو رہی ہے۔ ہر ایک شاعر جس کا ایمان ہو کہ نعت رسولؐ سرمایۂ سعادت ہے اپنے اپنے گلہائے اشعار لے آئے کہ فرقۂ شعرا کی جانب سے یہ گلدستۂ عقیدت مرتب ہو کر افصح عرب سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار رحمت میں پیش ہو۔ ایک پھول بھی منظور ہو گیا تو گلدستے کے تمام گل و گیاہ شرف قبولیت سے ممتاز ہو کر باعث نجات و فلاح دارین ہو جائیں گے

نیاز مند

پیرزادہ عبدالحمید بی اے، ایل ایل۔ بی پلیڈر، میونسپل کمشنر سکریٹری سیرت کمیٹی شہر جالندھر (پنجاب)

اردو لٹریچر اس علمی عقلی اور دینی مواد کو مہیا کرنے سے یقیناً قاصر ہے جو ات سلسلہ امرتسر کا ماہانہ

صحیفہ

مسلسل دس سال سے پیش کر رہا ہے ہر مہینے متعدد علمی و اصلاحی مضامین کے علاوہ ۴۸ صفحات تفسیر کیلئے وقف ہوتے ہیں، تفسیر میں کیا ہوتا ہے۔

۱۔ تمام آیات، رکوعات، اور سورتیں باہم مربوط و مسلسل۔

۲ متشابہات کی تفسیر محکمات سے۔

۳ وحی الٰہی کے لحاظ سے تمام کائنات انسانی کے لئے صرف قرآن کافی ہے۔

۴ قرآن مجید میں کوئی بات عقل و تجربے کے خلاف نہیں

۵ قرآن مجید پر تمام اعتراضات وارده کے جوابات۔

۶ قرآن ہر ملک و قوم اور ہر زمانے کے لئے صحیح ہادی ہے۔

۷ قرآن شیعہ، سنی، وغیرہ تفرقیات اور فن تکفیر کا سخت مخالف ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کو نہایت معقول طریق اور رواداری سے متحد بنانے کا حامی ہے۔

نوٹ۔ مئی ۱۹۳۳ء سے قرآن حکیم کی آخری منزل کی تفسیر شروع ہونیوالی ہے۔ اس حصہ میں سخت علمی مشکلات ہیں، نفسیات، تشریح ابدان، طبقات الارض، فلکیات اور زلازل وغیرہ کے متعلق، نہایت لطیف بحثیں حل کی گئی ہیں۔ قیمت سالانہ سے ر

اردو کا علمی و ادبی ماہوار مصور صحیفہ

اپنے بلند پایہ علمی مضامین اور اچھے اچھے

افسانوں کی وجہ سے خاص شہرت

حاصل کر چکا ہے

چندہ سالانہ - تین روپے ۸ ر

فی پرچہ - ۵ ر

مینیجر "ساقی" دہلی

رجسٹرڈ
نمبر ۱۰۵۲
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ
جلد ۲۰
بابت ماہ جون ۱۹۳۳ء
نمبر ٦

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927.

ذکریٰ ولادت نبوی پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ معرکۃ الآرا مضمون ہے اس کی قدر الہلال کے مطالعہ کرنے والے حضرات کرسکتے ہیں۔ قیمت ۸ر

بشریٰ اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبار و قہار ہی نہیں بلکہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ از سید سلیمان ندوی قیمت ۶ر

الورد والریحان بچوں کیلئے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہو تاکہ وہ آنحضرت صلعم کے اس مختصر کلام کو بآسانی یاد کرسکیں۔ قیمت ۲ر

ہمارا دین اس میں ارکان خمسۂ اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس اردو میں لکھی گئی ہیں قیمت ۲ر

تاریخ

تاریخ مغربی یورپ ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہے جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا گیا ہو۔ قیمت ڈھائی روپے عہ

تاریخ ہند قدیم اے ایم پانیکر کی کتاب کا ترجمہ ہو جسے موصوف نے جامعہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

تاریخ الدولتین خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ قیمت عہ

تاریخ نجد نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہو قیمت عہ

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ۔ قیمت مکمل ع۱۲/۵

۱۔ حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت عہ

۲۔ حصہ دوم خلافت راشدہ عہ

۳۔ حصہ سوم خلافت بنی اُمیہ۔ عہ

۴۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ عہ

۵۔ حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد عہ

۶۔ حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر۔ عہ

۷۔ حصہ ہفتم۔ خلافت عثمانیہ۔ عہ

سوانح عمریاں

سیرت محمد علیؒ مولانا محمد علی کی مکمل سوانحعمری ضخامت ۷۰۰ صفحہ کے قریب متعدد تصاویر قیمت ستے ر

تلاش حق گاندھی جی کے خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربات ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر۔ ایک روپیہ قسم اول دو روپے

ٹالسٹائی روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح اور انسانیت کے شیدائی ٹالسٹائی کے حالات۔ قیمت ۳ر

جمال الدین اخوت اسلامی کا پرجوش داعی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کیے۔ قیمت ۸ر

اورنگ زیب اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا۔ قیمت ۸ر

حیات حافظ لسان الغیب خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور اُنکی شاعری پر مفصل تبصرہ۔ قیمت عہ

حیات جامی فارسی کے مشہور شاعر مولانا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث قیمت ۸ر

ضیاء الدین برنی عہد تغلق کے نامور مؤرخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔ قیمت چھ آنے

سیرت عمرو بن العاص نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات قیمت عہ ر

خادمات خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات، جنھوں نے اپنی زندگی قوم کی وقف کر دی تھی قیمت ۱۰ ار

ادب

سیر المصنفین اُردو کے تمام مصنفین کے حالات ادب اُردو کی دل پسند تاریخ۔ قیمت عہ ر

کیمیاگر چند مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ ر

نیرنگ ۱۲۔ ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے عہ

مضامین رسالہ جوہر جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

لیلۃ القدر مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے ار

دیوان غالب جرمنی اس میں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں پاکٹ سائز رنگین تصویر، عہ و عہ

مرقع غالب جرمنی کمرہ کی زینت کیلئے عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی رنگین تصویر، دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں قیمت ۸ر

دیوان شید (جرمنی) مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ، مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور سے جرمنی میں طبع کرایا۔ قیمت عہ

کلام جوہر مولانا محمد علیؒ جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا مجموعہ ہے اور شروع میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقدمہ ہے۔ قیمت ۸ر

انتخاب میر سعدی ہند، میر محمد تقی میر علیہ الرحمۃ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے، قیمت ۱۲ار

انتخاب سودا مرزا محمد رفیع سودا۔ میر کے ہمچشم ہیں، یہ مجموعہ اُن کے اچھے کلام سے تیار ہوا ہے ۱۲ار

انتخاب حسرت حسرت کے تمام دواوین کا عطر ہے۔ قیمت ۱۲ار

جواہر ملیہ دس تاریخی نظموں کا یہ مجموعہ ہے۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ یہ نظمیں درس میں داخل ہیں۔ قیمت ۳ر

نالۂ مشیر مشہور صاحب قلم شیخ مشیر حسین قدوائی کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ

کلام مشیر یہ شیخ صاحب کے کلام کا دوسرا حصہ ہے، لوازم حسن، لوازم عشق وغیرہ چند اچھی نظمیں ہیں۔ قیمت عہ ر

چند اچھے ڈرامے

پردۂ غفلت	عہ ر	گناہ کی دیوار	۸ر
کھیتی	۶ر	صید زبوں	۱۰ر

ہمزاد ۶ر

متفرق

قوم کی آواز گاندھی جی کی وہ تقریریں جو موصوف نے ۱۹۳۱ء میں قیام انگلستان کے دوران میں کی تھیں تازہ اشاعت تقریباً چار سو صفحات قیمت عہر

آزادی مشہور سیاست داں مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ۔ قیمت عہر

مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب غریب مزدور، ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ کے اثرات، ۲۲۵ صفحات قیمت ۸ر

مشاہدات سائنس سائنس پر بارہ مختلف مضامین، از سید محمد عمر حسنی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

نفسیات شباب عنفوان شباب کی نفسی تحلیل، اُردو میں پہلی کتاب ہے، قیمت تین روپے۔

اسلامی تہذیب	۴ر	قومی تعلیم	۲ر
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	۴ر	آزادی ہند (ترجمہ)	۳ر
خطبہ مسیح الملک	۴ر	نہرو رپورٹ مکمل	عہ۸ر

بچوں کی کتابیں

تاریخ اسلام کا جدید نصاب

ہمارے نبی	جماعت دوم	۳ر
نبیوں کے قصے	" سوم	۵ر
سرکار دو عالم	" چہارم	۸ر
خلفائے اربعہ	" پنجم	۱۰ر

درسی کتابیں

ہمارے رسول	۵ر	اچھی باتیں	۴ر
بچوں کا قاعدہ	۴ر	رہنمائے قاعدہ	۲ر
آسان خوشخطی ۴ حصے ہر حصہ	۱ر	مشق خوشنویسی	۲ر

بچوں کے لئے ڈرامے

بچوں کا انصاف	۴ر	اسکول کی زندگی	۴ر
دیانت	۴ر	محنت	۴ر

شریر لڑکا ۴ر

بچوں کے لئے معلومات بڑھانیوالی کتابیں

دنیا کے بسنے والے	۶ر	تاریخ ہند کی کہانیاں	۳ر
میلاد النبی پروجکٹ	۶ر	باغبانی پروجکٹ	۸ر

اسلامی عقائد ۱۰ر

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ دہلی

زیر ادارت

مولنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی۔

جلد ۲ | بابتہ ماہ جون ۱۹۳۳ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

(۴)

اخلاق کی تعمیر تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے۔ مذہب اور فلسفہ دونوں نے اس کو اصولاً مان لیا ہے کہ انسان بہت سی باتوں میں مجبور رہنے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے اور یہی آزادی اس کی ذمہ داریوں کی بنیاد ہے۔

غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

لیکن انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہیں اور ان میں سے ہر ایک یا تو اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں اور ان لوازم، خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہیں جن کے لئے ان کی خلقت ہوئی۔ آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی۔ مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو اور بدبو، حیات اور ممات دونوں صادر ہو سکتی ہیں، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہیں اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہیئے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرۃً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن انسان تھوڑا اختیار پاکر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اس کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے اور پھر ان کی اغراض کے مطابق اپنے کام کو پوری مستعدی اور دیانت داری سے انجام دے۔ خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام "تربیت" ہے اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے۔ تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کی جائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کے لئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے۔

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے اسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے۔ ملک میں

مسلمانوں کی ایک درس گاہ بھی ایسی نہیں جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو۔ اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کہ نئی تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں۔ اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے۔ اخلاق سے مقصود انسان کی قوت نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرلے، درسگاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطے کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب وہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب وہوا کی جگہ ہو۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دارالصحت ہے جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہوکر بیمار صحیح وتندرست ہو جاتا ہے۔

ہمارے گھروں کی اخلاقی ومزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح، صحیح اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علیحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق وخصائل کے حامل ہوں اور اس طرح ایک دن وہ آئے کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق وفضائل سے متصف اور مزین ہو جائے۔

(۱) **سادگی اور صفائی** - ہماری درس گاہوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں۔ صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان، اور قیمتی فرنیچر اور سامان کے نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ اکثر مسلمان بچوں نے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں۔ اس کے دو برے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچوں میں پیدا ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بدلے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گراں ہے

اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہیں۔ دوسرے خود طالب العلم بھی اپنے حوصلے کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول و غمگین رہتے ہیں جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت بُرا پڑتا ہے اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کے یاد اور حل میں صرف ہونا وہ ان کے بناؤ سنگار میں اور جو نہیں ہے اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم میں بسر ہوتا ہے۔

ہمارے طالب علموں کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے۔ ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑوں اور اعلیٰ سامان سے نہیں بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہے۔ طالب علموں کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمایش اور آرایش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو۔

مسلمان طالب علموں کو جو مسرف اور نمائش پسند قوم کے افراد میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی میں وہ گراں نمایشی زندگی اختیار کریں جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ میں مل رہی ہے کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی اور وہ تمول اب سراب ہے اس لئے اس کے نمایشی فخر و غرور کے اسباب کو بھی اب ختم ہو جانا چاہئے ورنہ یہ تعلیم ہمارے افلاس میں روز بروز اضافہ کرتی جائے گی اور قوم کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ اس کی مثالیں آج بہت سے خاندانوں میں ملیں گی کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانوں کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں بنا بریں اس کے پاس ہمارے مقابلے میں دولت کی فراوانی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ میں ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہیں ہمسایہ قوم اپنے چند بچوں کو تعلیم دلاتی ہے۔ پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کاموں کے لئے اپنے بزرگوں کی متروکہ جائدادوں کو قرض میں رہن رکھ کر بیچنے پر اور وہ اس کے خریدنے پر مجبور رہیں۔

آج کل عام طور سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں مبتلا زیب نمائش پسندی میں مبتلا ہیں۔ ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزیں اور بنچیں اور کرسیاں تھیں، صرف انھیں دو مدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقۂ تعلیم سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے۔

ہمارے دارالاقاموں میں سب سے بہتر دارالاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالب علموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی ہے جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے۔

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ سادگی اور صفائی ہے۔ ہمارے نوجوانوں نے صفائی اچھے کپڑوں، فیشن ایبل بالوں، خوشبو، عطروں اور تیلوں کا نام رکھا ہے، حالانکہ وہ حقیقت میں گھر کی صفائی، کمروں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی اور بدن کی صفائی کی اصلی دولت سے محروم ہیں۔ طالب علموں کو اس بات کی عادت سکھانی چاہیئے کہ وہ کیوں کر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھیں جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور وہ صفائی اور ستھرا پن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کریں۔

(۲) **جفاکشی** ۔ اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ زندگی موقوف ہے وہ جفاکشی ہے۔ ہم نے اسلامی اصطلاحات میں جہاد کا نام سن کر اپنی روشن دماغی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اے عزیزان محترم! اب وقت ہے کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں۔ جہاد جہد سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں۔ حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں وہ ہمارا جہاد ہے۔ دنیا کی زندگی سکون پر نہیں، دائمی حرکت پر قائم ہے۔ غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسی قدر آرام

اٹھائیں گے۔ پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا تھا،

بقدرِ ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را   دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن، مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے۔ راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل یہ فصیح عرب کہتا ہے 'فی الحرکۃ برکۃ' جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا جو روٹی ہمارے ہاتھ آئے گی وہ ہمارے احساس کے ذائقے کو بھی تسکین نہیں دے سکتی۔

سست امیروں کی پرلطف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہیئے۔ ان کی طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہیئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضے میں کر لیں تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم کی فراغت کے بعد جس شاہراہ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیق زندگی ہو سکتا ہے۔ پچھلی دولت مندی کا خمار اب تک مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے۔ ہماری درس گاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشین کر دیں کہ اب تمھاری زندگی صرف تمھاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک بسلامتی پہنچنا صرف تمھارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اس عرصۂ کائنات میں زندگیوں کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں۔ وہی زندہ اور جیتا رہے گا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دئے اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے میں ڈال دے گی اور افراد اور قومیں

اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی۔ زندگی کا فلسفہ صرف جہد و جہاد، محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے۔ فَاُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ فَاُحْيٰى ثُمَّ اُقْتَلُ فَاُحْيٰى۔

یہ جو کچھ کہا گیا شاعری نہیں روزمرہ کی حقیقت ہے۔ طالب علموں کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا۔ یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہیں، اس میدان میں بھی اسی کی جیت ہے جو زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت انھیں کے لئے ہے جو اپنے کاروبار میں محنت اور جد و جہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔

تمام قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ قابلِ رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آپ پر منکشف نہیں کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی اور یہ قابلِ رشک ہونے کی صلاحیت اس کو کتنی محنت، کتنی جفاکشی اور کتنی پے در پے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ محمود نے سترہ حملوں میں پنجاب پر قبضہ پایا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑوں کو تبدیل نہیں کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا۔ میں نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ بدر و حنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے۔ جس کو لال قلعے میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں میں سر مارنا چاہیے۔ کوہ کنی کے بغیر "جوئے شیر" کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے۔

آج یورپ کی قومیں دنیا کے طول و عرض میں سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہیں لیکن اپنے سپاہیوں کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان کو نصیب ہوئی ہے۔ آج تجارتوں، صنعتوں اور کاریگریوں کی زندگی کی

یہ زندگی کتنی زندگیوں کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوتی ہے، کروڑوں مزدور کان کنی میں لگے ہیں، لاکھوں آلات کے بنانے اور چلانے میں مصروف ہیں، لاکھوں دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگا پو میں مصروف میں تب جاکر ان کی قوم کے سر پہ سلطنت کا تاج ہے اور ان کے خزانوں میں معدنیات، تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے۔

بابر سے لے کر عالمگیر اول تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لے کر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیوں پہ غور و فکر کی نظر ڈالئے۔ کیا تین سو برس کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہیں بتاتی کہ جنھوں نے تکلیف کی زحمت اٹھائی انھوں نے تخت سلطنت پر آرام کیا، اور جنھوں نے آرام کی خواہش کی انھوں نے عمر بھر زحمتوں اور تکلیفوں میں بسر کی۔

الغرض مسلمان طالب علموں کو یہ نکتہ اب کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور عملی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ جہاں قومی سلطنتیں اور قومی تعلیم گاہیں ہیں وہاں کے نظام تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں جو اہمیت کتابوں کو حاصل ہے اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلوں اور مختلف ورزشوں کو حاصل نہیں ہے، میدانی کھیلوں کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، دریاؤں میں کشتی چلانا، دھوپ میں دوڑنا، ہواؤں میں اڑنا وہ کون سی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومیں اپنے حکمراں بننے والے افراد کو نہیں کراتیں۔ انگلستان کی بہترین درسگاہوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلوں کی اہمیت وہاں تعلیم کے برابر ہی برابر ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہاں کی عام تعلیم گاہیں بھی تقریباً نیم فوجی ہیں۔ اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمام تر نظری رہتی ہے، عملی نہیں وہاں دور ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اگر آیندہ ہندوستان کی سلطنت میں حصہ لینا ہے تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ ہونا چاہئے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہیں بلکہ عملی قوم بننا چاہئے اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔

(۳) خود اعتمادی۔ مسلمانوں کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم۔ خود اعتمادی سے مقصود

اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا، اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام کو شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے۔ قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں میں ادا کیا ہے " اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہ (جب عزم کرلے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے۔ مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توحید اور نصرت پر بھروسہ رکھنا۔

مسلمانوں کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھ کر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کرکے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا۔ ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر میں علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتوں اور درسگاہوں سے فیض پاکر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بن کر چمکتا تھا۔ ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لے کر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بن کر نکلتا اور دولت کے جہاز اور کاروان سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہوں میں اترتا۔ ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لے کر نکلتا اور روئے زمین کی فضا کو چیر کر کہیں نہ کہیں اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا۔

مسلمانوں کا یہ جوہر اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں ان سے کھو گیا۔ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن میں تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار کی فوج سے ہندوستان کو فتح کر ڈالا۔ اس کی اولاد جب لال قلعے سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو تنہا کوئی کام کرنے نہ دیں، تنہا راستے میں نہ چلیں، راتوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلیں، کمروں میں رات کو تنہا سونے نہ پائیں۔ ایک بڑے عالم باپ کو میں نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہیں جانے دیتے تھے کہ یہ کالج میں پڑھنے جانے والا بچہ کہیں آتے جاتے راستے میں موٹروں سے کچل نہ جائے۔

امیر مسلمانوں کے گھروں میں یہ بات دولت مندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ اتائیں اور کھلائیاں جوان جوان لڑکوں سے بھی علیحدہ نہ ہونے پائیں۔ ہم نے اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادوں کے واقعے سنے ہیں جن کو اس وقت تک نیند نہیں آتی تھی جب تک ان کی اتا بی بی ان کو پلنگ پر سلاتی نہ ہوں۔ آپ نے ایسے نواب زادوں اور امیر زادوں کو دیکھا ہوگا جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے میں جب داخل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کو ناگہانی اتفاقات سے بچانے کے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے۔

غریب مسلمانوں تک میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم و ارادے کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہیں اور اس لئے تعلیم کے زمانے کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ الغرض وہ بچپن میں اتا اور کھلائی کے، تعلیم میں اتالیق اور ٹیوٹر کے، اور ملازمت میں سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلے میں ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلیں۔ ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں۔ ان کی ترقی کا عہد وہ تھا جب بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے اور ان کی تنزلی کا زمانہ جب آیا تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیروں کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیروں نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا اور بالآخر تخت اور تخت نشیں دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔

یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں آج یہ جوہر ان کی انھیں درسگاہوں میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے، وہیں وہ کام دینے لگتا ہے۔ ایک فرنچ مصنف نے اینگلو سکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں "سر تقدم الانکلیز السکسونیین" کے نام سے ہوا ہے۔ اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے۔ ایک اور فرنچ نے "بیسویں صدی کا امیل" کے نام سے

خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے' اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ماں کی گود سے لے کر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کی جائے وہ خود اعتمادی ہے۔ ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا۔

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور عملی طاقت سے ہو سکتی ہے' اس لئے ہماری درس گاہوں کو اس ملک کے مسلمانوں کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں اور اس مملکت کے نظام حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومت وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے۔

اساتذہ ہماری درس گاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کی جاتی ہے وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے۔ قومی درس گاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جو کم تنخواہ لے' اور سرکاری درس گاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذی سند رکھے اور "یوروپین کوالفکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے۔ ہندوستان کا کیسا ہی تجربے کار سے تجربے کار' ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق سے ہو مگر اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درس گاہ کے دو نقطہ نہ ہوں تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار اور نوآموز ترجیح پائے گا۔ ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریز' فرینچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے اور اس کو منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمانہ فیاضی کے لئے تیار ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار نہیں دیا ہے' اس لئے استادوں کے انتخاب کا معیار صرف یہ گیا ہے کہ اعلیٰ سند کا کاغذ' اور سات سمندر پار کے حکمراں اقوام کی گوری شخصیت' انتہا یہ ہے کہ عربی فارسی اور تصوف کے پڑھانے کے لئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں جب تک پروفیسر

مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطوں کا کاغذ اس کے پاس نہیں۔

ہم نے اس سے پہلے سلمانوں کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر وہ ذہن نشیں ہے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے میں ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائیں گے کہ استادوں کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت میں ان مقاصد کا وجود ہے جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے۔ اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہوں کا باہم موازنہ کریں جن میں سے ایک ایسے استادوں کا اسٹاف رکھتی ہے جو اعلیٰ کاغذی سندوں کے تو مالک ہیں مگر ان مقاصد سے سرتاسر خالی ہیں اور دوسری گو اعلیٰ کاغذی سندوں کے لحاظ سے کم درجہ ہے مگر اس کے استاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہیں جو اس کے تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہیں تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہیں زیادہ مفید ہوگی۔ کیا ہماری نئی اسلامی درس گاہیں استادوں کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہے؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنائے گا اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؟ ایسے استادوں کے زیر تعلیم و تربیت جن میں سے ہر ایک کا قبلۂ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو، ایسے لڑکوں کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہوں، قوم پرور ہوں، سادہ ہوں، جفاکش ہوں اور مسابقت اقوام کی دوڑ میں اپنی برتری دکھا سکیں، کہاں تک حق بجانب ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتوں میں جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھے اور اس سے بے خبر ہو کہ ع گندم از گندم بروید، جو ز جو۔

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنالیں وہی درحقیقت استادوں کے انتخاب کا معیار ہے۔

بوریا باف گرچہ بافندہ است نہ برندش بہ کارگاہ حریر

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہیں کیا اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادوں کا انتخاب کیا۔ مثال دیتا ہوں، ہم نے عربی پڑھانے کے لیے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا وہ عربی فیلالوجی اور یورپ میں عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچوں کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوقِ قومی ہم کو کیوں کر عطا کر سکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہیں بلکہ وہ اس سے منحرف ہے۔

ہماری اکثر درس گاہوں کے استاد صرف پیشہ ور معلم ہیں جنھوں نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہیں اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آیندہ ہمارے بچوں کو ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کر دیں گے۔

جامعہ ملیہ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے استادوں کے انتخاب میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہیں بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو رکھا ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اس درس گاہ میں ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے استاد کو لا کر رکھ دیا جائے جو گو یورپین اسناد کا بڑا پوٹ اپنے قبضے میں رکھتا ہو مگر اس کے تمام تر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہوں جن پر اس درسگاہ کی بنیاد ہے تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اس کو "جامعہ بدر" کرنے میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کریں گے؟ پھر کیا یہ کہ ہماری درسگاہوں کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تضحیک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہیں اور پھر صرف اس لئے یہ گوارا کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔

جوہر طینت آدم زخمیر دگر است تو توقع زگلِ کوزہ گراں می داری

ارکان جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کر دینا ہے۔ ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت اور وطنیت جدید اور قدیم دونوں کی لطیف و معتدل آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہے۔ اس لئے اساتذہ کے

انتخاب میں صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہیں کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کر دیں، یا وطنیت سے انحراف پسند کر لیں۔ اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ میں معلم نہیں باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کے لئے رواداری کیوں برتی جائے۔ اگر کوئی درس گاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلہاڑی مارتی ہے۔ بہرحال اس بات کے اظہار میں ہم کو کوئی پس و پیش نہیں کہ ہماری یہ نوعمر درسگاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے اور دعا ہے کہ اس کے کارکنوں کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو۔

علوم | ہم کو اپنی درس گاہوں میں کن علموں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر اب تک مسلمانوں نے کیا بلکہ ہندوستانیوں نے بھی غور نہیں کیا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے میں گرفتار ہیں، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہیں سکتے۔ ہندوستان میں نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے ان کو بیان کرنے میں برطانی مدبرین نے کبھی پس و پیش نہیں کیا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے یہاں تک کہ اس میں خدا کا نام بھی نہ آنے پائے۔

(۲) بنگال کی ابتدائی مثالوں سے انگریزوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نئی تعلیم عیسائیت کی اشاعت میں معین ہوگی۔ اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولوں کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں انجیل کی تعلیم داخل کی گئی۔

(۳) انگریزوں کو اپنی حکومت کی تنظیم میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو ان کے دفتروں کے لئے کچے مواد اور مسالوں کو ان کے مطالعہ تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کر سکیں اور ان کو ان کی زبان میں معاملے کی صورت حال کو سمجھا سکیں۔

ان وجوہ سے جدید درس گاہوں کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان میں صرف انہیں علوم کو داخل کیا گیا جو اس قسم کے ادنیٰ التعلیم یافتوں کو ان کے لئے مہیا کر سکے۔

ایسے محرروں، کلرکوں اور ماتحت افسروں کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہیے تاکہ وہ ان کی زبان میں سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کرسکیں، پھر ان کو حساب جاننا چاہیے جو ان کے دفاتر کے حساب وکتاب کو درست رکھ سکیں۔ چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان میں جاری کی گئی اس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں، انگریزی اور حساب، اس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے جس سے مقصود صرف اس قطعہ ارض کا علم ہے جہاں سے آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اور اس سے اُس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑوں کا جوڑ بھی معلوم ہو۔ چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قوموں کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلوں میں تازہ رکھنا اور انگریزوں نے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس ملک میں ایک منظم عادل اور متمدن حکومت قائم کرکے اہل ملک پر جو احسان کیا ہے اس کو باربار دہراتے رہنا ہے۔ چنانچہ حکومت وقت اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض وعداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششوں کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی۔

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہیں، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس۔ یہ دونوں حصے حد درجہ ناقص ہیں۔ آرٹس میں جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہوں۔ ابھی حال میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے یہ بالکل بجا کہا ہے:۔

> "بی۔ اے یعنی 'بیچلر آف آرٹس' کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے۔ وہ کون سا آرٹ ہے جس میں ایک بی۔ اے مہارت حاصل کرتا ہے۔"

لے دے کر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی اور وکالت کے خیال سے ہے، اور پھر نظری فلسفہ۔ علوم میں ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہے کہ "نظریات" کو اہمیت دی جائے اور "عملیات" سے پہلو تہی کی جائے۔ ہماری ایک بڑی درس گاہ میں سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا نہیں۔ حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ان میں سے

کس کا چمڑا کس کس طرح کام میں لا سکتے ہیں۔

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہیں تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہے لکھے پڑھے اپاہجوں کی تعداد بھی روز افزوں ہے اور چونکہ ہندوستان میں بے کاروں کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہیں اس لئے اس کو اپنے طریق تعلیم میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہے اور اب انقلابات نے ہماری آنکھوں سے یہ پردہ اٹھا دیا ہے کہ یونیورسٹیوں کی یہ تعلیم نوکریوں کے حصول میں بھی اب کارآمد نہیں رہی ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہاں تک صحیح ہے۔ اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریوں کا سہارا بھی ہو تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریاں قومی افلاس کے دور کرنے کا علاج نہیں ہیں۔ وہ علوم و فنون جو حصول دولت کے اصلی ذرائع ہیں ان کی تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے، عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع و حرفت کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دار و مدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی تعلیم یہاں ہو تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہاں سکھائی جاتی ہے مگر دوا سازی نہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤں کی قیمت میں ہندوستان اپنا سرمایہ انگلستان کو دینے پر کیوں مجبور ہو۔

اسکول کی پوری تعلیم میں سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے۔ جغرافیہ طبعی، حفظان صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا ان کو اور کچھ بتایا نہیں جاتا اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہیں آتا۔ کالجوں کی اعلیٰ تعلیم میں انھیں خاکوں کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت سے گفتگو کرنے کے لئے میں اپنے میں اہلیت نہیں پاتا اس لئے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق اشخاص کے سپرد کر کے صرف

چند سرسری اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب تعلیم آپ کے لئے زہر نہیں جو مذہب و اخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو؟

(۲) کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزوں کی طرح اس زبان میں لکھ پڑھ سکے اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے جس سے اس کے ذریعہ گفتگو، کاروبار اور حصول علم ممکن ہو۔

(۳) علوم میں ان سائنسوں کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکیں۔

ہمارے بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گھڑی سے وقت کیوں کر پہچانیں، ٹکٹ لے کر ریل پر کیوں کر بیٹھیں اور ایک موٹر کا عام استعمال کیوں کر کریں، تار لکھ کر بابو کے ذریعے تار کیوں کر بھیجیں لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ہم گھڑی کیوں کر بنائیں، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالیں، پھر لوہے کو کیسے صاف کریں، پھر کیوں کر ریل کی پٹریاں اور گاڑیاں اور پہیے اور انجن بنائیں، موٹر کے ٹکڑوں اور ان ٹکڑوں کے کو کیسے بنا کر جوڑیں۔ اسی مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کیجئے۔

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہیں اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گراں قیمت تعلیم میں ہم اپنے بچوں پر جس قدر صرف کرتے ہیں، اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ ان لڑکوں کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے۔ ہمارے لڑکے بی۔ اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولوں کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمے پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہاں پہنچتے ہیں تو دفعتہً منزل مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب سوچتے ہیں:

گذری جو گذرنی تھی اب چاہیے کیا کرنا

غور کرتے ہیں تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہیں پاتے، اس سے مایوس ہو کر بعض لوگ تو ذرا اکتا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں یعنی ایم۔ اے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور بعض قانون یاد کرتے ہیں یا ٹریننگ کی فکر کرتے ہیں لیکن اب ٹریننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے اور قانون کے میدان میں جو بھیڑ بھاڑ ہے اس سے کون بے خبر ہے۔

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے آیا ان کے لئے اس طریقۂ تعلیم میں علوم کی تحصیل کا سامان ہے اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے کیا انھوں نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم میں اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان چند لوگوں کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہیں یا علمی اور تعلیمی پیشے میں زندگی گذارنا چاہتے ہیں بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنی چاہیے، اور اعلیٰ تعلیم کا فریب نہ کھانا چاہئے۔ اس تعلیم کے بعد ان کو کسی صنعت، حرفت، تجارت یا اور دوسرے ذرائع معاش کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف انھیں کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہوں اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند بلند عہدوں کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر لیا ہے اور انھیں کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے مگر غور کے قابل بات ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے میں دس بیس سے زیادہ نہیں، وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کی جائے!

ہمارے ہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اب تک ہے کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو یا نہ ہو اور ان علوم سے ان کو وابستگی ہو یا نہ ہو بہر حال وہ ان کو پڑھنا ہے اور ان میں ان کو کامیاب ہونا ہے ورنہ آئندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے۔ اس مجبورانہ طریق تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایے کا بے دریغ خون کیا ہے۔ آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اعلیٰ فضول خرچی

کب تک جاری رہے گی اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں اور ان علوم کو چھوڑیں جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصولِ زر کا طریقہ سکھایا جائے۔

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے کہ اس کے لئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے۔ ہم نے اب تک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصدوں کو ایک تعلیم کے اندر جمع کر دیں اور یہ ناممکن ہے۔ پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہوسکتی یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعے سے کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا فلاسفر، کوئی بڑا مورخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ، کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانومر، کوئی بڑا میتھیمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی کیونکہ علم کی صبر آزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے جھوٹی پالٹکس اور سرکاری نوکری کے ذریعے فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے اور علم کا تقاضا ہے کہ علم کے سوا اس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو۔

تعلیم کی زبان | سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے۔ میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں جن کے دہرانے کی حاجت یہاں نہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے جو ۱۸۳۵ء میں ہم پر مسلط کی گئی آزادی حاصل کریں۔ یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہیں۔ علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہوں اور کسی قوم سے ان کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانوں کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان میں منتقل کیا یا دوسروں سے منتقل کرایا اور اس اپنی زبان کے ذریعے لوگوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی۔ آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل

ہے تو کیا کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جا سکتی ہے جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری اعلیٰ قوموں کی زبانوں کو علوم و فنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو۔ کل بیت الحکمۃ نے بغداد میں جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دارالترجمہ عثمانیہ میں آج نہیں ہو سکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعے اپنے ہاں تعلیم نہیں پھیلائی اور نہ آج ترک تک باایں ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا سکے ہیں کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ زبان کو قومیت کی تخلیق میں کیا اہمیت حاصل ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا تو اس وقت اتفاق سے میں فرانس کے شہر ولشی میں تھا۔ فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتا رہے تھے ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے جہاں فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہیں"۔ یہی وہ اسکول ہیں جہاں شامی بچوں کے دلوں میں فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا۔ یہ بیج بڑھا اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت میں شام میں موجود ہے۔

جامعہ کی چاردیواری میں اس اہمیت پر استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں جو قوموں کی تکوین و تخلیق میں زبانوں کو حاصل ہے۔ مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے جو پوری قوم کو ایک متحد قوم بناتی ہے۔ وہ زبان جو کسی قوم میں ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ جہاں تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے ہماری زبانوں کو بہت کم امداد ملی ہے۔ وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کے خزانوں سے محروم ہے اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے میں بند ہیں جہاں تک رسائی بے اس کے ممکن نہیں کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان میں سالہا سال تک مہارت حاصل کریں پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک آسانی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل نہ کرلیں۔ مثال یہ ہے کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان میں سوال دیتے ہیں۔ بچے کو پہلی مشکل یہ ہے کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہیں سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان میں دہرانے پر تو یقیناً

قدرت نہیں رکھتا کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے۔

ہندوستان میں مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان میں علم کی تحصیل سے معذور ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہیں۔ ہندوستان زبانوں کا دنگل ہے۔ صوبہ وار زبانوں کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک میں قائم ہے۔ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود میں حاصل ہے یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری نہ سہی تو علمی و ادبی زبان تو ضرور ہی بنالیں گے۔ لیکن مسلمان اب تک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہیں اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے، لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہیں، اور دوسری قوم سے مستعار مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے تو یہاں کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے اور یہ وہی زبان ہوگی جس کو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک میں پیدا کیا ہے۔

اب تک ہم اس ساحرانہ فریب نظر میں پھنسے تھے کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان میں ہو ہی نہیں سکتی مگر یہ سحر اب ٹوٹ رہا ہے اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے اس جال کے ایک ایک تار پود کو الگ الگ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں۔ شراب کو جس پیالے میں بھی پیو وہ شراب ہے اور تلوار کو جس غلاف میں بھی رکھو وہ تلوار ہے۔ سوال ظرف کا نہیں مظروف کا ہے۔

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو۔ دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہے کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمہارے پیچھے آئے گی۔

ہم کو اس کا احساس ہے کہ آج کی گفتگو میں کچھ دل خراش باتیں بھی ہیں مگر سنجیدگی سے غور اس پر کرنا ہے کہ یہ سچی باتیں ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو زخموں پر کب تک اس ڈر سے نشتر نہ لگایا جائے کہ اس سے بیماروں کو تکلیف ہوگی۔

وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

غالباً اس بات پر تمام تذکرہ نویس متفق الرائے ہیں کہ ایرانی شاعری نے جس شاعری کو اپنا رہبر بنایا وہ صرف عربی شاعری ہے۔ بجز مسٹر براؤن کے دیگر تمام مستشرقین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اسلام سے پہلے ایران شاعری کے حقیقی مفہوم سے ناآشنا تھا۔

محققین یورپ نے حقیقت میں فارسی کی قدیم اور نایاب کتابیں جمع کرنے میں انتہائی جستجو اور تفحص سے کام لیا اور اس جستجو میں وہ بہت کچھ کامیاب بھی ہوئے لیکن قدیم فارسی شاعری کے متعلق چار چھ شعر سے زیادہ جمع نہ کر سکے حالانکہ واقعۃً ان پر بھی شاعری کا اطلاق صحیح طریقے پر نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی شعر ان میں سے دعائیہ فقرہ ہے جو دربار شاہی میں عرض و معروض کرنے سے پیشتر پڑھا جاتا تھا اور بطور دعا اور آداب دربار کے حکومت وقت کی جانب سے مقرر تھا بغیر اس کے پڑھے کوئی بات زبان سے نہیں نکال سکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس فقرے سے کلام کی موزونیت کا صاف طریقے سے پتہ چلتا ہے لیکن اس سے ان کے شاعر ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں شعریت کا فطری مادہ موجود تھا مگر اس کو صحیح راستے پر لگانے والا موجود نہ تھا۔ جب اسلام نے اس جوش کو ابھارا تو وہ خوب ابھرا۔

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ   نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

مذکور الصدر شعر کا شان نزول یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بہرام گور شکار کھیل رہا تھا۔ صید کے زخمی ہونے پر بے ساختہ اور جوش و مسرت کے عالم میں پہلے مصرعے کے کلمات اس کے منہ سے نکل گئے۔ بیوی بھی ساتھ تھی اس کے منہ سے بھی اسی جوش و مسرت کے ساتھ دوسرا مصرع نکل گیا۔ بہرام کی پرورش اور تربیت کا اکثر حصہ عرب بادیہ نشینوں میں گذرا۔ عرب میں چونکہ اس وقت شاعری شباب پر تھی ملک کا اصلی سرمایہ تفاخر صرف شاعری اور ملکہ شاعری تھا۔ برنا و پیر سب اسی ایک رنگ میں رنگے

ہوئے تھے، جو بات منہ سے نکلتی تھی اس پر موزونیت کا گہرا رنگ چڑھا ہوتا تھا، چلتے پھرتے طول طویل اور جوش آور قصائد کہہ دینا ان کے نزدیک "بازیٔ طفلاں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

یہ تو ظاہر کیا جا چکا ہے کہ بہرام کا دماغ عربی شاعری اور اس کی خصوصیت سے متاثر ہو چکا تھا، بعضوں کی رائے کے مطابق وہ عربی میں شعر بھی موزوں کر لیا کرتا تھا۔ بہرحال اس نے عربی میں شعر موزوں کئے ہوں یا نہیں یہ بات ہمارے عنوان سے خارج ہے۔ جب انسان کسی چیز سے متاثر ہو جاتا ہے تو اسی قسم کی باتیں خود بخود اس کے منہ سے سوتے جاگتے نکلتی رہتی ہیں، ایک جاہل اور بدوی انسان بھی تعلیم یافتہ اور مہذب سوسائٹی میں بیٹھ کر گاہے گاہے اسی قسم کی باتیں بغیر علم وارادے کرنے لگتا ہے۔ بہرام گور تو بادشاہ تھا اور سلاطین کا دماغ بھی اکثر شاہانہ ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر چند موزوں کلمات نکل گئے تو اس چیز سے قبل از اسلام فارسی شاعری کے وجود پر استدلال نہیں کیا جا سکتا درآنحالیکہ پورا شعر بھی بہرام کی طرف منسوب نہ ہو۔ داخلۂ اسلام کے بعد سے آج تک کی فارسی شاعری کی تاریخ مع شعراء کے ناموں کے مکمل طریقے پر موجود ہے لیکن اسلام سے پہلے ایرانی شاعری کے متعلق اگر آپ کچھ معلوم کرنا چاہیں تو آپ کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔ تہذیب و تمدن کی ترقی، آب و ہوا کی فرحت انگیزی اور ولولہ خیزی کا پتہ ضرور چل جائے گا لیکن شاعری کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔

مملکت ایران کی عنان جب عباسیوں کے ہاتھوں میں پہنچی اور وزارت میں خاندان برامکہ کو اپنی حکمت عملیوں کی وجہ سے سیاہ سفید کا کلی اقتدار حاصل ہو گیا تو درپردہ عربی حکومت خالص ایرانی سلطنت کی حیثیت میں آگئی جس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت خالص ملکی حکومت بن گئی تھی۔ ٹھیک اسی طریقے سے عباسیوں کے عہد میں خاندان "برامکہ" کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے عربی حکومت درپردہ ایرانی قالب میں ڈھل گئی تھی۔ حکومت کے بڑے بڑے محکموں پر ایرانیوں کا اقتدار چھایا ہوا تھا۔ یہی سیاہ سفید کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ عرب خون پی پی کر رہتے تھے لیکن "برامکہ" کے اثر و اقتدار کی وجہ سے حرفِ شکایت بھی زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔

ہندوستان میں جس طرح اسلامی حکومت کے اثر کی وجہ سے ہندو شعراء فارسی زبان میں

اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے اسی طرح ایرانی بھی بنوامیہ کے عہد میں عربی زبان میں شاعری کو اپنے لئے فخر اور رسائی دربار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ "بنوامیہ" کے آخر عہد حکومت تک سرزمین ایران میں سینکڑوں شعراء پیدا ہوئے لیکن وہ سب کے سب عربی زبان میں واردات قلب بیان کرتے رہے۔ عباسیوں کے عہد میں جوں جوں فارسی روح عربی قالب میں داخل ہوتی گئی اُسی قدر عربیت کے آثار بھی مفقود ہوتے گئے۔ ہندوستان میں فارسی زبان اس وقت تک باقی رہی جبتک حکومت کا کچھ بھی اثر رہا اگرچہ ملکی ماحول کے اثر کی وجہ سے وہ خالص ایرانی فارسی سے بہت کچھ مختلف ہوگئی تھی تشبیہات و استعارات، اور خیالات و واردات میں بھی کچھ اختلاف رونما ہوگیا تھا۔ بیاں کا پسندیدہ رنگ کچھ اور تھا اور خاص ایران میں کچھ اور بات مقبول تھی۔ ہندوستان میں یہ فروق ضرور رونما ہوگئے تھے لیکن کم ازکم زبان اپنی جگہ پر تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ قائم رہی مگر ایران میں عربی کے قدم ڈگمگا گئے۔

خلیفہ مامون چونکہ ننہالی رشتے سے عجمی النسل سمجھا جاتا تھا، فارسی اس کی مادری زبان ہو چکی تھی۔ فارسی گو شعراء پر اکرام و انعام کی بارش ہونے لگی تھی چنانچہ "عباس مروزی" کے ایک فارسی قصیدے کے صلے میں ایک ہزار دینار سالانہ مقرر کئے گئے تھے۔

دربار میں چونکہ ایرانی سیاست کارفرما تھی اس لئے عہد مامونی میں درباری زبان فارسی قرار پائی۔ تمام سرکاری کام بجائے عربی کے فارسی زبان میں ہونے لگے۔ ملکی تعصب کی یہ پہلی فتح تھی جس نے مفتوح ایرانیوں کے حوصلے بڑھا دئے۔ ملکی شعراء جن کے قبضے میں ملک و قوم کی حقیقی باگ ہوتی ہے انھوں نے ایک قدم اور بڑھایا۔ فارسی زبان سے بھی عربیت کو حذف کرنے لگے چنانچہ شاہنامے کی خالص فارسی زبان اسی عصبیت کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ اس تمام تفصیل کا اجمال یوں کیا جاسکتا ہے کہ ایران میں شاعری کی ابتدا داخلۂ اسلام کے بعد ہوئی۔ "بنوامیہ" کے زمانۂ خلافت تک ایرانی شعراء عربی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے رہے۔ "بنوامیہ" کا تختہ الٹ جانے کے بعد جب عباسی سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے فارسی علم ادب کو بہت کچھ ترقی دی اور اسی عہد میں ایرانی شاعری اپنے اصلی قالب میں آگئی۔ اسلام کے ابر کرم نے جب دنیا کو سیراب کرنا شروع کیا تو علاوہ سچی خدا پرستی اور

ایمانداری کے مختلف علوم وفنون کی بارش بھی شروع کی۔ عرب کو جس چیز پر ناز تھا وہ ان کی فطری اور سچی شاعری تھی " ان من الشعر لحکمۃ " کی حقیقی تعریف انھیں کی عین فطری شاعری پر صادق آتی تھی۔ اسلام کے مبارک و مسعود قدم جہاں بھی پہنچے وہاں اس نے اپنی سچی شاعری کا سکہ ضرور جمایا۔

ایران کی سرزمین اپنی شائستگی و شادابی کی وجہ سے تمام دنیا سے بڑھی ہوئی تھی۔ تمام ملک ترقی یافتہ صورت میں تھا، زمین تختۂ گلزار بنی ہوئی تھی، ہوا اپنے اثرات کے لحاظ سے فرحت بخش، نشاط انگیز، ولولہ خیز، اور روح پرور تھی۔ اسی وجہ سے اس شاگرد نے تمام دنیا سے پہلے اپنے آپ کو استاد کے رنگ میں رنگ لیا اور یہاں تک محنت و ریاضت کی کہ بعض باتوں میں استاد سے بھی سبقت لے گیا۔

چونکہ استاد کی طرح شاگرد بھی حسب و نسب کے اعتبار سے نجیب و شریف تھا اس لئے اس نے اظہار تلمذ میں کسی قسم کا عار محسوس نہیں کیا۔ اس حقیقت کو سینکڑوں مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے اور طرز ادا سے صرف اعتراف واقعہ ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس اعتراف کی تہ میں جوش و خروش اور فخریہ انداز کا بھی پتہ چلتا ہے۔

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود — اول شان امرأالقیس، آخرشان بوفراس (انوری)

شعرائے فارسی میں سے جس کسی کے دماغ میں عربی اشعار کا زیادہ ذخیرہ محفوظ ہوتا تھا وہ اپنے کو دوسرے ہمعصروں پر بانداز فخریہ فوقیت دیتا تھا اور حقیقت میں یہ تفوق اس دور میں اس کے لئے صحیح اور درست بھی تھا چنانچہ منوچہری جس کو ملک سخن کا فرماں روا ہونے کا فخر حاصل ہے اس فخر کو اس انداز سے بیان کرتا ہے:۔

من بسے دیوانِ شعرتازیاں دارم زبر
تونہ دانی خواند "الاھبی بصحنک فاصبحینا"

یعنی اے مخاطب مجھ کو تو عرب کے بیسیوں دیوان ازبر ہیں اور تو "سبعہ معلقہ" کا وہ قصیدہ جس کا یہ مطلع ہے نہیں پڑھ سکتا۔

الاھبی بصحنک فاصبحینا
ولا تبقی خمور الاندرینا

حتیٰ کہ مشہور شعرائے فارس کی تمثیل کے لیے جو شعرا پیش کئے جاتے تھے ان کا قرعۂ انتخاب بھی صرف شعرائے عرب کے نام نکلتا تھا۔ چنانچہ منوچہری نے ایک قصیدہ "ملک الشعرا عنصری" کی مدح میں لکھا تھا اس میں عنصری کا مقابلہ شعرائے عرب سے کیا ہے، تمثیلاً شعرائے عرب کا نام لے کر کہتا ہے کہ" وہ کسی صورت سے بھی عنصری کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" عنصری کی تمثیل کے لیے اس کو صرف شعرائے عرب کا انتخاب کرنا پڑا حالانکہ اس دور میں خود فارس میں ایسے شعرا موجود تھے جن کو عنصری کی تمثیل میں پیش کیا جا سکتا تھا مگر چونکہ شعرائے فارس کے دماغوں میں شعرائے عرب کی سطوت چھائی ہوئی تھی اس لئے ان کی نظروں کے سامنے صرف شعرائے عرب ہی مختلف حیثیت سے جلوہ نما رہتے تھے۔ اگرچہ اس نے اس موقعے پر شاعرانہ مبالغہ اور خوشامد سے کام لیا ہے لیکن ہمارے موضوع سے یہ تحقیق خارج ہے اس لئے ہم اس بات کا کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے ہمارا مقصود صرف یہ بات ظاہر کرنا ہے کہ شعرائے فارس نے ہر حیثیت سے شعرائے عرب کو اپنا استاد سمجھا۔

اوستاد اوستادانِ زمانہ عنصری — عنصرش بے عیب و دل بیغش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع — طبع او چوں شعر او ہم باملاحت ہم حسن
کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید — رو بہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند — تا عزیزے روضہ بینند و طبیعے نسترن
شعر او فردوس را ماند کہ اندر شعر او — ہر چہ در فردوس مارا وعدہ کردہ ذوالمنن

اس کے علاوہ اور بھی مختلف جگہ شاعران عرب کی استادی کا فخریہ انداز میں ذکر کیا گیا ہے:۔

شاعری عباس کرد و حمزہ کرد و طلحہ کرد — جعفر و سعد و سعید و سید ام القریٰ
آنکہ گفتست "اٰذَنَتنَا" آنکہ گفت "الاھبّی" — آنکہ گفت "السیف اصدق" آنکہ گفت "ابلی الھویٰ"[1]

---

[1] اس شعر میں منوچہری نے عربی کے چار مشہور شعرا کے قصائد کی طرف اشارہ کیا ہے اور مقصود صرف اظہار تلمذ ہے "اٰذَنَتنَا" سے اشارہ ہے حارث بن "حلزہ الیشکری" کے اس مشہور قصیدے کی طرف جس کا مطلع یہ ہے:۔

اٰذَنَتنَا بِبَینِھَا اَسمَاءُ — رُبَّ ثَاوٍ یُمَلُّ مِنہُ الثَّوَاءُ

یعنی اسما (نام معشوقہ) نے اپنے ہجر کی اطلاع ہم کو دے دی ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی معیت سے طبیعت گھبرا جاتی ہے مگر "اسما" ان میں سے نہیں ہے۔ اس مشہور قصیدے کے دو شعر جذبات شجاعانہ میں بہت کچھ ترفع پیدا کرتے ہیں۔

لَا یُقِیمُ العَزِیزُ بِالبَلَدِ السَّہلِ   ولا ینفع الذلیل النجار

یعنی شریف اور بہادر لوٹ مار کے خوف سے سہل الحصول مقام پر نہیں ٹھہرتا اور ذلیل انسان کو اس خوف سے بھاگنا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔

لَیسَ یُنجِی الَّذِی یُوَائِل مِنَّا   راسُ طودٍ وَحَرَّۃٌ رَجلَاء

یعنی بھاگنے والے کو پہاڑ اور سخت جنگلوں میں چھپنا ہم سے نجات نہیں دلا سکتا۔

"سبعہ معلقہ" کے سات مشہور قصیدہ نگاروں میں سے ایک یہ بھی ہے۔ صف اول کے شعرا میں اس کا بھی شمار کیا گیا ہے۔ عراق عرب کا باشندہ تھا۔ ہجرت نبوی سے ۲۰۳ سال قبل پیدا ہوا۔ آخر عمر میں جذام میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے قصائد میں بھی عرب کی عام جزئیت کا رنگ غالب ہے۔ زمانۂ جاہلیت کے دیگر شعرا کی طرح اس کا کلام بھی تفاخر ذاتی اور جوش نسبی سے مملو ہے جن کے جذبات کا دریا سا موجزن معلوم ہوتا ہے۔ قومیں اسی قسم کی شاعری سے زندہ رہا کرتی ہیں۔ یہ بدیہہ گوئی میں بھی اپنا نظیر آپ تھا۔ یہ قصیدہ بھی اس کی بدیہہ گوئی کا ایک ادنی نمونہ ہے۔ "ابو عمرو شیبانی" کہتا ہے کہ "اگر حارث اس قصیدے کو پورے ایک سال میں لکھتا جب بھی یہ قصیدہ اس کا شاہکار سمجھا جاتا۔"

"الاھبی" سے اشارہ عمرو بن کلثوم کے قصیدے کے اس مطلع کی طرف ہے جس کا اس سے پہلے کے صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ مطلع بھی سابق کے صفحات میں کسی جگہ لکھا جا چکا ہے۔

"السیف اصدق" سے اشارہ ہے ابو تمام کے اس مشہور قصیدے کے مطلع کی طرف جو اس نے فتح "عموریہ" کی تہنیت میں خلیفہ معتصم باللہ عباسی کے دربار میں پڑھا تھا جس سے دربار میں ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔

ایک دوسرے سے بہت ہی بعد اور فاصلہ رکھتی ہیں۔ قاعدے کے مطابق فارسی زبان کو اپنی سرحد پر قائم

السیف اصدق انباء من الکتب — فی حدہ الحد بین الجد واللعب

یعنی تلوار کتابوں کی نسبت زیادہ سچ بولتی ہے۔ اس کی باڑھ سنجیدگی اور تمسخر کی حد فاصل ہے۔ ابو تمام عہد عباسیہ میں خلیفہ معتصم باللہ کے دربار کا ایک زبردست شاعر تھا۔ اس کا نام تو حبیب تھا لیکن کنیت سے مشہور ہوا۔ باپ نصرانی النسل شمار کیا جاتا ہے۔ جاسم نامی موضع میں جو کہ عروس البلاد دمشق کے مضافات سے ہے ۱۹۲ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا ہوا۔ مصر میں پرورش پائی۔ مشہور ہے کہ جامع مسجد مصر میں جمعہ کے روز نمازیوں کو مشک سے پانی پلایا کرتا تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں کی رائے ہے کہ ایک "نجار" کے پاس رہا کرتا تھا اور اسی سے نجاری کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس کا باپ مصر کے مشہور شراب فروشوں میں شمار ہوتا تھا۔ حلیہ نگاروں کی رائے کے مطابق رنگ گندمی اور قد لانبا تھا۔ جسمیت کے لحاظ سے بھی بالکل اوسط درجے کا حکم رکھتا تھا۔ فصاحت و بلاغت اور شیریں کلامی میں دور دور مشہور تھا۔ زبان میں چونکہ لکنت کا اثر بہت تھا اس لئے حروف و الفاظ مشکل سے ادا ہوتے تھے۔ شہر "موصل" میں درمیان ماہ ذیقعدہ ۲۳۲ھ ہجری نبوی وفات پائی۔ قبر پر ایک قبہ بنوا دیا گیا تھا۔ ابو تمام اپنے عہد کا بے نظیر شاعر تھا۔ اس کو تقریباً چودہ ہزار اشعار برزبان تھے۔ بصرے میں عبدالصمد نامی ایک مشہور شاعر رہتا تھا۔ جب اس نے ابو تمام کے بصرے آنے کی خبر سنی تو اس کو اس بات کی بہت فکر ہوئی کہ کہیں اس کی آمد میری شہرت ربائی کا باعث نہ ہو اور لوگ بجائے میرے اس کی طرف متوجہ نہ ہو جائیں اس لئے اس مفہوم کا ایک شعر لکھ کر اس کے پاس روانہ کر دیا کہ تیرا آنا میرے سر آنکھوں پر لیکن نہ تو تاب وصل ہی ہے اور نہ طاقت جدائی ہے۔ بڑوں کا ظرف بھی وسیع ہوتا ہے اس لئے اس شعر کو پڑھتے ہی بصرے جانے کا ارادہ فسخ کر دیا اور کسی دوسری طرف چلا گیا۔ یہ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے متنبی کا ہم پلہ تھا۔ دیوان حماسہ جو عربی علم ادب کی جان سمجھا جاتا ہے اس کا انتخاب اسی نے کیا ہے۔ اس انتخاب کے متعلق اہل ادب کا متفقہ بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال اس انتخاب سے جس قدر معلوم ہوتا ہے خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا۔ فحول الشعراء اور الاختیارات نامی دو اور کتابیں بھی اس کی تالیف سے مشہور ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں بھی شعرائے جاہلیت کے مشہور اشعار کا انتخاب کیا ہے "سخن گفتن" سے

رہنا چاہیے تھا لیکن فارسی شعراء نے باوجود اس امتیاز و فرق کے کثرت سے عربی قصائد پر قصائد کہے۔

بہ الفاظ من شعر گفتم کہ گفت است ابوالشیص اعرابی، باستانی،

"سخن فہمی" زیادہ مشکل سمجھی جاتی ہے۔ دوسروں کے تخیلات کی گہرائیوں کو پہنچ جانا حقیقت میں بہت بڑا کمال ہے۔ یہ مادہ ہر شخص میں ودیعت نہیں کیا جاتا اور نہ یہ ضروری ہے کہ جو شخص اچھا کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو وہ "سخن سنجی" میں بھی اپنا نظیر آپ ہو۔ لیکن ہر کلیہ میں کچھ مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ ابوتمام کی ذات میں فطرت نے دونوں قسم کی خوبیاں ودیعت کی تھیں۔ اس کے شاعرانہ کمال کے متعلق کچھ لکھنا حقیقت میں آفتاب کو چراغ دکھانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ سخن فہمی کا اندازہ دیوان حماسہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک قیافہ شناس نے اس کی ذہانت وجدت اور فطانت وذکاوت کو دیکھ کر کہا تھا کہ "اس کی عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی"۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تقریباً چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ "ابوبکر صولی" نے اس کے تمام اشعار کو دیوان کی صورت میں بہ ترتیب حروف تہجی جمع کیا تھا۔ "علی بن حمزہ" اصفہانی نے بعد کو اس کا کلام انتخابی شکل میں مرتب کیا۔

"ابی الموی" سے اشارہ ہے "متنبی" کے قصیدے کی طرف۔ یہ چوتھی صدی ہجری کا بہت مشہور شاعر ہے۔ سرزمین عرب نے اس پایہ کا شاعر پیدا نہیں کیا۔ ویسے تو عرب کا ہر شاعر اپنے آپ کو مملکت شاعری کا شہنشاہ سمجھتا تھا لیکن حقیقت میں اس کو شریعت شاعری کا ایک اولوالعزم پیغمبر کہہ سکتے ہیں چنانچہ اس کو متنبی کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے دعوئے نبوت کیا تھا۔ قبیلہ "کلب" پر اس کی نبوت کا جادو چل گیا تھا اگرچہ آخر میں اس نے توبہ کر لی تھی مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کا کلام اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے "سحر مبین" کا درجہ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ سننے کے بعد سامع اس کی جامعیت سے کچھ ایسا مسحور ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے سامنے کوئی رنگ نہیں جمتا۔

۳۳۷ھ میں سب سے پہلے امیر سیف الدولہ بن حمدان کے پاس گیا۔ سیف الدولہ کی مجلس میں ہر وقت علماء و فضلاء جمع رہتے تھے۔ روزانہ علمی مباحث پر گفتگو رہتی تھی۔ ایک روز متنبی اور ابن خالویہ نحوی میں کسی مسئلے پر سخت بات چیت ہو گئی۔ ابن خالویہ نے لپک کر متنبی کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ بدقسمتی سے خالویہ کے ہاتھ میں کنجی تھی وہ متنبی کے منہ پر اس زور سے لگی کہ خون بہنے لگا اور تمام کپڑے بھی خون آلود ہو گئے۔ سیف الدولہ نے چونکہ اس واقعے پر کچھ توجہ

اس کے علاوہ شعرائے فارس نے عربی مصطلحات اور امثال کو اس کثرت سے فارسی مصرعوں میں نظم کیا ہے جو ان کے تلمذ پر بلا استشہاد دلالت کرتے ہیں۔

نہیں کی اس لئے یہ خفا ہو کر مصر میں کافور اخشیدی کے دربار میں چلا گیا۔

متنبی بہت شان و شوکت اور دبدبے والا آدمی تھا۔ چنانچہ جب کافور کے دربار میں پہنچا تو ساتھ میں بہت سے زریں کمر غلام بھی موجود تھے اور خود کمر میں تلوار لٹکائے ہوئے تھا۔ کافور سے بھی نبھی نہیں اس لئے اس کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھ کر کہیں بھاگ گیا۔ کافور نے اس کی گرفتاری کی بہت کوشش کی لیکن اس کا پتہ نہ چلا۔ چاروں طرف پھرتا ہوا ایران پہنچا۔ یہاں عضد الدولہ بن بویہ دیلمی کی مدح کرکے انعام واکرام حاصل کیا۔ یہاں سے کوفے کا رخ کیا۔ راستے میں فاتک بن ابوجہل اسدی کی سپاہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ متنبی چونکہ لڑنے کے ارادے سے روانہ نہیں ہوا تھا اس لئے اس کے پاس جمعیت بہت کم تھی اسی وجہ سے اس جنگ میں خود متنبی، اس کا بیٹا اور غلام مسمی مفلح نعمانیہ نامی مقام کے قریب موضع صافیہ میں مارے گئے۔ متنبی نے جب دشمن کا غلبہ دیکھا تو فوراً اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا مگر اس کے غلام نے چلا کر کہا کہ اب بھاگنے کا موقع نہیں ہے کیونکہ متاخرین تمہارا یہ شعر سن کر ہمیشہ ہنسا کریں گے۔

فالخیل واللیل والبیداء تعرفنی والسیف والرمح والقرطاس والقلم

اس کو بھی کچھ شرم آئی۔ پلٹ کھڑا ہوا اور مدافعانہ رنگ چھوڑ کر خود حملہ آور ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد مارا گیا۔ حقیقت میں یہ شعر ہی اس کے قتل کا باعث ہوا کیونکہ نہ یہ شعر موقعے پر یاد دلایا جاتا اور نہ وہ قتل ہوتا۔ ۳۰۳ھ میں شہر کوفہ محلہ کندی میں پیدا ہوا اور ۳۵۴ھ ماہ رمضان میں قتل ہوا۔ اس حساب سے اکیاون سال کی عمر پائی۔ اس کو نظم و نثر دونوں میں یکساں مہارت اور لغات پر زبردست عبور تھا۔ جو بات کبھی دریافت کی جاتی فوراً اس کا جواب دے دیا کرتا۔ بعض لوگ اس کے کلام کو ابو تمام اور دوسرے تمام متاخرین پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک ابو تمام کے بعد اس کا مرتبہ ہے۔ اس کا دیوان عربی مدارس کے آخری درجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ طبیعت چونکہ دشوار پسند تھی اس لئے کلام میں سنگلاخی موجود ہے۔ بہت سے لوگوں نے

نکو گوئی نکو گفتہ است در ذات — کہ "التوحید اسقاط الاضافات"

"قم باذنی و قم باذن اللہ" — ہر دو یک نغمہ آمد از لب یار

"انظرونا نقتبس من نورکم" کے گفت چرخ — کافتاب از آفتاب ہمت کرد اقتباس

زلزلۂ قہر تو شان کردیست — "زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم"

آدم از نسبت وجود تو یافت — "اختصاص خلقتہ بیدی"

میر آب ست و حق ہمی گوید — کہ "من الماء کل شیٔ حیٔ"

بعد ازیں من چہ بر زباں آرم — چہ کنم "آخر الدواء الکی"

محتسب خم شکست و بندہ سرش — "السن بالسن والجروح قصاص"

فارسی شاعری میں تلمیحات کا جتنا ذخیرہ ہے اس میں پچانوے فی صدی حصہ عربی تلمیحات کا شامل ہے۔ بحرِ عشق کے شناور و غواص جس قدر فارسی شاعری میں ممتاز نظر آتے ہیں وہ تقریباً سب کے سب عربی نژاد ہیں مشکل سے دو فی صدی ایسے نظر آئیں گے جن کی پرورش اور تربیت کا فخر مادرِ ایران کو حاصل ہوگا۔

ویسے تو ایران کی سدا بہار سرزمین میں ہزاروں شاہدان پری پیکر پیدا ہوئے اور لاکھوں عاشقانِ خستہ جگر نے ان کے اندازِ دلربایانہ پر اپنی قیمتی اور پیاری جانیں جان آفریں کے سپرد کیں مگر حقیقت میں وہ سوز و کیف اور سچائی ان میں نہ تھی جو صحیفۂ عشق میں ان کو ممتاز شخصیت کے ساتھ پیش کرتی اور دنیا ان سے ایک "ہیرو" کی حیثیت سے روشناس ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ فارسی شاعری نے جن عشقیہ تلمیحات اور واقعات کو اپنے لیے باعث انتخاب سمجھا وہ مجنوں، لیلیٰ، سلمیٰ، وامق، عذرا، معبد، سعد، اسما، رباب، عزۃ اور ثبینہ کا انتخاب تھا۔

اس کے دیوان کی شرحیں لکھی ہیں۔ ایک شخص کا بیان ہے کہ میں نے متنبی کے دیوان کی چالیس مطول اور مختصر شرحیں دیکھی ہیں۔ اتنی شرحیں مشکل سے کسی کے کلام کی لکھی گئی ہوں گی

(مضمون نگار)

قاآنی شبہ گون چوں شب عاشق گرفتہ چوں دل عاشق | باشک دیدۂ وامق، برنگ طرۂ عذرا
فشاند بر چمن ژالہ ودماند از دمن لالہ | چناں از دل کشد نالہ کہ سعد از فرقت اسما

خاقانی اسمائے طبع من نکاح ثنائے اوست | زاں فال سعد زاختر اسما بر آورم
مجنوں خموش، ناقۂ لیلیٰ بہر قدم | عرض نیاز او، بزبان جرس کند

اور آخر میں پیچ کر ان الفاظ میں اس قدر وسعت و ہمنا ئی پیدا ہوگئی کہ عاشق اور مجنوں، معشوق اور لیلیٰ مترادف المعنی الفاظ متصور ہونے لگے جیسے "لیلائے من" بمعنی "معشوق من" اور "مجنون تو" بمعنی "عاشق تو":

کام جویاں دامن معشوق وارند آرزو | ورنہ لیلیٰ دوست را خود دامن صحرا بس است
موسیٰ ام و راضی بہ تجلی نشوم | مجنونم[1] و خوش بوصل لیلیٰ[2] نشوم

انبیائے بنی اسرائیل کے ہزاروں لاکھوں قصے اور واقعات فارسی شاعری کا "راس المال" ہیں اور یہی وہ واقعات ہیں جنھوں نے فارسی شاعری میں تلمیحات کا ایک گراں مایہ ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ نوحؑ کا طوفان، موسیٰؑ کا عصا، اسمٰعیلؑ کی قربانی، ادریسؑ کا تدبر، خلیلؑ کی بت شکنی، ایوبؑ کا صبر، سلیمانؑ کا تخت، عیسیٰؑ کا اعجاز، زکریاؑ کی روپوشی، داؤدؑ کا نغمہ، یوسفؑ کا حسن، یعقوبؑ کا ہجر اور ان کے متعلقات مثلاً ید بیضا، وادیِ ایمن، تجلی طور، چاہ یوسفؑ، تعمیر کعبہ، گلزار خلیلؑ، حجر اسود، فسانۂ زلیخا، مصر کی عزیزی، پیرہن یوسفؑ، فرعون کی غرقابی اور موسیٰؑ کی پرورش حقیقت میں یہ تمام باتیں فارسی شاعری کی جان ہیں۔ چند مثالوں سے یہ تمام باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں گی۔

ہر دم مرا بعیسیٰ تازہ است حاملہ | زاں مژدہ ے چو مریم عذرا بر آورم خاقانی

نہاں خانۂ دماغ میں مضامین بلند موجود ہونے کا اشارہ "عیسیٰ تازہ" سے کیا ہے اور اسی مناسبت سے دوسرے مصرعے میں لفظ "مریم" کا اضافہ کیا ہے۔

---

[1] بمعنی عاشق [2] بمعنی معشوق

زیں روئے چوں کرامت مریمؑ بباغ عمر　　　　از نخل خشک خوشۂ خرما برآورم　(خاقانی)

حضرت "مریمؑ" کو جب درد زہ شروع ہوا تو آپ خرما کے ایک خشک درخت کے نیچے تشریف لائیں اور وہیں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت ہوئی۔ ان کی برکت سے وہ درخت سرسبز اور ثمردار ہوگیا لیکن شاعر نے یہاں پر "نخل خشک" سے "قلم" اور "خوشۂ خرما" سے اپنا "شیریں کلام" مراد لیا ہے۔

چہ عقل را بدست امانی گرو کنم　　　　چہ ارہ بر سر زکریاؑ برآورم

زکریا علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خالو تھے۔ جب ولادت عیسیٰؑ پر یہودی درپے آزار مریمؑ ہوئے تو زکریاؑ نے عیسیٰؑ اور مریمؑ کو یوسف نجار کے ہمراہ مصر پہنچا دیا اور خود مفقود الخبر ہوگئے۔ جب مریمؑ و عیسیٰؑ بیس برس کے بعد واپس آئے تو زکریاؑ بھی آگئے۔ یہودی چونکہ زکریاؑ سے ناراض تھے اس لئے ان کے قتل کا ارادہ کرکے حملہ آور ہوئے۔ زکریاؑ بھاگے۔ مشہور ہے کہ راستے میں ایک درخت تھا۔ اس سے انھوں نے پناہ چاہی۔ درخت پھٹا اور زکریاؑ اس میں داخل ہوگئے اور درخت پھر برابر ہوگیا۔ بعض کہتے ہیں کہ عبا کا گوشہ باہر رہ گیا تھا اور بعض کے نزدیک شیطان نے یہودیوں کو زکریاؑ کا درخت کے اندر ہونا بتایا اور یہودیوں نے جب درخت کو آرے سے چیرا تو اسی کے ساتھ زکریاؑ کے بھی دو ٹکڑے ہوگئے۔ خاقانی نے اس شعر میں "عقل" کا اشارہ "زکریاؑ" سے اور "امانی" کا "کنایہ" آرے سے کیا ہے۔

ہمہ شبہائے غم آبستن روز طرب است　　　　یوسفؑ روز بچاہ شب یلدا بینند　(خاقانی)

حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ پھر ایک قافلہ ان کو نکال لے گیا اور وہ عزیز مصر ہوگئے لیکن شاعر یہاں پر "یوسف روز" کا کنایہ آفتاب سے کرتا ہے۔

آبائے علویند مرا خصم چوں خلیلؑ　　　　بانگ ابا ز نسبت آبا برآورم

ابراہیم خلیل اللہؑ کے باپ دادا آپ کی توحید پرستی کے سخت دشمن تھے۔ وہ آپ کو اپنے قدیم طریقوں پر چلانا چاہتے تھے لیکن آپ نے مستقل مزاجی سے ان کے رسوم و قیود کے طریقوں کو ٹھکرا دیا اور صاف الفاظ میں اعلان کردیا "اعتزلکم وما تدعون من دون اللہ" (میں تم کو اور ان کو جنھیں تم علاوہ خدا کے پکارتے ہو چھوڑتا ہوں) لیکن شاعر نے اس موقع پر "آبائے علوی" سے استعارہ کیا ہے افلاک

یا سبعہ سیارہ کی طرف کیونکہ ان کی تاثیر اور اربعہ عناصر (امہات سفلی) کے تاثر سے موالید ثلاثہ وجود میں آتے ہیں۔ مطلب اس شعر کا یہ ہوا کہ جس طرح خلیل اللہ کے "آبا" ان کے دشمن تھے اسی طرح یہ آبائے علوی میرے بھی دشمن ہیں اور جس طرح ابراہیم خلیل اللہ نے اپنے آبا کو چھوڑ دیا تھا اسی طرح میں بھی ان آبائے علوی سے ترک تعلق کر لوں گا۔

خارا چو مار بر کشم و پس بیک عصا — دہ چشمہ چوں کلیم ز خارا بر آورم

"بیک عصا دہ چشمہ" سے اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک معجزے کی طرف جیسا کہ قرآن میں ہے "فقلنا اضرب بعصاک الحجر فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا" (پس ہم نے (خدا نے) کہا (موسیٰ) سے کہ تم اپنا عصا پتھر پر مارو، پس ابل پڑے اس پتھر سے بارہ چشمے) لیکن شاعر اس موقعے پر مراد لیتا ہے کہ ترک آرائش دنیوی کے بعد میں صاحب کرامت و اعجاز ہو جاؤں گا۔ سارا مضمون شاعر نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعۂ ضرب عصا سے پیدا کیا ہے۔

اگر آج ان چیزوں کو فارسی شاعری سے علیحدہ کر دیا جائے تو فارسی شاعری کی حیثیت جسم بے روح یا گل بے رنگ و بو کی سی رہ جائے گی۔ اس کا زیادہ تر نشہ اور صہبائیت صرف ان چیزوں کے اثر و نفوذ اور آمیزش کا مرہون منت ہے۔ ساری خوشنمائی اور آب و رنگ ان کے امتزاج پر قائم ہے۔ ان کو علیحدہ کرنے کے بعد اس عمارت کی ساری مینا کاری بے آب سی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر نفس شاعری سے نظر ہٹا لی جائے اور تمام فارسی لٹریچر پر بھی ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ فارسی علم و ادب کی بنیاد ہی عربی زمین پر قائم ہوتی ہے۔ سینکڑوں تلمیحیں، تمثیلیں، کنائے، تشبیہیں اور استعارے عربی تخیل کے منت کش ہیں۔

اس کے علاوہ مذہبی اعتقادات و تخیلات کے متعلق جس قدر اصطلاحات پائی جاتی ہیں ان سب کا ماخذ عربی ہے مثلاً شراب طہور، جماد، سدرہ، طوبیٰ، معراج، صراط، صور اسرافیل، توبہ، تکبیر، نامہ اعمال، حور، غلمان، حوض و کوثر، جنت، دوزخ، معجزہ یہ سب مذہبی اصطلاحات و تلمیحات ہیں لیکن اس سدا بہار سرزمین میں پہنچ کر سینکڑوں قسم کی خوشنما شاخیں ان سے پھوٹیں جس طرح اسرائیلی قصص و حکایات فارسی شاعری کی وسیع

وعریض عمارت کے لیے بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح عرب کی مذہبی مصطلحات بھی فارسی شاعری کے مرقعے میں رنگ آمیزی اور نقش و نگار کا کام دیتی ہیں۔ فارسی شاعری کے گلدستے کا سارا رنگ انھی چیزوں کے وجود پر قائم ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

چوں در تنور شرق پزد نان گرم چرخ آواز روزہ بر ہمہ اعضا برآورم (خاقانی)

لفظ روزہ کی مناسبت سے شعر مکمل کیا گیا ہے۔

چند از نعیم سبعۂ الوان چو کافراں کار جحیم سبعۂ امعا برآورم (خاقانی)

دوزخ کے سات طبقات مشہور ہیں اور آنتیں بھی سات ہیں۔ دوزخ ہمیشہ "ہل من مزید" کہتی رہتی ہے اور آنتیں بھی ہر وقت غذا حاصل کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہیں۔ انھی طبقات دوزخ کی مناسبت سے اتنا وسیع وعریض مضمون پیدا ہوا۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم
کفر و ایماں نبود شرط نظیری در عشق بتو کافر بنماید کہ ولایت دارد (نظیری)

ان دونوں شعروں کی بنیاد صرف کفر و ایماں کے الفاظ پر قائم ہے اور ساری خوشنمائی بھی صرف انھیں الفاظ کے پردے میں مضمر ہے۔

در ظاہرم جنابت و در باطن است حیض آں بہ کہ غسل ہر دو بہ یک جا برآورم (خاقانی)

دونوں لفظ خاص مذہبی مصطلحات سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ "ناپاکی" کے لفظ سے اس مفہوم کو ادا کیا جا سکتا تھا۔

گر مدحت تو بخاک سراندیب ادا کنم کوثر ز خاک آدم و حوا برآورم

دوسرے مصرعے میں دریا یا سمندر نہیں کہا بلکہ "کوثر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ سمندر وغیرہ کہنے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو لفظ "کوثر" کے مفہوم میں پنہاں ہے۔ "کوثر" کے پانی میں مذہبی معتقدات کی بنا پر جو شیرینی و لطافت ہے وہ دریا اور سمندر کے پانی میں نہیں۔ اگر یہ لفظ نہ کہا جاتا تو مفہوم میں اتنی وسعت و خوبی پیدا نہ ہوتی۔

عارف ہمہ اسلام خراب ست وہم از کفر ‏ ‏ ‏ ‏ پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

اسلام، کفر، حرم یہ سب مذہبی مصطلحات ہیں اور انہی کے تخیل سے یہ معرکۃ الآرا شعر وجود میں آیا۔

دانم بیقیں، لطف تو بیش از قہرت ‏ ‏ ‏ ‏ زیرا کہ نعیم ہشت و ہفت ست جحیم (نادرا تبریزی)

"ہشت نعیم" اور "ہفت جحیم" کی مناسبت سے زیادتی لطف بر قہر ثابت کی گئی ہے اور ثبوت کے تمام لوازمات مذہبی معتقدات سے ماخوذ ہیں۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست ‏ ‏ ‏ ‏ اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد معرفت الٰہی کی طرف یوں نہیں مائل ہوتے اس لئے حور و جنت کا لالچ دیا جاتا ہے۔ اس لالچ سے جب وہ ذکر میں مشغول ہو جاتے ہیں تو پھر رفتہ رفتہ جذب الٰہی پیدا ہو جاتا ہے۔

حور و جنت کے الفاظ جو کہ اس شعر کا سرمایہ ہیں خاص مذہبی مصطلحات سے تعلق رکھتے ہیں۔

(باقی آیندہ)

عقل

بہ پیر

پردہ

کیا کوئی ذی عقل اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ مذہب حق جس نے عورت کو غلامی کے درجے سے نکال کر آزادی کے درجے پر پہنچایا اس ظلم و تشدد کو روا رکھ سکتا تھا کہ عورت کو قدرت کی تمام نعمتوں حتیٰ کہ صاف اور تازہ ہوا سے بھی محروم کر کے جس سے جانور تک فائدہ اٹھائیں تنگ و تاریک قید خانوں میں تمام عمر کے واسطے بند کر دیا جائے۔ کلام مجید میں عورتوں کو باہر پھرنے کی اور مثل مردوں کے قدرت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اتنی ہی آزادی دی گئی ہے جتنی مردوں کو دی گئی ہے یعنی دونوں کے واسطے باہر پھرنے کے متعلق یکساں الفاظ میں احکام نازل ہوئے ہیں " ۲۴: ۳۰ و ۳۱ قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون ٥ وقل للمؤمنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن .... (اے نبی) کہدو ایمان والے مردوں سے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے اعضائے جنسی کو چھپائیں، یہ ان کے واسطے پاکی ہے، تحقیق اللہ واقف ہے اس سے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور کہدو ایمان والی عورتوں سے کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے اعضائے جنسی کو چھپائیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں بجز اس کے جو خود بخود ظاہر ہو اور اوڑھیں اپنا سر جامہ اپنے پستانوں پر اور اپنی زینت کو نہ ظاہر کریں سوائے اپنے شوہروں کے .... " اگر عورت کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اجازت نہ ہوتی تو اس کے متعلق احتیاط کی ہدایت اس ہدایت کے ساتھ ساتھ نہ بیان کی جاتی جو مردوں کے متعلق ہے اور نہ انھیں الفاظ میں بیان کی جاتی جن الفاظ میں مردوں کے متعلق بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جبکہ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تسلیم کر لی جائے کیونکہ اپنے گھر میں نظریں نیچی رکھنے کے کوئی معنی نہیں نکلتے اور پھر خاص کر جب مرد اور عورت دونوں کے واسطے نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت ہے تو وہ اسی حالت میں مفید ہو سکتی ہے جب

دونوں کی نظریں ملنے کا احتمال ہو اور نظریں ملنے کا احتمال اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب دونوں مکان سے باہر نکلیں یا اور کسی طریقے سے ایک دوسرے کے مقابل ہوں لہذا نظریں نیچی رکھنے کی ہدایت خود اس بات کی دلیل ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو یکساں طور پر باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ اگر عورت کو مثل مردوں کے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی تو آگے چل کر جو اس آیت میں ان لوگوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن پر عورت اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے جن میں شوہر اور قریبی رشتہ دار اور غلام بھی شامل ہیں اس تفصیل کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس تفصیل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان مفصلہ اشخاص پر عورت اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے اور جن اشخاص کی تفصیل بیان کی گئی ہے وہ وہی لوگ ہیں جو ایک خاندان میں شمار کئے جاتے ہیں اور عام طور پر ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ اس لئے صاف الفاظ میں اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ عورت اپنے والدین یا شوہر کے گھر میں جہاں اس کے قریب ترین عزیز و اقارب رہتے ہیں اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے لیکن اپنے عزیز و اقارب کے مکان سے باہر بازاروں یا دوست احباب کے مکانوں پر جب جائے تو اپنی نظریں نیچی رکھے اور اپنی زینت کو دانستہ یا ارادتاً ظاہر نہ کرے۔ زینت کے معنی بعض مفسرین نے جسمانی خوبصورتی کے لئے ہیں اور بعض نے زیورات کے لئے ہیں اور اس آیت کے آخری جملے سے بھی زینت کے معنی زیور ہی کے نکلتے ہیں جہاں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ " **ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن** " (اور ان کو اپنے پیر زمین پر اس طرح نہ مارنے چاہئیں جس سے کہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر ہو) یہاں زینت سے وہی زیور مراد ہو سکتا ہے جو پیر مارنے سے بجے مثلاً جھانجیں وغیرہ۔ لہذا اگر زینت کے معنی صرف زیور ہی کے لئے جائیں جب بھی یہ مطلب بالکل صاف ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکلنے ہی کی حالت میں اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی زینت کو ارادتاً ظاہر نہ کرے کیونکہ اپنے باپ یا شوہر کے مکان میں جہاں وہ عام طور پر رہتی ہے وہ اپنی زینت بھی ظاہر کر سکتی ہے۔ اگر ہم زینت میں چہرہ بھی شامل کر لیں جیسا کہ بعض مفسرین کرتے ہیں تو اس آیت کے یہ معنی زیادہ قرین قیاس ہوں گے کہ عورت باہر نکلنے کی حالت میں صرف اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھول سکتی ہے باقی اور جسم کی سجاوٹ کو خواہ وہ زیورات کے ذریعے سے ہو یا کسی اور ذریعے سے دانستہ یا ارادتاً دوسروں پر ظاہر نہ کرے کیونکہ کشمکش حیات اس

بات کی مقتضی ہے کہ انسان اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھلے رکھے ورنہ اس کو اپنا کام سرانجام دینے میں مشکلات پیش آئیں گی۔ غرضکہ اس آیت پر جس پہلو سے نظر کی جائے عورت کا مثل مرد کے باہر پھرنے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے اور یہی نہیں کہ محض باہر پھرنے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے بلکہ چہرہ اور ہاتھ پیر کھول کر جد وجہد زندگی میں اپنے حسب حیثیت حصہ لینے کا حق تسلیم کرنا پڑتا ہے ورنہ اس آیت کی تمام ہدایتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ خود آنحضرت صلعم نے اس کے متعلق فرمایا " عائشہ قالت دخلت اسما بنت ابی بکر علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعلیہا ثیاب رقاق فاعرض عنہا وقال یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لن تصلح ان یری منہا الا ھذا وھذا واشار الی وجہہ وکفیہا " ترجمہ اسما بنت ابی بکر رسول اللہ صلعم کے پاس آئیں ان پر کپڑا باریک تھا۔ آپ نے ان سے رخ پھیر لیا اور فرمایا اے اسما عورت کو جب ایام ماہواری آنے لگیں یعنی وہ بالغ ہو جائے تو جائز نہیں کہ اس کا بدن دیکھا جائے سوائے اس کے اور اس کے اور اشارہ اپنے منہ اور ہتھیلیوں کی طرف کیا۔ ابوداؤد"۔ اس حدیث نے آیتہ مذکورہ بالا کے معنی بالکل صاف کر دئے کہ عورت جب مکان سے باہر نکلے تو اس کا تمام جسم سوائے چہرے اور ہاتھ پیروں کے ایسے کپڑے سے ڈھکا ہونا چاہئے جس سے اس کے بدن کی زیب و زینت ظاہر نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کلام مجید کی نوعیت ہی کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی انھوں نے الفاظ پر زیادہ زور دیا اور روح یا جوہر کو پس پشت ڈال دیا۔ کلام مجید نے محض اصول زندگی بتلانے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان اصولوں کو سمجھانے کے لئے کچھ احکام عمل بھی پیش کئے تاکہ وہ اصول دیگر مذاہب کے اصول کی طرح محض زینت کتاب ہی نہ رہیں بلکہ عملی طور پر سمجھ میں آجائیں اور یہ لازمی بات تھی کہ جتنے نمونے عمل کے لئے پیش کئے جائیں وہ گرم ریگستانی جزیرہ نمائے عرب کی آج سے چودہ سو برس پہلے کی نیم وحشی قوم کے مقامی حالات، دماغی تصورات اور رسم ورواج کے مطابق ہی ہوں ورنہ وہ ان کے سمجھنے اور ان پر عمل کرنے سے قاصر رہتے۔ دنیا کا کوئی معلم ایک پہلی جماعت کے طالب علم کو جو ابھی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہا ہے بی۔ اے کی جماعت کا نصاب کسی صورت سے نہیں سمجھا سکتا لہذا نفسی آزادی کو فطرت کے مطابق مفید بنانے کے لئے شرم و حیا کا اخلاقی اور بنیادی اصول سمجھانے کی غرض سے جو عملی احکام

کلام مجید میں نازل ہوئے وہ گرم ریگستانی جزیرہ نمائے عرب کی مقامی آب وہوا، رسم و رواج اور پوشاک کے اعتبار سے نازل ہوئے اور اس لئے پستان کو سرجامہ سے ڈھکنے کا لفظ استعمال کیا گیا اور زینت کو اراداتاً ظاہر کرنے کی ممانعت کے لئے پیر کو زمین پر مارنے کا لفظ استعمال کیا گیا لیکن یہ الفاظ محض تشبیہی ہیں پستان کے ڈھکنے کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں استعمال ہوسکتی ہیں جو جس زمانے اور جس ملک میں وہاں کی آب وہوا اور تہذیب کے مطابق رائج ہوں اور اسی طرح زینت کو اراداتاً ظاہر کرنے کی ممانعت سے صرف زیور کا بجانا ہی مراد نہیں لیا جاسکتا بلکہ وہ تمام مصنوعی جسمانی بناؤ سنگار اور تمام بے حیائی کی حرکات جن سے خواہشات جنسی کو تحریک ہوتی ہو مراد ہیں۔ لہٰذا اس تمام آیت کے مفہوم پر جب ہم کلام مجید کی تمام خصوصیات، زمانۂ نزول اور جائے نزول کو ملحوظ رکھتے ہوئے غور کریں تو سوائے اس کے اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا کہ عورت کو مثل مرد کے اپنا چہرہ اور ہاتھ پیر کھول کر باہر پھرنے کی عام اجازت ہے اور اپنے ملک کی مروجہ پوشاک پہن کر اور اپنے جسم کی اپنی حیثیت اور ملکی رواج کے مطابق زیب و زینت کرکے زندگی کے ہر جائز کام میں جائز حصہ اپنی لیاقت کے مطابق لے سکتی ہے البتہ اس کو اراداتاً کوئی حرکت اس قسم کی نکرنی چاہئے جس سے مرد کی خواہشات جنسی کو تحریک ہوتی ہو جس میں باریک پوشاک بھی شامل ہے۔

کلام مجید سے عورتوں کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اور کشمکش حیات میں اپنی حسب حیثیت حصہ لینے کی اجازت ثابت کرنے کے بعد اور قول رسول اللہ صلعم سے اس بات کی تائید کرنے کے بعد کہ عورت اپنا چہرہ اور ہاتھ کھول کر اور ایسے کپڑے پہن کر جس میں جسم اندر سے نظر نہ آئے زندگی کے ہر کام میں حصہ لے سکتی ہے۔ اب ہم کلام مجید ہی سے یہ ثابت کریں گے کہ عورتوں کو مکان کے اندر مقید رکھنا ان کی بے عزتی کا مترادف ہے۔ کلام مجید میں یہ حکم نازل ہوا ہے " ۴: ۱۵ والتی یاتین الفاحشۃ من نسائکم فاستشھدوا علیھن اربعۃ منکم فان شھدوا فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا ۰" اور تمہاری عورتوں میں سے جو فحش کی مرتکب ہوں ان کے واسطے اپنے درمیان سے چار گواہ لاؤ تب اگر وہ گواہی دیں تو ان عورتوں کو مکان سے باہر نہ نکلنے دو یہاں تک کہ

موت ان کو لے جائے یا اللہ کوئی دوسرا راستہ نکال دے۔" اس آیت کی رو سے عورت کو زنا کاری کی پاداش میں چار مسلمانوں کی گواہی پر تمام عمر کے واسطے مکان سے باہر نہ نکلنے دئے جانے کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ پس اگر عورت کو عام طور پر باہر نکلنے کی اجازت مثل مردوں کے نہ ہوتی تو اس کو مکان سے باہر نہ نکلنے دئے جانے کی سزا بے معنی ہو جاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کو مکان سے باہر نہ نکلنے دینا یا اس کو مثل قیدی کے چاروں طرف سے بند کر کے ایک جیلخانے سے دوسرے جیلخانے میں برقعہ، ڈولی پالکی اور بند سواری کے اندر لے جانا اس کی فحش جرم کی سزا کا مترادف ہے جو کہ صرف اسی حالت میں دی جا سکتی ہے جبکہ چار مومن اس بات کی گواہی دیں کہ یہ عورت فاحشہ ہے اور چار مسلمانوں کی گواہی کی شرط یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت کی باہر پھرنے کی آزادی کو اسلام نے کس قدر قیمتی سمجھا ہے اور دوسرے یہ کہ چار مسلمانوں کی گواہی کی شرط خود اس قدر سخت ہے کہ ۹۹ فی صدی حالتوں میں چار مسلمان گواہوں کا ملنا قریب قریب ناممکن ہے جس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کا باہر پھرنے کی آزادی کا حق کس قدر مقدس اور قابل قدر ہے کہ ۹۹ فی صدی حالتوں میں اس پر جرم زنا قائم ہو جانے کے بعد بھی اس کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

کلام مجید اور حدیث سے عورتوں کو مثل مردوں کے باہر پھرنے کی عام اجازت اور ان کو اس سے بے وجہ محروم کرنا مردوں کا ظلم اور عورت کی فحش کاری کی سزا کے مترادف ثابت کرنے کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلمانان سلف میں پردے کا ایسا ہی رواج تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق ہم چند تاریخی واقعات نقل کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عام ملکی امن کی حالت میں مسلمان عورتوں کو باہر پھرنے کی اتنی ہی آزادی تھی جتنی مردوں کو بلکہ یہاں تک کہ جنگ کے زمانے میں بھی عورتیں لڑائی کے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب ثانی جلد چہارم میں جنگ قادسیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "صبح کے وقت بعد نماز فجر سعدؓ نے شہدا کو دفن کرایا اور زخمیوں کو عورتوں کے سپرد کیا۔ وہ ان کی تیمارداری میں مصروف ہوئیں۔" اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں عورتیں جنگی شفاخانوں میں تیمارداری کا کام کیا کرتی تھیں۔ ہسپانیہ میں بھی جہاں آفتاب اسلام اپنی پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا عورتوں کی مثل مردوں کے باہر پھرنے کی مثالیں تاریخ

میں نظر آتی ہیں۔ فاضل ہم عصر ایس. خدا بخش اپنی کتاب "اسلامک سولزیشن" جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں کہ "قرطبہ کی ایک مسلمان خاتون لبانا خلیفۂ الحاکم کی پرائیویٹ سکریٹری تھیں اور اشبیلیہ کے یعقوب الانصاری کی دختر مریم جامعۂ ہسپانیہ میں فصاحت، نظم اور علم ادب کی معلمہ تھیں" جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ سابقہ میں مسلمان عورتیں محض باہر ہی نہیں پھرتی تھیں بلکہ علوم وفنون میں بھی مثل مردوں کے کمال حاصل کرتی تھیں اور دوسرے مختلف قومی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء کے اردو کے "ریویو آف ریلیجنز" میں سید امیر علی مرحوم کی "تاریخ اسلام" کے کچھ اقتباس کا ترجمہ شائع ہوا ہے جو ہم بجنسہ اس مقام پر نقل کئے دیتے ہیں:-

"عباسیوں کے ماتحت عورتوں کا درجہ قریباً وہی تھا جو امیہ خاندان کے ماتحت رہا۔ دراصل سخت پردے کا موجودہ طریق اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا جب تک کہ قادر باللہ حکمراں نہ ہوا کیونکہ اس بادشاہ کی مرضی یہ تھی کہ مسلمان زیادہ ترقی نہ کریں ورنہ منصور کے زمانے میں ہم پڑھتے ہیں کہ دو شاہی بیگمات جو دراصل اس کی بھتیجیاں تھیں زرہ بکتر پہن کر بازنطین کی لڑائی پر گئیں۔ رشید کے زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کی عورتیں گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کے لئے جاتی تھیں اور فوج کی رہنمائی بھی کرتی تھیں۔ مقتدر کی والدہ عدالت اعلیٰ کی صدر تھیں اور وہ نہ صرف درخواستیں سنتیں بلکہ سفیروں اور بیرونی ممالک کے معززین کو شرف باریابی بخشتیں اور متوکل کے زمانے تک عورتیں اپنی علمی اور سیاسی مجالس منعقد کرتی رہیں۔ رشید اور مامون کے عہد حکومت میں عورتیں علم و حکمت میں مردوں کا مقابلہ کرتیں، شعر و شاعری سے شغل رکھتیں اور ہر طرح سے سوسائٹی کی زیب و زینت تھیں۔ ملکہ زبیدہ ایک عالم فاضل عورت تھی اور ایک قابل سخنگو۔ اس نے رشید کو کئی ایک منظوم مکتوب ارسال کئے اور جو خطوط اس نے مامون کو، اس کے لڑکے امین کی وفات کے بعد لکھے تھے ان سے بھی اس کی قابلیت ترشح ہوتی ہے۔ عبیدہ طنبوریہ جو مامون اور معتصم کے زمانے میں رہتی تھی کتاب "الاغانی"

کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ ایک حسین وجمیل عورت تھی جس میں نیکی اور قابلیت کوٹ کوٹ
کر بھری ہوئی تھی۔ اس کو طنبور بہت اچھا بجانا آتا تھا اور اس لئے اس کا نام طنبوریہ پڑگیا۔
اس کو شعر بھی کہنے آتے تھے۔ فضل ایک سخن گو اور شاعرہ تھی۔ یہ متوکل کے زمانہ میں ہوئی
ہے اور کچھ عرصے تک اس کے محلوں میں رہی ہے۔ متوکل کے انتخاب کے بعد اس
نے شادی کر لی اور پھر بغداد ہی میں رہنے لگی۔ اس کی شاعری ہمعصر شاعروں سے
مقابلہ کرتی ہے۔ شیخا شہدا جو چھٹے سن ہجری میں ہوئی ہے بغداد میں تاریخ پر لکچر دیا کرتی
تھی اور اپنی خوشخطی کے لئے مشہور تھی۔ زینب آم المویدمشہور مصنف تھی جو بارھویں صدی
عیسوی میں ہوئی ہے۔ اس نے قانون کے علماء اور فضلاء سے اپنی قابلیت کی ڈگریاں
حاصل کر لی تھیں اور قانون پڑھانے کے لئے لائسنس بھی لے لیا تھا۔ صلاح الدین
کے زمانے میں تقیہ ایک عورت رہتی تھی جو احادیث پر لکچر دیا کرتی تھی۔ یہ بھی ایک نامور
شاعرہ تھی۔ امیر اسامہ کے اوراق بتلاتے ہیں کہ عربوں کے عہد حکومت میں عورتوں کا
درجہ کیا تھا۔ گیارھویں صدی کے پرآشوب زمانے میں جب مغربی ایشیا کی سیاسی اور
معاشرتی حالت انحلال میں تھی عورتیں اپنی بہادری اور جرأت کے لئے شہرۂ آفاق تھیں۔"

ان تمام تاریخی واقعات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ سابقہ میں عورت زندگی کے ہر کام میں
حصہ لینے کے لئے مرد کی طرح سے قطعاً آزاد تھی اور کوئی پردے کا رواج نہ تھا۔ سید امیر علی مرحوم کے منقولہ
بالا اقتباس سے صرف اس قدر واضح ہوتا ہے کہ قادر باللہ کے زمانے میں شاہی حکم سے مسلمانوں میں پردے
کا رواج شروع ہوا۔ ممکن ہے قادر باللہ نے پردہ سختی کے ساتھ رائج کیا ہو لیکن جہاں تک فطرت انسانی
کا تعلق ہے پردے کے رواج کی ذمہ داری انسان کی خواہش ملکیت وقبضے پر عاید ہوتی ہے۔ انسان میں
یہ فطرتی مادہ موجود ہے کہ وہ کمزور چیز پر اپنی ملکیت اور قبضہ جتانے سے خوش ہوتا ہے اور مختلف ممالک میں
اس ملکیت اور قبضے کی خواہش کا اظہار مختلف طریقوں سے ہوتا رہا۔ ہندوستان میں کمزور عورت کو خاوند کے
مرنے کے بعد زندہ رہنے کے حق سے ہی محروم کر دیا گیا۔ یورپ میں عورت کو شادی کے بعد اپنے مال ومتاع

پر بھی اختیار نہیں دیا گیا یہاں تک کہ اس کا نام بھی علیحدہ نہیں رہا بلکہ خاوند کے نام میں محو ہو گیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنے خاوند کی ملکیت ہے۔ چونکہ اسلام میں عورت کے ان حقوق کی تشریح کردی گئی تھی اس لئے ملکیت اور قبضے کی خواہش پردے کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اول اول چند متمول لوگ ہی اپنی عورتوں کو چار دیواری کے اندر مقید رکھ سکتے تھے، غربا کے لئے یہ عام طور پر ممکن نہ تھا کیونکہ وہ بغیر اپنی عورتوں کی امداد کے اپنی روزی پیدا نہیں کر سکتے تھے لیکن رفتہ رفتہ پردہ ایک امارت اور عالی نسبی کی دلیل ہوگئی اور چونکہ ہر انسان میں اپنے آپ کو دوسروں پر بڑا اور عالی نسب ظاہر کرنے کا مادہ ہوتا ہے اس لئے تھوڑے ہی عرصے میں پردہ بالکل عام ہو گیا۔ چنانچہ ہم آج بھی یہ دیکھتے ہیں کہ غربا اور نیچ قوموں میں پردہ عام نہیں ہے لیکن ان میں سے جہاں کوئی دولت مند ہو گیا اس کے یہاں فوراً پردہ شروع ہو جاتا ہے جو اس بات کی ایک نہایت روشن دلیل ہے کہ پردہ دولت مندی کے لوازمات میں سے ایک لوازمہ ہے اور جب پردے کے رواج کو اتنا عرصہ گذر گیا کہ وہ ایک بزرگوں کی رسم ہو گئی اور اس کے رواج کے آغاز و اسباب کا دریافت کرنا ناممکن ہو گیا تو اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے مذہب کی آڑ تلاش کی گئی جو ہر مکروہ رسم کے جواز کے ثابت کرنے کا آسان ترین اور مضبوط ترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ امہات المومنین کی ایک مثال بھی موجود تھی لہذا پردے کو نہایت آسانی کے ساتھ دربار علمائے دین سے منظوری حاصل ہو گئی۔ پیغمبر خدا صلعم کا اپنی ازواج مطہرات کو پردے میں رکھنا یہ ثابت نہیں کرتا کہ آپ نے تمام عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم دے دیا ہے۔ تمام غیر محرم عورتیں آپ کے سامنے آتی تھیں اور آپ سے ہم کلام ہوتی تھیں، غزوات میں آپ کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوتی تھیں، زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں وغیرہ وغیرہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کا پردے میں رہنا عام مسلمان عورتوں کے واسطے نمونے کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ جس طرح سے کہ آپ کے اور بہت سے افعال ضرورت وقت اور مقامی حالات کے مطابق اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے تھے اسی طرح سے ازواجات مطہرات کو پردے میں رکھنا بھی تھا۔ پیغمبر خدا صلعم کی سوانح عمری کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے جو وسائل اختیار کئے ان میں سے ایک وسیلہ یہ بھی تھا کہ آپؐ نے حتی الوسع کبھی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی دل شکنی

نہیں کی چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کی خواہش اور خوشی کے مطابق آپ نے حضرت عائشہؓ سے ان کی صغر سنی ہی میں نکاح کرلیا اور حضرت عمرؓ کی دل دہی اور تسکین کی خاطر ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ سے جو کہ بیوہ ہوگئی تھیں اور جن کو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے قبول نہیں کیا تھا خود اپنا نکاح کرلیا۔ اسی طرح سے آپؐ نے حضرت عمرؓ کی خواہش اور خوشی کے مطابق ازواج مطہرات کو پردے میں بھی رکھا لیکن آپؐ کے یہ دونوں فعل یعنی حضرت عائشہؓ سے ان کی صغر سنی میں نکاح اور ازواج مطہراتؓ کو پردے میں رکھنا مختص بالزماں تھے جن کی اصلی غرض و غایت صرف عرب کے اس زمانے کے دو سب سے زیادہ سر برآوردہ اور با اثر لوگوں کو اسلام کے ساتھ زیادہ وابستہ کرنا تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ حضرت عمرؓ نے ازواج مطہرات کو پردے میں رکھنے کی کیوں خواہش ظاہر کی اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آپؐ کا رجحان طبیعت تھا کہ جن کو خدا نے امہات المومنین فرمایا اور دیگر عورتوں پر فضیلت دی ان میں اور دوسری تمام عورتوں میں کچھ ظاہری امتیاز بھی ہونا چاہیئے لہذا اس فضیلت کے اظہار کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ان پر غیر محرم کی نگاہ نہ پڑنے پائے۔ پس ازواج مطہرات کا پردے میں رکھنا صرف دیگر عورات پر ان کی فضیلت کی بنا پر تھا نہ کہ پردے کو ایک اسلامی شعار بنانے کی غرض سے۔ اگر ایسا ہوتا تو خود آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ نکاح کے بعد اپنا گھر کا کام کرنے کے واسطے باہر نہ نکلا کرتیں۔ حضرت فاطمہؓ کا اپنے خانگی کاموں کے لئے باہر نکلنا حتی کہ پانی تک خود ہی بھر کر لانا اس بات کی نہایت مستحکم دلیل ہے کہ پردہ اسلام میں کوئی مذہبی شعار نہیں ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے جس طرح مقتضائے وقت کے لحاظ سے اپنے فرائض پیغمبری ادا کرنے کے لئے ایک وقت میں نو نو اور دس دس بیویاں رکھیں اسی طرح سے ازواج مطہرات کو بھی پردے میں رکھا۔ پس جس طرح سے کہ آپ کا ایک وقت میں نو نو اور دس دس بیویاں رکھنا عام مسلمانوں کے واسطے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی ایک وقت میں محض اپنی خواہشات نفسانی کی خاطر نو نو اور دس دس بیویاں رکھیں اسی طرح سے آپ کا صحابہ کے اصرار سے امہات المومنین کی عام عورتوں پر فضیلت ظاہر کرنے کے لئے انھیں نگاہ مردم سے پوشیدہ رکھنا عام مسلمانوں کے واسطے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی اپنی عورتوں کو عام حالات میں بغیر کسی خاص سبب کے پردے میں رکھیں۔ بہر نوع یہ بات اب کسی مزید ثبوت کی محتاج نہیں رہی کہ عام امن و امان

کی حالت میں جیسی کہ آج کل ہمارے ملک میں ہے عورت کے حق آزادی کو بلا وجہ ضبط کرنا احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنا ہے اور جو چیزیں مذہب حق کے خلاف ہیں وہ قدرتی طور پر انسان کے لئے مضر اور اس کی ترقی میں سدراہ ہوں گی۔ اگر ہم پردے کے تمام مضرت رساں اثرات کا بیان پر ذکر کریں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے اس لئے ہم چند مخصوص اور بین نقصانات کے بیان پر اکتفا کریں گے۔

(۱) پردے کا سب سے پہلا نقص یہ ہے کہ غالباً پردہ نشین عورتیں سو فی صدی تمام عمر بیمار ہی رہتی ہیں۔ وہ جانتی ہی نہیں کہ اعلیٰ قسم کی جسمانی صحت کیا چیز ہے اور اس سے کیسی خوشی حاصل ہوتی ہے جس کے مقابلے میں دوسری تمام خوشیاں ہیچ ہیں اور ان پر یہ کیا وحشیانہ ظلم ہے کہ وہ بیماری اپنے مرض کا علاج تک نہیں کر سکتیں کیونکہ ہمارے ہندوستان میں اسی پردے کی بدولت ابھی لیڈی ڈاکٹر تو اتنی تعداد میں موجود نہیں کہ ہر جگہ اور ہر وقت کم خرچ کے ساتھ میسر آسکیں جن سے عورتیں اپنی بیماری کا مفصل حال بیان کر سکیں اور اپنا جسم دکھا سکیں اور مردوں سے نہ تو وہ اپنا حال بیان کر سکتی ہیں اور نہ ان کو اپنا جسم دکھا سکتی ہیں لہذا وہ تمام عمر بیمار ہی رہتی ہیں اور سڑ سڑ کر بسا اوقات تھوڑی ہی عمر میں مر جاتی ہیں۔ کیا اس طرح سے مسلمان اپنی عورتوں کی تمام عمر کی بیماری کا سبب اور بالآخر ان کے قتل عمد کے جرم کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں۔

تازہ اور خوشگوار ہوا جو صحت کے لئے لازمی چیز ہے اور جو قدرت نے امیر غریب چرند و پرند سب کے لئے یکساں بنائی ہے اس سے نہ صرف ہماری عورتیں ہی چوبیس گھنٹے محروم رہتی ہیں بلکہ پردے کے مکانوں میں رہنے کے باعث مردوں اور بچوں کا بھی زیادہ تر وقت انھیں تاریک اور غلیظ جیل خانوں میں گذرتا ہے جہاں دھوپ اور تازہ ہوا بھی جاتے ہوئے شرماتی ہے اور اس کا جو مضرت رساں اثر غیر محسوس طور پر بتدریج ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کی عمر، توے اور صحت پر پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب ہماری اولادیں کمزور توے کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس پر ان کی پرورش تنگ و تاریک اور غلیظ مکانوں میں اصول حفظان صحت سے ناواقف اور توہم پرست جاہل عورتوں میں ہوتی ہے تو وہ اس زندگی کے دشوار گذار راستے میں کیونکر کامیابی کے ساتھ سفر کرنے کے قابل بن

سکتی ہیں اور کس طرح دیگر اقوام عالم کے مقابلے میں جو ہم سے بدر جہا بہتر حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں اور قدرت کی ہر نعمت سے مقابلتاً زیادہ فائدہ اٹھاتی ہیں، اپنی ہستی کو قائم رکھنے کے قابل ہو سکتی ہیں اور کیوں کر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتی ہیں۔

(۲) دوسرا نقص پردے کا یہ ہے کہ مزاج اور طبیعت کے مطابق زن و شوہر کا انتخاب قطعی ناممکن ہے جس کی وجہ سے اکثر حالتوں میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی ضرورت پیش آتی ہیں اور دونوں صورتوں میں زن و شوہر کیا بلکہ تمام خاندان کی زندگی ہمیشہ کے لئے تلخ ہو جاتی ہے اور جو شادی کا اصلی مدعا ہوتا ہے یعنی محبت اور خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنا وہ بالکل فوت ہو جاتا ہے اور پھر اس کے جو مضر نتائج نکلتے ہیں ان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ محض معمولی استعمال کی چیزیں تو پسند کر کے لی جائیں لیکن ایک تمام عمر کا رفیق زندگی جس پر تمام آیندہ زندگی کی خوشیوں کا دارمدار ہے زبردستی گلے ڈال دیا جائے۔

(۳) تعلیم نسواں میں جو رکاوٹیں اس پردے کی بدولت پیدا ہوتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں اور پھر طبقۂ اناث کی جہالت کا اثر جو بچوں کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت پر پڑتا ہے وہ اس قدر افسوس ناک ہے کہ اس پر جس قدر غم کیا جائے تھوڑا ہے۔ نفسیات کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ بچپن میں جو باتیں انسان کے دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں اور جو عادتیں قائم ہو جاتی ہیں انھیں سے اس کا کیریکٹر بنتا ہے۔ ہماری خاندانی اور معاشرتی زندگی کی جو اس وقت ابتر حالت ہے اور ہم میں جو قابل نیک اشخاص اور فدائیان قوم و ملت کا فقدان ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری نشو و نما ناقص ترین حالات میں ہوتی ہے، ہماری جاہل اور توہم پرست عورتیں ہمارے بچوں کے دل میں کسی اخلاقی خوبی کا شوق پیدا نہیں کر سکتیں اور پھر گلیوں کے مکتبوں میں نیم ملاؤں سے تعلیم پا کر تو ان کے دماغ مصنوعی نیکیوں سے ایسے بھر جاتے ہیں کہ ان میں پھر قدرتی نیکیوں کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لہذا یہ پردہ محض ہماری عورتوں ہی کو تعلیم سے محروم نہیں رکھتا بلکہ ہماری اولاد کو بھی قومی اور معاشرتی زندگی میں کوئی مفید حصہ لینے کے قابل نہیں بننے دیتا۔

(۴) پردے کا اہلی زندگی پر نہایت ہی افسوسناک اثر پڑتا ہے۔ زن وشوہر ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی تفریح اور دلبستگی کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ عورت تو پردے میں قید ہونے کی وجہ سے اسی چہاردیواری کے اندر کسی نہ کسی طرح اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے مگر مرد اس بات پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ ایسے مقامات پر جائے جہاں وہ دوسری عورتوں سے اپنی طبیعت بہلا سکے کیونکہ اول تو اس کی منکوحہ عورت ۹۹ فی صدی حالتوں میں اس کی طبیعت کے موافق ہی نہیں ہوتی دوسرے دونوں کے دماغی تصورات اور معیارزندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور تیسرے خانگی رسوم زن وشوہر، باپ بیٹا اور بھائی بہن کے درمیان بے تکلفی پیدا کرنے سے مانع ہوتے ہیں یہاں تک کہ زن وشوہر ساتھ ساتھ کھانا بھی نہیں کھا سکتے حتیٰ کہ باتیں بھی نہیں کرسکتے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس پردے کی بدولت مسلمان اہلی زندگی کی نعمتوں اور خوشیوں سے ایسے محروم ہوگئے ہیں کہ ان کو ان نعمتوں اور خوشیوں کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہا۔ زناکاری، شراب خواری اور اسی قسم کی دوسری برائیاں مردوں میں زیادہ تر اسی وجہ سے پھیلتی ہیں کہ اول تو وہ اپنے تنگ اور غلیظ پردے کے مکانوں میں اپنے خالی اوقات میں ٹھہر نہیں سکتے دوسرے اہلی زندگی اپنی قدرتی نعمتوں سے خالی ہونے کے باعث ان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی اور تیسرے یہ کہ مکان کے باہر بھی پردے کی وجہ سے زن وشوہر ایک ساتھ تفریح نہیں کرسکتے۔ اگر مرد کے خالی اوقات خاندان کے ممبروں کے ساتھ خواہ مکان کے اندر خواہ مکان کے باہر سیر وتفریح میں بسر ہوں تو مرد وزن دونوں ان تمام برائیوں سے بچ سکتے ہیں جن میں وہ پردے کے باعث مجبوراً پڑجاتے ہیں۔

(۵) پردہ عورت کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ہم نے تاریخی واقعات سے اوپر ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں جب عورتیں تعلیم حاصل کرتی تھیں تو ان میں پردے کا کوئی رواج نہ تھا بلکہ وہ بھی قومی زندگی کے ان کاموں میں جن کے لئے وہ موزوں ہوتی تھیں پورا پورا حصہ لیتی تھیں۔ زمانہ قریب کی ترکی اور مصر وغیرہ کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ جب وہاں کی عورتیں تعلیم یافتہ ہوگئیں تو انھوں نے بھی پردے کو ترک کردیا۔ خود ہمارے ہندوستان میں برادران اہل ہنود کی زمانہ حال

کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کے یہاں بھی عورتوں میں جس قدر تعلیم عام ہوتی جاتی ہے اسی تناسب سے پردہ اٹھتا جاتا ہے یہاں تک کہ مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ ان میں بھی تعلیم یافتہ عورتوں میں پردے کے خلاف تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ان تجربات سے صرف یہی ایک نتیجہ نکل سکتا ہے کہ عورت فطرتاً پردے کو پسند نہیں کرتی بلکہ اس کو مردنے پردے پر محض اس وجہ سے مجبور کر رکھا تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث اپنے فرائض و حقوق سے واقف نہ تھی تعلیم حاصل کرتے ہی وہ اپنے فرائض و حقوق سے واقف ہو گئی لہذا اس کی فطرت کے خلاف جو مردنے اس پر قیود عاید کر دی تھیں اور جن کو وہ اپنی جہالت کے باعث قبول کئے ہوئے تھی ان کو اس نے فوراً توڑ کر پھینک دیا۔ لہذا معلوم ہوا کہ پردہ عورت کی فطرت کے خلاف ہے اور جو چیز فطرت انسانی کے خلاف ہے وہ اس کے لئے مضر ہے اور جو چیز فطرت انسانی کے خلاف یا اس کے لئے مضر ہے وہ اسلام کے خلاف ہے کیونکہ اسلام خود نام ہے "دین الفطرت" کا اور وہ انسان کی فطری خواہشات کو روکنے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کے لئے آیا ہے۔

غرضیکہ پردہ پر جس پہلو سے نظر ڈالی جائے اس میں برائیاں ہی برائیاں نظر آتی ہیں۔ فطرت کے خلاف، احکام الٰہی کے خلاف اور منشار رسول کے خلاف ثابت ہوتا ہے اس لئے اس کو جلد سے جلد ترک کر دینا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کے واسطے لازمی چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرد و عورت کے جنسی تعلقات کی راہ نہایت پر خطر ہے لیکن کیا انسان کی تمام زندگی ہی خطروں سے بھری ہوئی نہیں ہے۔ محض جنسی آزادی کے بے جا استعمال کے مضر نتائج کے خوف کی وجہ سے پردے کی آڑ میں پناہ لینا اور اس کے صحیح استعمال کے بہترین فوائد سے خود کو محروم کر لینا کوئی انسانی صفت نہیں ہے بلکہ انسان کے واسطے ننگ کا باعث ہے۔ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے میں غلطی کرنا ان سے بھاگنے کی غلطی کرنے سے بدرجہا بہتر اور انسان کے شایان شان ہے کیونکہ ان کا مقابلہ ہی کرنے سے ہم میں مقابلے کی طاقت پیدا ہو سکتی ہے اور ان پر کامیابی حاصل کرنے کے ذرائع دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے بچنے اور بھاگنے کا سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں کہ ان میں اور اضافہ ہو اور ایک روز وہ ہم پر ایسے

غالب آجائیں کہ ہماری زندگی کا ہی خاتمہ کر دیں لہذا اگر ہمیں حقیقی معنی میں زندہ رہنا ہے تو زندگی کی مشکلات کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے اور ان پر فتح حاصل کرکے اپنی ترقی کی راہ کو صاف کرنا چاہیے۔
ورنہ یوں تو جس قدر عمدہ اور مفید چیزیں دنیا میں موجود ہیں اور روز بروز دریافت ہوتی جاتی ہیں ان کا اگر بیجا طور پر استعمال کیا جائے تو وہ بجائے مفید ہونے کے نہایت مضر اور خطرناک بن جاتی ہیں۔ گیس اور بجلی ہی کو لے لیجئے اگر ان کا بیجا استعمال کیا جائے تو آناً فاناً نسل انسانی کو تباہ کر دیں لیکن کیا انسان نے محض ان کے بے جا استعمال کے مضر نتائج کے خوف کی وجہ سے ان سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا ہے۔ پھر جب ایسی مہلک چیزوں سے جن کا بے جا استعمال لاکھوں انسانوں کو چشم زدن میں ہلاک کر سکتا ہے۔ انسان نے فائدہ اٹھانا نہیں چھوڑا بلکہ ان کے مضر نتائج کا مقابلہ کرتے کرتے بالآخر ان کو مسدود اور محدود کرنے کے ذرائع دریافت کر لئے اور ان پر غلبہ حاصل کر لیا تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جنسی آزادی کے بیجا استعمال کے مضر نتائج کا مقابلہ کرکے اور ان کو مسدود اور محدود کرنے کے ذرائع دریافت کرکے ان سے گیس اور بجلی کی طرح فائدہ اٹھانے کی بجائے مسلمانوں نے کیوں ایسی مکروہ چیز کی پناہ لے رکھی ہے جس میں سوائے نقصانات کے اور کوئی فائدہ نہیں اور جو مزید برآں اس ایک خطرے سے بھی پورے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل نہیں ہے جس سے بچنے کے لئے بہترین فوائد کی قربانی کرکے اس کی پناہ لی جاتی ہے۔

ان حالات کی موجودگی میں کوئی سنجیدہ اور غیر متعصب مسلمان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جنسی آزادی کے بہترین فوائد حاصل کرنے کے لئے اس کے بعض مضر نتائج کا مقابلہ کرنا اور ان پر فتح حاصل کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ان سے روپوش ہو کر پردے کی آڑ پکڑنا اور اپنی قومی زندگی کو مجروح کرنا البتہ اس آزادی کے بیجا استعمال کے جو مضر نتائج ہو سکتے ہیں ان سے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیے۔ جس طرح بجلی کی روشنی سے لوگ تاریک مقامات میں کام کرتے ہیں، ٹریم کار اور دیگر مشینیں اس کے ذریعے سے چلائی جاتی ہیں اور بہت سے دوسرے مفید کام اس کے ذریعے سے لئے جاتے ہیں لیکن اس کے ہر استعمال میں اس کے مضر نتائج کے اثرات سے بچنے کا پیشگی انتظام کر لیا جاتا ہے۔ اسی طرح

سے جنسی آزادی سے بھی اس کے قدرتی فائدے اٹھائے جا سکتے ہیں اور اس کے بیجا استعمال کے مضر نتائج سے محفوظ رہنے کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ حامیانِ پردہ اپنے خیالات کی تائید میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جنسی آزادی سے فحش اور حرام کاری بڑھ جاتی ہے اور اس کی مثال میں یورپ اور امریکہ کی اقوام کی حالت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ان قوموں میں جنسی آزادی ہے اس لئے ان میں فحش اور حرام کاری کی کثرت ہے۔ ہمارے دوستوں نے کبھی اس بات پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ آیا مذکورۂ بالا اقوام میں فحش اور حرام کاری کی کثرت جنسی آزادی کے باعث ہے یا ان کا کوئی اور سبب ہے۔ حامیانِ پردہ کا یہ استدلال محض قیاسی ہے۔ خود یورپ اور امریکہ کے مشہور ترین ڈاکٹر، فلسفی اور ماہرینِ نفسیات جنھوں نے اپنی تمام عمر فحش اور حرام کاری کے اسباب کی تحقیقات میں بسر کی ہے سب اس بات پر متفق ہیں کہ فحش اور حرام کاری کا سب سے بڑا سبب شراب ہے کیونکہ اس کو پی کر انسان کا دماغ نیک و بد کی تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا اور اس لئے شراب خور نشے کی حالت میں وہ کام کر گذرتا ہے جس کو وہ صحیح حالت میں کبھی نہیں کرتا اور محض یہی نہیں بلکہ تندرستی کو بھی سب سے زیادہ خراب کرنے والی چیز بھی شراب ہی ہے۔ بایں ہمہ مسلمانوں کو جہاں تک ان کا اپنی ذات سے تعلق ہے اس دشمنِ انسان شراب سے اتنا خوف نہیں ہے کیونکہ ان کے یہاں یہ مذہباً حرام ہے تاہم کسی چیز کے مذہباً حرام ہو جانے سے وہ اس سے بالکل بے خوف نہیں رہ سکتے۔ اوّل اس لئے کہ بہت سے مسلمان بھی اس کو استعمال کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں دوسرے اس لئے کہ ایک مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ بھی ایک فرض ہے کہ وہ کل نسلِ انسانی کو ان برائیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے جو اس کی نسلی بہبودی میں سدِ راہ ہیں لہٰذا جنسی آزادی کے مضر نتائج کے انسداد اور نیز نسلِ انسانی کو ہلاکت سے بچانے کے لئے ہر سچے مسلمان اور محبِ انسان کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ شراب کا کم از کم ہندوستان میں بننا اور دیگر ممالک سے منگانا قطعی طور پر بند کرانے کی کوشش کرے۔

دوسرا سبب فحش اور زنا کاری کا ناواقفیت ہے۔ ہندوستان تو خیر ابھی تعلیم میں بہت پیچھے ہے خود یورپ اور امریکہ وغیرہ میں جہاں تعلیم بالکل عام ہے لوگ عام طور پر اعضائے جنسی اور تعلقاتِ جنسی کے

متعلق قطعی ناواقف ہیں کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ مدرسوں میں طلبا کو حفظان صحت کے متعلق انسان کے
تمام اعضائے جسمانی کی ساخت، ان کے افعال، ان کی بیماریاں، ان کے جا و بے جا استعمال کے فوائد و
نقصانات غرضکہ ہر قسم کی تشریح بتائی جاتی ہے مگر وہ اعضائے انسانی جن کو بنانے میں خدا کو شرم نہ معلوم
معلوم ہوئی اور جن پر اس نے بقائے نسل جیسی اہم چیز کا انحصار رکھا ان کا نام انسان نے جنسی شرم گاہیں
رکھا ہے اور ان کے متعلق طلبا کو اسی قسم کی تفصیلی معلومات بہم پہنچانا جیسی دیگر اعضائے انسانی کے متعلق
پہنچائی جاتی ہیں محض غیر ضروری ہی نہیں سمجھا بلکہ ان کو نجس اور گناہ آلود چیزیں خیال کر کے ان کا بیان تو
کجا ان کا نام لینا بھی گندگی، فحش اور اخلاقی جرم تصور کر لیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوان
چونکہ اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے متعلق کوئی صحیح معلومات نہیں رکھتے اس لئے وہ قدرتی طور پر ان کا
بے جا استعمال شروع کرتے ہیں۔ لہذا جنسی آزادی کے بے جا استعمال کے خطرات سے بچنے کا دوسرا ذریعہ
یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں اول تو حفظان صحت کے مضمون ہی کو زیادہ اہمیت دینی چاہیے اور اعضائے
جنسی اور تعلقات جنسی کے صحیح اور جائز استعمال پر تو اس قدر زیادہ زور دینا چاہئے کہ جو طلبا معیار اخلاق
پر پورے نہ اتریں ان کو نہ تو کامیابی کی سند مل سکے اور نہ قومی اور سرکاری ملازمتیں مل سکیں اور نہ وہ سماج
میں عزت کی نظر سے دیکھے جائیں۔ خدا نے جتنی چیزیں بنائی ہیں وہ سب پاک ہیں۔ ہم خدا کے متعلق کبھی یہ
تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی نجس یا ناپاک چیز پیدا کرے گا۔ اور جتنی چیزیں خدا نے بنائی ہیں اگر ان کا
صحیح اور مناسب استعمال کیا جائے تو وہ انسانی ترقی، خدا کی خوشنودی اور مقصد آفرینش کی تکمیل کا باعث
ہوتی ہیں مگر یہ انسان ہی ہے جو خدا کی بخشی ہوئی مقدس نعمتوں کو ان کا غلط اور بے جا استعمال کر کے نجس
بنا دیتا ہے اور پھر وہ بجائے رحمت کے اس کے لئے زحمت بن جاتی ہیں اور برکت سے لعنت بن جاتی
ہیں۔ لہذا اعضائے جنسی بجائے خود کوئی نجس یا گناہ آلود چیزیں نہیں ہیں وہ بھی مثل دیگر اعضائے انسانی
کے اعضا ہیں اور عملی تعلقات جنسی کی خواہش بھی کوئی نجس یا گناہ آلود خواہش نہیں ہے وہ بھی
بھوک پیاس نیند اور دیگر فطری خواہشات کی طرح ایک فطری خواہش ہے جس کا پورا کرنا انسان کا
فرض ہے مگر جس طرح سے وقت بے وقت کھانے، ضرورت سے کم یا زیادہ کھانے، دیر ہضم اور مصنوعی

غذائیں کھانے، شرابیں وغیرہ پینے یا اور دوسرے طریقوں سے ان خواہشات یا دیگر اعضائے انسانی اور خواہشات فطری کا بے جا اور غلط استعمال کرنے سے انسان کی تندرستی اور اخلاق خراب ہو جاتے ہیں اور وہ انسانی ترقی اور نسلی بہبودی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے اعضائے جنسی اور عملی تعلقات جنسی کے بھی غلط اور بے جا استعمال سے نہ صرف انسان کی جسمانی تندرستی اور اخلاق ہی خراب ہوتے ہیں بلکہ اس کا انسانی اجتماعی ترقی اور نسلی بہبودی پر بھی ناقابل تلافی مضر اثر پڑتا ہے۔ بہرحال اگر دیگر اعضائے انسانی کے متعلق تفصیلی تعلیم کا یہ منشا ہے کہ انسان ان کا صحیح اور مناسب استعمال کرے اور اگر حقیقت میں یہ تعلیم کچھ مؤثر ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اعضائے جنسی اور تعلقات جنسی کے متعلق تفصیلی تعلیم ویسی ہی مؤثر نہ ہو۔ یہ کوئی ہمارا قیاسی استدلال نہیں ہے بلکہ روزمرہ کا مشاہدہ اور تاریخی تجربہ ہے۔ تعلیم اس دنیا میں ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کو جیسا چاہو بنا سکتی ہے۔ ہمارے بچوں کو عورت کی عزت و تکریم کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی بلکہ برعکس اس کے اس پر ظلم و تشدد کرنا اور اس کو اپنے سے کمتر سمجھنا سکھایا جاتا ہے۔ اگر ایک ہندو بچپن کی تعلیم کے اثر سے بڑا ہو کر بھی گائے کو ایک مقدس ہستی سمجھ سکتا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے انسانی خونریزی کر سکتا ہے، اگر ایک عیسائی بچپن میں صلیب کی عزت کرنا سیکھ کر اس کی محبت میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے، اور اگر ایک مسلمان لڑکپن کے زمانے میں مزار یا تعزیے کی تحریم و تکریم کی تعلیم حاصل کر کے اس کی بے حرمتی کرنے والوں کا خون بہانا ثواب سمجھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اگر ہم اپنے بچوں کو بچپن ہی سے عورت کی عزت کرنے کی اور اس کی عصمت کی حفاظت کرنے کی کم از کم ایسی ہی تعلیم دیں تو وہ جوان ہو کر اس کا ویسا ہی احترام اور اس کی عصمت کی ویسی ہی حفاظت نہ کریں جیسی دوسری چیزوں کی جنھیں وہ مقدس سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔

تیسرا سبب ان معاشرتی برائیوں کا یہ ہے کہ عورت نے اتنے عرصے تک اپنے آپ کو مرد سے علیحدہ رکھا ہے کہ جب کبھی دونوں ایک دوسرے سے اتفاقیہ مل جاتے ہیں تو ان کی جنسی خواہش بھڑک اٹھتی ہے۔ اگر دونوں فرقوں کی تعلیم ایک خاص عمر تک ایک ہی جگہ ہو تو روزمرہ کے آزادانہ طور پر ملنے جلنے سے جذبات جنسی کی تحریک خود بخود کم ہو جائے گی اور یہ نفسیات کا بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے

جس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

چوتھا سبب ان فواحش کا ہماری مصنوعی غذائیں ہیں۔ نہایت مرغن اور مقوی اور مسالے دار غذائیں اور بکثرت گوشت کھانے سے انسان میں عملی تعلقات جنسی کی خواہش بہت زیادہ مشتعل ہوتی ہے اور یہی نہیں بلکہ معدہ بھی خراب ہوتا ہے اور سینکڑوں قسم کے امراض اور کمزوریاں پیدا ہوجاتی ہیں لہذا ہم کو محض ان معاشرتی برائیوں سے بچنے ہی کے لئے نہیں بلکہ عام تندرستی بھی قائم رکھنے کے لئے اپنی قومی غذا میں مناسب تبدیلی کرنی چاہیئے اور ہندوستان کے ماہرین طب کی ایک مجلس کے ذریعے سے ایک ہندوستانی قومی غذا ایسی مقرر کرنی چاہیئے جو انسان کے واسطے قدرتی طور پر سب سے زیادہ مفید ہو اور ویسے بھی ہر تعلیم یافتہ انسان اس بات کو جانتا ہے کہ قدرتی اور سادہ غذا انسان کے واسطے بہترین غذا ہے لیکن تاوقتیکہ اس پر ماہرین طب کی مہر ثبت نہ ہو اور اس کو ایک قومی غذا کی حیثیت نہ دی جائے اس کی ترویج بہت دشوار ہے۔

بہر حال جو لوگ احکام الٰہی اور فرمان رسول کے خلاف پردے کو اسلامی تعلیم بتلاتے ہیں اور اس کی حمایت اس بنا پر کرتے ہیں کہ وہ فحش اور حرام کاری سے محفوظ رکھتا ہے تو ان کی تسلی کے لئے مذکورۂ بالا دلائل کافی ہیں مگر اب سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت میں پردے کی رسم کس طرح بند کی جائے اور عورت کو اس کا اسلامی اور انسانی حق جو صدہا سال سے مسلمان مردوں نے غصب کر رکھا ہے کس طرح واپس دیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ہی اس طبقے کو غیر مشروط طور پر مثل مردوں کے باہر پھرنے کی اجازت دے دی جائے۔ موجودہ صورت میں جبکہ عورت خود اپنی اور ہماری نگاہوں میں بھیڑ بکری سے زیادہ نہیں ہے اور جبکہ صدیوں تک تنگ و تاریک قید خانوں میں مرد کی غلامی کرتے کرتے اس کے ذہن سے آزادی اور مساوات کا تصور ہی محو ہوگیا ہے اس کو یک بیک مکمل آزادی دے دینا ایک خوفناک انقلاب پیدا کردے گا جو سماج کے واسطے نہایت مضر ثابت ہوگا۔ تمام قومی اور ملکی اصلاحیں بتدریج عمل میں آتی ہیں۔ لہذا اس کی بہترین صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جس وقت تک عورت مناسب طور پر تعلیم یافتہ ہو اور ہماری اولادیں بچپن کی تعلیم سے عورت کو ایک مقدس ہستی

تصور کرنے کے قابل ہوں اس وقت تک وہ صرف اپنے کسی ایسے عزیز یا رشتہ دار کے ساتھ باہر جا سکتی ہے جس کے ساتھ اس کا نکاح ناجائز ہے۔ اور یہ تجویز بھی ہم اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ آج سے چودہ سو برس پہلے اس مقدس ہستی نے فرمایا تھا جس کا خطاب "رحمت للعٰلمین" ہے "لا یخلون رجل بامرأة الا ومعها ذو محرمة فقام رجل (ترجمہ: کوئی مرد تنہائی میں کسی عورت کے پاس نہ رہے سوائے اس حالت کے جبکہ اس کا خاوند یا کوئی اور رشتہ دار جس کے ساتھ نکاح جائز نہ ہو اس کے پاس ہو۔" السنۃ النسائی۔

غزل

بر در دوست جبہ سا گشتم	خاکِ پا گشتہ بے بہا گشتم
خاک گشتم براہ او صد شکر	در خور تاج نقش پا گشتم
در نگاہش تبسمے دیدم	در پئے عرض مدعا گشتم
آتش عشق کرد رسوایم	خاک گردیدہ کیمیا گشتم
من بریدم ز ننگ و نام نسب	چوں بعشق تو مبتلا گشتم
آہ مجنوں کشید و من با او	در او دیدہ ہمنوا گشتم
بود شاہی بفقر ہائے عبث	در پئے سایۂ ہما گشتم
ذکر عشق و جنوں خود کردم	وائے برمن کہ خودستا گشتم

شوخیٔ نقش پائے او شیوا
دیدہ فارغ ز رہنما گشتم

ناول کیا ہے

ناول کا لفظ جس کثرت سے مختلف قسم کے قصوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس پر نظر رکھتے ہوئے اس کے حدود کو متعین کرنا اور پھر اس کی کوئی جامع تعریف کرنا آسان نہیں۔ حسن و عشق کے قصے، ڈاکوؤں کی حکایتیں، جعل سازیاں، زمانے بھر کی واردات و روایات سے لے کر نصیحت کے کرن پھول بھی ناول ہی کے حدود میں رکھے جاتے ہیں۔ ناول کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے بغرض وضاحت یہاں تحریر کی جاتی ہیں۔

"Marion Crawford" نے ناول کی تعریف یوں کی ہے "ایک جیبی تھیٹر ہے جس کے پردے، ساز و جملہ لوازمات اسی میں بند ہیں"

والٹر بلنٹ لکھتا ہے:

> "ناول کی وسعت خود ذات انسانی سے کم نہیں۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا مطالعہ عمیق نظروں سے کرتا ہے۔ اس کا تعلق ان کے افعال، ان کے خیالات اور خامیوں، ان کی عظمت و بلندی، غرض ان کی مکمل ذات سے ہے۔ دنیا کے بے شمار حسین اشکال اپنی متلون مزاجی، خوف یا احساسات یا غلبے سے قلب انسانی پر تموج برپا رکھتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کا موضوع خود انسان ہے۔"

بعضوں کے نزدیک صرف کسی قصے کا کسی طریقے سے بھی اظہار کر دینا ہی ناول ہے بعض کردار کی ارتقائی ترقی یا ان کی انفرادی ہستی کی بلند یا نمایاں شخصیت کو ناول کی بلندی تہ کا ذریعہ خیال کرتے

اس مضمون میں دیگر ناول نگاروں کے خیال کے علاوہ اکثر پریسٹلے ہی کے خیالات سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔ (حامد)

ہیں لیکن یہ سب ناول کو سمجھنے اور غور کرنے کے لئے مختلف زاویۂ نگاہ ہیں نہ کہ مکمل طور پر ناول کی تعریفیں۔

بقول پریسٹلے " ناول کی جو کچھ تعریف میں پیش کر سکتا ہوں وہ یہ کہ ایک قصہ جو نثر میں بیان کیا گیا ہو اور اس میں خصوصیت کے ساتھ خیالی کرداروں اور خیالی واقعات سے بحث کی گئی ہو ناول ہے "۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے ناول ایسے ہیں جن کے کردار تاریخی ہیں مثلاً عزیز ورجنا ' جعفر عباسیہ یا شرر کے دوسرے ناول لیکن یہ واضح رہے کہ ان میں بہت کچھ قصوں کی حکایتیں بیان ہوئی ہیں نہ کہ اصل حقیقتیں۔ یہ ضرور ہے کہ کتاب کے کل اثرات ذہن انسانی کو انھیں تاریخی واقعات کی طرف لے جاتے ہیں جو کسی زمانے میں رونما ہوئے تھے۔ لیکن یہاں نتائج سے تو بحث نہیں۔ کون کہتا ہے کہ شاعرانہ صداقت یا ناول نگار کی صداقت مہمل ہے۔ غرض تو صرف اس قدر ہے کہ یہاں بھی واقعات سے زیادہ قصوں پر زور دیا گیا ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ بعض تاریخی ادبیات میں بھی تخیل کا وہ زور موجود ہے کہ ان تاریخی کتابوں اور تخیلی نثر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ ان دونوں میں ایک حدِ فاصل کھینچی جائے جب ان دونوں کا بین فرق صاف ظاہر رہتا ہے۔

پریسٹلے کی اس تعریف سے ابھی قصے کا مفہوم صاف نہیں ہوا لیکن وہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ " خود لفظ قصہ اس قدر جامع ہے کہ اس کے حدود کا انحصار مشکل ہے قصے کو اتنے مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ طبیعت الجھ جاتی ہے۔ بعضوں کے نزدیک قصہ حیات انسانی کا آئینہ ہے بعضوں کے خیال میں یہ ان کے اطوار کا مظہر۔ بعض اس کو بھی کردار کا اسٹیج خیال کرتے ہیں اور بعض اس کو فلسفۂ حیات کے معلوم کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ کبھی قصے یا ناول کو اس لئے بھی پڑھا جاتا ہے کہ خود ناول نویس کی ذات کو سمجھا جائے "۔ نقادوں کی ان مختلف آرا پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر ایک خیال کو دوسرے پر ترجیح دوسری حقیقتوں کا خون کر کے دیتے ہیں۔ انگریز ناول نویسوں نے صرف کردار یا کیرکٹر کی شخصیت اور اس کے نمو د پر ناول کا دارومدار رکھا ہے۔ ڈکنس اس لئے بہتر ہے کہ اس نے سینکڑوں نئی شخصیتیں اپنے ناول میں پیدا کر دیں۔ اس لئے انگریزی نقادوں کا خیال ہے

کہ اگر صرف ایک معیار رکھا جاوے جس پر تمام ناول جانچے جا سکیں تو صرف کردار نگاری کی خوبی یا برائی پر منحصر ہوگا کیونکہ کوئی ناول ان کے نقطۂ نظر کے مطابق اچھا نہیں ہو سکتا جب تک اس میں کردار نگاری کے جوہر نہ دکھائے گئے ہوں"۔

لیکن اردو ناولوں کے جانچنے کے لئے ہر معیار کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں روحانیت کے عناصر زیادہ تھے اور وہ اخلاق و پند پر ناول کا دار و مدار سمجھتے تھے، پھر وہ دن بھی ہندوستان میں گذرے ہیں کہ اپنی معشوقہ کو خوش کرنے کے لئے یہاں کے ادیبوں نے طلسم ہوش ربا کے جواب میں بوستان خیال کی سی کتابیں لکھ ڈالیں۔ پھر اردو نے جب فارسی و عربی سے فیض حاصل کیا تو انھیں کے تمثیلی قصوں کو شمع ہدایت بنایا۔ اور الف لیلیٰ کے ترجمے ہوئے۔ انگریزوں کی حکومت آئی اور مغربی خیالات کے اثرات ادب پر پڑے تو مغربی ناول نویسوں کے معیار پر ناول لکھے گئے۔ جب ادب نے اس مختصر زمانے میں اس قدر پلٹے کھائے ہوں وہاں ناول کو صرف مغربی معیارِ کردار نگاری پر جانچنا کس قدر فاش غلطی ہے۔

اس لئے پریسٹلے کہتا ہے کہ "میں تخیل کی جولانی پر کل قصوں کو جانچنے کے لئے تیار ہوں کیونکہ ہر زمانے میں اس کی ہمہ گیری زمانے کے مطابق رہی ہے اور آج بھی کردار نگاری اسی تخیل کا نتیجہ ہے۔ ناول کے مفہوم کو سمجھنے میں اکثر نقادوں سے جو غلطی ہوئی ہے وہ یہ کہ وہ ناول نگاری کو بھی سائنس کے اصولوں سے جانچنا چاہتے ہیں۔ آج طبعیات کے بہت سے نظریے غلط ثابت ہوگئے لیکن فیلڈنگ کے ناول، طلسم ہوش رُبا اور میرامن کی باغ و بہار قابل ترک نہیں۔ آج شرر کا طرز بیان زیادہ مقبول نہیں۔ ان کے تاریخی ناولوں کی یہ صورت موجودہ زمانے کو زیادہ مرغوب نہیں لیکن آج بھی فیلڈنگ، امن و شرر ہم میں زندہ ہیں۔ ہم ان کے ناولوں یا قصوں کو پڑھتے ہیں اور حظ حاصل کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ صرف اس لئے بھلا دینے کے قابل ہیں کہ انھوں نے کردار نگاری پر زیادہ زور نہیں دیا۔ کون جانتا ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی آجاوے کہ اردو میں بھی اوسکر والڈ کے مقلد بآواز بلند پکاریں کہ ناول صرف انبساط قلب کے لئے ہے اور اس کا کوئی معیار نہیں۔ آج بھی اس کے اشارات

مل رہے ہیں۔ اس کی آوازیں فضا میں پھیلتی معلوم ہوتی ہیں لیکن خاموشی سے اور کبھی کبھی اگر آج یہ اپنے ناول نویس اسی طرح خارج کئے گئے ہوتے یا کئے جاویں تو صرف وہی حضرات باقی رہ جائیں گے جو زمانے کے مقلد ہیں اور اسی کی راہ پر چل رہے ہیں یا جن کی کتابیں پریس سے ابھی نکلی ہیں حالانکہ قصے کی ہمہ گیری تو یہ ہے کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ عمل داریوں کی عمل داریاں فتح کرتا چلا جاتا ہے۔ ہاں ایک مخصوص ناول نویس اس طرح ترقی نہیں کرتا اس کے لئے عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ یہاں ایک دوسری غلطی کا تدارک بھی کر دینا ضروری ہے۔ بعضوں نے سمجھ لیا ہے کہ ناول کو ہمیشہ اس کے اصولوں سے جانچنا چاہئے نہ کہ نتائج سے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کسی کام کو نتائج سے الگ جانچا نہیں جاسکتا۔ اخلاقیات کا عام مسئلہ ہے کہ نیت اور اعمال یعنی Motive اور Consequence دونوں کو دیکھنا ضروری ہے۔

اس طرح ناول ایک وسیع نام ہے جو اگرچہ انگریزی ادب کے ساتھ اردو میں آیا لیکن خود انگریزی میں ہر قسم کے قصوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے یہاں بھی اس کی ہمہ گیری کو محدود کرنا غلطی ہے۔ ناول کے جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بلندی تخیل کو اس کا معیار بنایا جائے اور کسی غیر جزوی تعریف کی بنا پر کسی ناول نگار کے چیتھڑے نہ اڑائے جائیں۔

ناول کو کسی محدود معنی میں استعمال کرنا غلطی ہے۔ اس کی قلمرو بھی اسی قدر وسیع ہے جتنا خیال کا۔ اگر ایک شخص ناول کو کسی خاص اصول کے تحت دیکھتا ہے تو حقیقتاً وہ اپنے نقطۂ نظر سے اس کو سمجھنا چاہتا ہے نہ کہ اصل ناول کے مفہوم سے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ خود ناول کی وسعت میں ایسے ذاتی نقطۂ نظر سے کمی پیدا نہیں ہو سکتی۔

آپ کا نام ولی محمد اور نظیر تخلص ہے۔ آپ محمد فاروق کے بیٹے تھے۔ دہلی میں ۱۷۲۹ء میں پیدا ہوئے تقریباً اس زمانے میں جب نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت آپ اپنی ماں اور نانی کو لے کر آگرہ چلے گئے اور محلہ تاج گنج میں جو تاج محل کے نزدیک ہی واقع ہے آباد ہو گئے۔ آپ کی شادی محمد رحمٰن کی لڑکی مساۃ تہور بیگم کے ساتھ ہوئی جس کے بطن سے ایک لڑکا خلیفہ گلزار علی اور ایک لڑکی امامی بیگم پیدا ہوئے۔ آپ کی فارسی استعداد معمولی تھی اور کسی قدر عربی سے بھی آپ واقف تھے، فن خوش نویسی بھی جانتے تھے۔ آپ فقیر منش اور آزاد طبع تھے، دنیاوی جاہ و دولت کی مطلق خواہش نہ تھی۔ نواب سعادت علی خاں والی اودھ نے آپ کو لکھنؤ طلب کیا مگر آپ نہیں گئے، اسی طرح بھرت پور بھی جانے سے انکار کر دیا۔ اوائل عمر میں متھرا گئے اور وہاں معلمی کی نوکری کر لی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اکبر آباد واپس گئے۔ یہاں آکر آپ نے لالہ بلاس رام کے لڑکے کو پڑھانا شروع کیا اور آپ کی تنخواہ ۱۷ روپے ماہوار مقرر ہو گئی۔

آخر عمر میں فالج گرا اور اسی مرض میں بہت کبر سنی کی حالت میں ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال فرمایا۔ ایک شاگرد نے آپ کی تاریخ وفات اس مصرعے سے نکالی ہے ع مخمس بے سر، پا بیت بے دل، فرد بے سر شد۔ خ ۶۰۰ + م ۴۰ + ب ۲ + ت ۴۰۰ + ر ۲۰۰ + د ۴ = ۱۲۴۶ھ۔ اس حساب سے آپ کی عمر نوے اکیانوے برس ہوتی ہے۔

آپ جوانی میں بہت رنگین مزاج تھے۔ عشق و عاشقی کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک طوائف سے جس کا نام موتی تھا تعلق تھا۔ بعد ازاں گزشتہ گناہوں سے توبہ کر کے آپ ایک صوفی صافی ہو گئے تھے۔ آپ بہت پُر گو شاعر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے مگر وہ سب کلام تلف ہو گیا۔ اب بھی جو کچھ موجود ہے اس کی تعداد ۶ ہزار اشعار سے کم نہیں۔ چونکہ آپ اپنے کلام کو

محفوظ نہیں رکھتے تھے اس لئے جو کچھ آپ کا کلام ہماری نظر سے گزرتا ہے وہ سب لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کیا گیا ہے۔

آپ صوفی مشرب تھے لہذا آپ کے کلام میں تقیدّ سے نفرت اور وہ وسعت خیال پائی جاتی ہے جو اہل اللہ کا خاص جوہر ہے۔ آپ مذہبی مناقشات سے مبرّا تھے اور تمام مذاہب کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں آپ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ انتقال کے وقت آپ کے جنازے کے ساتھ ہزارہا ہندو گئے اور اپنی رسم و رواج کے مطابق نہایت ادب اور احترام سے اس کو لے گئے۔

کلام پر تبصرہ | جو کلیات نظیر ہمارے پیش نظر ہے وہ مولوی عبدالغفور شہباز عظیم آبادی کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اس میں تقریباً ایک ہزار اشعار اردو غزلیات کے ہوں گے۔ نظیر کو غزل گویوں کی صف میں شمار کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آپ کی غزلیں اگر غزل کے معیار سے پرکھی جائیں تو آپ کو دوسرے درجے کے غزل گویوں میں بھی مشکل سے جگہ مل سکتی ہے۔ ہم آپ کی غزلوں میں بھی وہی آزاد منشی اور الفاظ کی صحت و سقم سے بے پروائی دیکھتے ہیں جو آپ کے دیگر اصناف سخن میں پائی جاتی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی لفظ پایہ تہذیب سے گرا ہوا ہے اور بلا خیال اس بات کے کہ مضمون شعر رکیک اور سخیف ہو گیا ہے آپ نے ہر قسم کے اشعار کہے ہیں جن میں سے بعض فحش اور قابل مواخذہ ہیں۔

عُرفی اور نظیری کو عُرفی و نظری باندھا ہے :۔

اک دم میں ہوا ہو گئے سب عُرفی و نظری — تھے یا د جو اسباب و علامات تو پھر کیا

یکبارگی کی جگہ اکبارگی باندھے گئے ہیں ع وہیں اکبارگی جوش جنوں نے دل کو للکارا۔

اضطراب کی بجائے اضطرابی لکھے گئے ہیں:۔

گلے لپٹنے میں یوں تتابی کہ شکل بجلی کے اضطرابی — کہیں جو جھمکا چمک چمک کر کہیں جو لپکا تو پھر چھپا کا

جھپکی کا مذکر چھپا کا بھی خوب ہے۔

ایک جگہ پیام کیا لکھا ہے حالانکہ پیام دیا ہونا چاہئے حالانکہ اس مصرعے میں پیام دیا

بھی ٹھیک نہیں ہے۔ بجائے پیام کلام ہونا چاہئے:۔

کیا جو یار نے ہم سے پیام رخصت کا　　　تو دم نکل گیا سنتے ہی نام رخصت کا

یہ بھی ممکن ہے کہ کاتب کی غلطی سے کلام کے بجائے پیام لکھا گیا ہو۔

واؤ عطف کے ساتھ ایک لفظ واحد اور دوسرا جمع لکھا ہے۔ جب جمع اردو قاعدے سے بنائی گئی ہے تو اس کو واؤ عطف کے ساتھ استعمال کرنا غلطی ہے اور دو فقروں کو تو واؤ عطف سے کبھی ملانا ہی نہ چاہئے:۔

دو دن اگر ان آنکھوں نے دنیا میں کی جاں بں　　　کی ناز و ادا‌ؤں کی اشارات تو پھر کیا

پھر اڑ گئی اک آن میں سب حشمت و سب شان　　　لے شرق سے تا غرب لگا‌ہات تو پھر کیا

شاید فحش اور رکیک اشعار کی مثالیں پیش کرنا ضروری خیال نہ کیا جائے گا کیونکہ نظیر کا کلام کافی مشہور ہے اور اس قسم کے اشعار بھی سب کو معلوم ہیں لہذا ان سے درگزر کرتا ہوں۔ مرتب کلیات نے بعض فحش اور گندے الفاظ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہے اور نقطے لگا دئے ہیں اور بعض جگہ ایسے لفظوں کو علیحدہ علیحدہ حروف سے ظاہر کیا ہے۔ اس سے قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے اشعار پیش کرنے سے یہ خاکسار کیوں قاصر رہا۔

نظیر نے اردو زبان میں ایسے الفاظ بھی داخل کئے ہیں جو زبانوں پر تو تھے مگر تحریر میں نہیں آتے تھے کیونکہ ثقات ان کا استعمال مکروہ جانتے تھے۔ مثال کے طور پر چند الفاظ لکھتا ہوں چنچل چھبیلا، لگڑوں کوں، ٹٹروں ٹوں،

صبح جب بول اٹھا مرغ سحر لگڑوں کوں　　　اٹھ گئے پاس سے وہ، رہ گیا میں ٹٹروں ٹوں

جھپ سے،

دکھلا حنائی دست لیا جھپ سے دین و دل　　　کیا دست رس ہے دیکھئے اس دست گاہ کو

گلے کی نڑی، کمیرا بمعنی مزدور، مزدورا، اٹیرن، اٹیرا وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ یا اس قسم کے دیگر الفاظ اگر نظموں میں موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کئے جائیں

تو مضائقہ نہیں۔ غزل میں ایسے الفاظ بہت کھٹکتے ہیں۔ ان سے احترازہی لازم ہے۔ شاید میاں نظیرہی پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے غزل میں اس قسم کی بدعنوانیوں کو جائز رکھا۔

متروکات بھی آپ کے کلام میں بے حد ہیں بعض بعض جگہ تو آپ وہ الفاظ لکھ جاتے ہیں جو دورِ اول اور دورِ دوم کی یاد دلاتے ہیں مثلاً تمن بجائے شکل و مانند۔ معمولی متروکات یعنی جو آپ کے زمانے کے دیگر شعرائے کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں ان کا ذکر ہی کیا مثلاً اس کے تئیں بجائے اس کو، موندا بجائے بند کیا، بھر نظر بجائے نظر بھر، دوانہ پن بجائے دیوانہ پن وغیرہ۔

محاورات اور ضرب الامثال بھی آپ نے زیادہ تر ایسی ہی استعمال کی ہیں جو نرالی اور اعجوبیت کی شان لئے ہوئے ہیں:۔

وہ چاندنی میں جو ٹک سیر کو نکلتے ہیں
تو مہ کے طشت میں گھی کے چراغ جلتے ہیں

بگولے اٹھ چلے تھے اور نہ تھی کچھ دیر آندھی میں
کہ ہم سے یار سے آ، ہو گئی مٹھ بھیڑ آندھی میں

فدا جو دل سے ہیں یاں شوخ سبز رنگوں پہ
یہ کافران کی بھی چھاتی پہ مونگ دلے ہیں

ہوا ہوں خشک میں یاں تک کہ حضرت مجنوں
یہ مجھ سے کہتے ہیں ادبنے ہاتھ ملتے ہیں

مہ ہے اگر جوئے شیر، تم بھی ذری اوس بن
دودھ چھٹی کا اسے یاد دلانے چلو

لائے تھے ہم تو عمر بٹیا یاں لکھا وے
جب سیاہی پر سفیدی چڑھی تب خبر پڑی

ع باپ نے پدڑی نہ ماری بیٹا تیرانداز ہے۔

آپ نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں۔ اس قسم کی غزلوں کے صرف مطلعے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

اسی کی ذات کو ہے دائما ثبات و قیام
قدیم و حق و کریم و مہیمن و منعام

عیش کر خوباں میں اے دل شادمانی پھر کہاں
شادمانی گر ہوئی تو زندگانی پھر کہاں

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشک چمن
گل رخ و گلگوں قبا و گل عذار و گل بدن

کہا جو ہم نے ہمیں در سے کیوں اٹھاتے ہو
کہا کہ اس لئے تم یاں جو غل مچاتے ہو

آپ کے یہاں زبان کی سادگی کے باوجود بعض فارسی تراکیب خوب ہیں مثلاً چند ترکیبیں تحریر کرتا ہوں: حسن بالادست، ہوس آشنا، ندرت تاب، قدم تراش (قدم تراشنا)۔

واماندگانِ راہ تو منزل پہ جا پڑے — اب تو بھی لے نظیر یہاں سے قدم تراش

روکشِ برگِ سمن، حیرت زدہ، نازآفریں، عزت پناہ وغیرہ۔

جھڑکی سے اس نے ہم کو خفا دیکھ کر کہا — کیا ناپسند گنتے ہو اس رسم و راہ کو

جانے ہیں جھڑکیوں میں ہماری وہ لذتیں — جو چاہ میں سمجھتے ہیں بہتر نگاہ کو

گر عار ہے کچھ اس میں تمھیں تو میاں نظیر — لے جاؤ اپنے اس دلِ عزت پناہ کو

اگرچہ ہم آخر میں اپنے قاعدے کے مطابق آپ کے بہتر منتخب اشعار غزلیات میں سے پیش کریں گے تاہم یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہم نظیر کو دراصل غزل گو شاعر نہیں مانتے۔ ہمارے نزدیک نظیر کا کمال جو کچھ ہے وہ ان کی نظموں میں ہے۔ مرتب کلیات نے ان کے مخمس، مسدس، مثمن، معشر، ترجیع بند، ترکیب بند، تضمینیں سب کو دبستان نظیر سے موسوم کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کا یہ دبستان تا قیامت جاری رہے گا۔ ہم ان کی اس رائے سے متفق ہیں۔ سچ یہ ہے کہ نظیر کو جو قدرت اردو زبان پر حاصل ہے اور جس عمدگی اور خوبی کے ساتھ وہ اپنے مطالب موقعے اور محل کو پیش نظر رکھ کر بیان کر جاتے ہیں اچھے اچھے شاعر بھی وہاں درماندہ نظر آتے ہیں۔

نظیر کا احسان ہماری اردو زبان پر یہی نہیں کہ انھوں نے بہت زیادہ الفاظ اپنے کلام میں جمع کر دئے بلکہ وہ اس وجہ سے اور زیادہ شکریے کے لائق ہیں کہ انھوں نے فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جس کے مواقع ان کو حاصل تھے اور انھوں نے اپنے ذخیرۂ معلومات کو اپنی دلکش نظموں میں خوبی کے ساتھ سجایا۔ کثرت الفاظ کے ساتھ تو یہ عیب بھی ہے کہ بعض بھدے اور من گھڑت لفظ داخل زبان ہو گئے لیکن جو نقشہ نظیر اپنی نظموں میں کھینچتے ہیں اور جو مرقع پیش کرتے ہیں اس میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑی بڑی باتوں تک کا خیال ہے اور وہ بلاتکلف بے کم و کاست سب کچھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں

کہ بعض بعض جگہ وہ اپنے خیالات دہرا دیتے ہیں اور الفاظ کی نشست اور حشو و زوائد کی مطلق پروا نہیں کرتے مگر بعض نظمیں تو ایسی عمدہ اور صاف ہیں کہ کوئی نقص ان میں نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ نظیر نے جو کچھ لکھا ہے اپنی طبیعت کے تقاضے سے لکھا ہے۔ وہ ایک بڑے شاعر کیا معمولی شاعر بھی بننے کا خیال نہ رکھتے تھے۔ ان میں شاعری کا مادہ فطرت نے ودیعت کر دیا تھا۔ جس مضمون پر لکھنا چاہا قلم اٹھایا اور لکھ دیا۔ یہ کبھی خیال نہ کیا کہ ہمارے الفاظ یا خیالات پر سخن فہم و نکتہ داں حضرات کیا کہیں گے۔ اگر وہ اس امر کا لحاظ کرتے تو ان کی شاعری کی روح مقید ہو جاتی اور جو کچھ ان سے ظہور میں آیا ہرگز وجود میں نہ آتا۔ البتہ اگر وہ اپنے کلام پر نظر ثانی فرماتے تو عجب نہ تھا کہ جو خامیاں ہم کو نظر آتی ہیں وہ دور ہو جاتیں۔

نظیر کو ہماری نیچرل شاعری کا موجد سمجھنا چاہئے۔ آزاد اور حالی اس لحاظ سے نظیر کے مقلد ہیں کہ آخرالذکر نے وہ شاہراہ پہلے ہی تیار کر دی تھی جس پر آزاد اور حالی گامزن ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ ان صاحبان نے اپنی نظمیں لکھنے میں نظیر کا مطلق چربا نہیں اتارا بلکہ انگریزی اور مغربی طرز بیان کا خاکہ کھینچا ہے اور اس کو مقامی رنگ دے کر ایک جدید شے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ لیکن اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اگر ہم پر انگریزی اور مغربی خیالات کا سایہ بالکل نہ پڑتا اور ہم صرف کلیات نظیر ہی دیکھتے رہتے تو ہمارے شعرا اس صنف شاعری کی طرف ضرور متوجہ ہو جاتے۔

نظیر کی نظمیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں۔ عنفوان شباب میں جس طرح وہ غلط کاریوں کے مرتکب ہوئے اسی طرح شاعری میں بھی وہ فحش کہنے پر اتر آئے لیکن جب مصرع شباب نے شیب سے بدل کی عروج گذرا زوال آیا تو آپ کی شاعری پستی سے بلندی کی طرف مائل ہوئی اور آخر کار اس درجے پر پہنچ گئی جس پر ہم اس کو آج دیکھتے ہیں۔ آپ کا جس قدر کلام رکیک اور فحش ہے یقیناً ابتدائی زمانے کا ہے۔ بعد میں زبان کے لحاظ سے جو بے راہ روی نظر آتی ہے وہ تو ان کی خاص صفت ہے ورنہ کلام میں پختگی اور متانت اسی وقت سے پیدا ہوئی جب وہ ایک تجربہ کار اور معمر انسان ہو گئے۔ خیالات بدل گئے، زبان بدل گئی اور معرفت پیدا ہو گئی۔

نظیر اور انشا میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر نے دنیا کا تجربہ کیا، آزادہ روی کے ساتھ سب سے
ملے جلے، اپنے آپ کو کسی کے ہاتھ فروخت نہیں کیا، دنیا اور مال دنیا کو ہیچ سمجھا، جو کچھ کہا اپنی طبیعت
کے تقاضے سے کہا، کسی کی فرمائش سے نہیں کہا۔ لیکن آخر الذکر نے ملازمت کے پیچھے اپنے آپ کو
تباہ و برباد کر لیا۔ جو کچھ کہا دوسروں کی فرمائشوں سے کہا یا اس وجہ سے کہا کہ لوگ اس نوع شاعری
کو بہت پسند کرتے ہیں۔ جس قدر فضل و کمال سید انشا میں موجود تھا اگر وہ اس کے اعتبار سے جدت
اختیار کرتے تو یقیناً بہت بہتر ہوتے لیکن ان کو تو دنیا اور مال دنیا کے پیچھے یہ نظر ہی نہ آیا کہ

شاعری جزویست از پیغمبری

اول الذکر تو شباب کی بدعنوانیوں کے بعد سنبھل بھی گئے لیکن انشاء اللہ خاں تو روز بروز بد سے بدتر
ہوتے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ رکیک اور فحش الفاظ و خیالات کے لکھنے میں دونوں برابر ہیں بلکہ
نظیر انشا سے بھی اس بارے میں گوئے سبقت لے گئے ہیں لیکن آپ انصاف سے کہیے کہ ایک
شخص جو مقطع صورت بنائے ہوئے ہو اور بھلے آدمیوں کا سا لباس پہنے ہوئے ہو اس کی زبان
سے نالائم الفاظ بھی مکروہ معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ برخلاف اس کے ایک رنگیلے، بانکے، نوجوان کی
زبان سے بے پروائی کے ساتھ اگر فحش الفاظ بھی نکل جائیں تو وہ کیا اتنے ہی برے معلوم ہوں گے۔
پھر سید انشا تو جہاں سے چلے تھے وہیں رہے۔ نظیر کی ابتدا برے ماحول میں ہوئی لیکن انجام اچھا
ہوا۔ سید انشا کا کلام از ابتدا تا انتہا یکساں ہے۔ وہی تمسخر اور ظرافت جو ابتدائی کلام کا طرۂ امتیاز
ہے آخر عمر کے کلام میں بھی بدستور باقی ہے۔ خیالات اور الفاظ میں کسی قسم کی کوئی ترقی نظر نہیں آتی لیکن
نظیر کے یہاں بالکل اس کے برعکس ہے۔ خیالات تو بے حد بلند اور ارفع ہو گئے ہیں۔ زبان میں البتہ
کم فرق ہوا ہے۔ وہ آمد کی رو میں الفاظ کی عمدگی کو فراموش کر جاتے ہیں لیکن برجستگی قائم رکھتے ہیں۔
پھر بھی فرق ضرور ہے۔ خیالات کے ساتھ ساتھ اور بھی کچھ فرق نہ ہو تو فحش اور رکیک الفاظ تو خود بخود
غائب ہو جاتے ہیں۔ غریب اور نامانوس الفاظ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ قواعد شعر سے پہلے بھی بے پروائی
تھی اب بھی اسے قائم رکھتے ہیں لیکن اس پر بھی بعض اوقات جب کوئی نظم فن کے اعتبار سے عمدہ

لکھ جاتے ہیں تو وہ بے نظیر ہوتی ہے۔ میرانیس بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں دکھا سکتے۔

ہمارے نزدیک جو اصحاب نظمیں کہنے کے شائق ہوں انھیں زبان دانی کے لحاظ سے کلام نظیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کو اپنی لیاقت خداداد پر بھروسہ کر کے شروع سے آخر تک نظیر کا کلام پڑھ لینا چاہیے اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرنا چاہیے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو نہایت عمدہ ہیں اور دیگر شعرا کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ یہ شاعر ہندی الفاظ کو عمدگی کے ساتھ ادا کرنے کا بادشاہ ہے۔ اگر متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان الفاظ کو اپنی اپنی نظموں میں شعرائے حال کھپائیں تو ان کی نظموں کی رونق دوبالا ہو جائے۔ نہ مجھ کو اتنی مہلت ہے، اور نہ یہاں اتنی گنجائش ہے کہ میں آپ کی نظموں کے نمونے پیش کروں۔ صرف دو چار عنوان پیش کرتا ہوں۔ شائقین کلام نظیر خود ملاحظہ کریں۔ بنجارے کی نظم، روضۂ تاج گنج، حمد کی تمام نظمیں، پیری کی سواری اور سفرِ آخرت کی تیاری، طلسمِ زندگی یا چونسٹھ گھڑی کا تماشا، مذمت دنیا، توکل و تجرید، توحید (یہ نظم نہایت عمدہ ہے)، دنیا دار المکافات ہے، دنیا دھوکے کی ٹٹی ہے، اسرار قدرت، آدمی کی نظم وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم ذیل میں نظیر کی غزلیات کے بہتر منتخب اشعار درج کرتے ہیں:-

ہو کیوں نہ ترے کام میں حیران تماشا — یارب تری قدرت میں ہے ہر آن تماشا

شورافگنِ جنوں ہے جس جا نگاہ کرنا — رکھتا ہے کام ہمدم واں ضبط آہ کرنا

یہ غنچہ جو بے درد گل چیں نے توڑا — خدا جانے کس کا یہ نقشِ دہن تھا

گردش سے عشرت میں کٹی رات تو پھر کیا — اور غم میں بسر ہو گئی اوقات تو پھر کیا

جب آئی اجل پھر کوئی ڈھونڈا بھی تو پایا — قصوں میں رہے حرف و حکایات تو پھر کیا

لے لے کے بلائیں مجھے یہ کہتی ہیں آنکھیں — "صدقے ترے پھر ایک نظر مجھ کو دکھا لا"

صحرا میں مرے حال پہ کوئی بھی نہ رویا — گر پھوٹ کے رویا تو مرے پانو کا چھالا

اس ابروئے خم دار کی صورت سے عیاں ہے — خنجر کی شباہت، دمِ شمشیر کا نقشا

قاصد صنم نے دیکھ مرے خط کو کیا کہا؟ — حرفِ عتاب یا سخنِ دل کشا کہا؟

ترے جمال کی سورج جھلک نہ دیکھ سکا
کھلی نقاب ہی جب تک نہ دیکھ سکا

گلی کی خاک بھی ہو کر نہ ٹھہرنے پائے
ہمیں تو آہ! فلک یاں تلک نہ دیکھ سکا

نظیر اُس کے فضل و کرم پر نظر رکھ
فقل حسبی اللہ نعم الوکیلا

اس کے شرارِ حسن نے جلوہ جو اک دکھا دیا
طور کو سر سے پانو تک پھونک دیا جلا دیا

خرام ناز سے اس شوخ نے دامن کو جب جھٹکا
ہماری خاک نے کیا آیا ہوا کے ساتھ سر پٹکا

نظیر آرام سے گر تجھ کو اس دنیا میں رہنا ہے
سوا اللہ کے ہرگز کسی سے دل کو مت اٹکا

شہرِ دل آباد تھا جب تک وہ شہر آرا رہا
جب وہ شہر آرا گیا پھر شہرِ دل میں کیا رہا

محو تدبیر ہیں ہم، لیک خدا ہی جانے
کون سا گل ہے پس پردہ تقدیر کھلا

ادھر اس کی نگہ کا ناز سے آکر لپٹ جانا
ادھر مرنا، تڑپنا، غش میں آنا، دم الٹ جانا

دیکھیے جلوہ جو اس کے حسنِ بالا دست کا
حوصلہ اتنا کہاں اپنی نگاہِ پست کا

بے صدا آکر لگا اور ہو گیا سینے کے پار
یہ خدنگ صاف تھا کس بے نشاں کی شست کا

اک پردۂ ہستی نہ رہا جوں نظر آیا
وہ پردہ بر انداز ہمیں کیوں نظر آیا

اس مہر پر انوار سے شبنم کی طرح ہم
گم ہوتے گئے ہم کو وہ جوں جوں نظر آیا

سرسبز دل جلوں کو نہ ہرگز کرے فلک
دانہ کہیں اگا ہے جو آتش میں جل گیا

نہ گل اپنا، نہ خار اپنا، نہ ظالم باغباں اپنا
بنایا آہ کس گلشن میں ہم نے آشیاں اپنا

پہنچے نہ ذیلِ وصف میں دست اسکے عام کا
موصوف ہو جو خاص خدا کے کلام کا

ہم نے چاہا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد
وہ بھی کمبخت ترا چاہنے والا نکلا

دیکھ سبزوں کی طراوت کو زمیں پڑھتی ہے
آیۂ انبتہم اللہ نباتاً حسنا

چمن طرازِ حقیقی نے اپنی صنعت سے
کسی کو پھول بنایا، کسی کو گھاس کیا

وصل اس کا ہوتا، کیوں کر میسر
وہ نورِ جان تھا، میں آب و گل تھا

نہ آئی بو جو ذرا تیرے مصحفِ رخ کی
نسیم پھاڑ گئی آ کے ہر ورق گل کا

ہم وہ درخت ہیں کہ جسے دم بدم اجل
ارّہ اِدھر دکھاتی اُدھر ہے تبرِ قضا

لائے خاطر میں ہمارے وہ دلِ مغرور کیا
جس نے کہ آگے مہر کیا، مہ کیا، پری کیا، حور کیا

دل ہوا جس دن سے بسمل ابروئے دلخواہ کا
تھا وہی پہلا دن اس بسمل کی بسم اللہ کا

کیوں نہ عشرت دو چند ہو جو ملے
یارِ مہ چہرہ اور شبِ مہتاب

فرصتِ عمر، قطرۂ شبنم
وصلِ محبوب، گوہرِ نایاب

گردشِ آسماں میں ہم کیا ہیں
پرِ کاہ ہے میانۂ گرداب

جسم کیا؟ روح کی ہے جولانگاہ
روح کیا؟ اک سوار پا بہ رکاب

دل سا دُرِ یتیم بکا کوڑیوں کے مول
کیا کہیے، خیر یہ بھی خریدار کے نصیب

کچھ ہم کو امتیاز نہیں صاف و دُرد کا
اے ساقیانِ بزم، بیارید ہر چہ ہست

نظیر یار سے کیوں دردِ دل نہیں کہتا
سنا نہیں ہے وہ تو نے کہ سانچ کو کیا آنچ

رکھتے ہیں ہم شمس و قمر کا سا تفاوت
نورِ یدِ بیضا و کفِ پائے محمدؐ

ہرگز نہ پلائے تو مجھے آنکھ بدل کر
ساقی ترے کوچے سے نہ جاؤں گا سنبھل کر

دنیا ہے اک نگارِ فریبندہ جلوہ گر
الفت میں اس کی کچھ نہیں جز کلفت و ضرر

بندے کے قلم ہاتھ میں ہوتا تو غضب تھا
صد شکر کہ ہے کاتبِ تقدیر کوئی اور

کفش برداری سے اس مہر کی چمکا ہے نظیر
ورنہ کیا خاک تھی اس ذرۂ بے قدر کی قدر

چشم بد دور اسی رُخ سے ہوئی تھی روشن
مشعلِ وادیِ ایمن، شجرِ طور کی شمع

مر کر بھی تہِ خاک نہ آسودہ ہوئے آہ!
اے عشق نہ تھے ہم ترے انجام سے واقف

ملنے کا پیام اس سے کہو جا کے عزیزو
جو اس کے نہ ہو وصل کے پیغام سے واقف

یار ملا جب اے نظیر میرے گلے، تو مل گئے
جسم سے جسم، جاں سے جاں، روح سے روح، دل سے دل

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بٹھلائیں ایسے دیوانے کو ہم

ان سنگ دل بتوں کا گلہ کیا کروں نظیرؔ
میں آپ اپنے شیشۂ دل کی شکست ہوں

تفرقہ ہوتا ہے ایسا بھی گل اندام کہیں ؟
مے کہیں، شیشہ کہیں، ساقی کہیں، جام کہیں

دل کی بیتابی نہیں ٹھہرنے دیتی ہے مجھے
دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

چھوٹا سا خال اس رخ خورشید تاب میں
ذرہ سما گیا ہے دل آفتاب میں

طوفاں اٹھا رہا ہے مرے دل میں سیل اشک
وہ دن خدا نہ لائے جو میں آبدیدہ ہوں

سرچشمۂ بقا سے ہرگز نہ آب لاؤ
حضرت خضر، کہیں سے جا کر شراب لاؤ

ہم سے تو آج بھی نہ ملا وہ نگار، آہ!
ہم عید کے بھی دن رہے امیدوار آہ!

جس کی آنکھوں نے کیا بزم دو عالم کو خراب
کوئی اس فتنۂ دوراں سے کہو "عشق اللہ"

مصحف رخ پہ ترے ابروئے پیوستہ نہیں
مو قلم سے ید قدرت نے لکھا "بسم اللہ"

نہیں ہوا میں یہ بو نافۂ ختن کی سی
لپٹ ہے یہ تو کسی زلف پر شکن کی سی

کہاں تو اور کہاں اس پری کا وصل نظیرؔ
میاں تو چھوڑ یہ باتیں دوانے پن کی سی

ہنسے، روئے، پھرے، رسوا ہوئے، جاگے، بندھے، چھوٹے
غرض ہم نے بھی کیا کیا کچھ محبت کے مزے لوٹے

ہماری روح تو پھرتی ہے معشوقوں کی گلیوں میں
نظیرؔ اب ہم تو مر کر بھی نہ اس جنجال سے چھوٹے

جو تو کہتا ہے اے غافل "یہ میرا ہے یہ تیرا ہے"
یہ جس کا ہے اسی کا ہے نہ تیرا ہے نہ میرا ہے

ترقی میں تنزل ہے، تنزل میں ترقی ہے
اندھیرے میں اجالا ہے، اجالے میں اندھیرا ہے

نظیرؔ اللہ اللہ! اس جہاں میں دم غنیمت ہے
کہاں ہم اور کہاں پھر تم کوئی دم کا بسیرا ہے

کل شب وصل میں کیا جلد کٹی تھیں گھڑیاں
آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

بے زری، فاقہ کشی، مفلسی، بے اسبابی
ہم فقیروں کے بھی ہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے

بیٹھے بٹھائے خلد میں ابلیس نے نظیرؔ
کیا دم دیا ہے حضرت آدم کو دیکھئے

زلف ہو بر سر احساں تو گرفتار کرے
چشم کی عین عنایت ہو تو بیمار کرے

جنت کے لئے شیخ جو کرتا ہے عبادت
کی غور جو ظاہر میں تو مزدور کی سوجھی

رباعیات مستغنی

ملا عبدالعلی صاحب مستغنی موجودہ شعرائے افغانستان میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ آپ درو‌ک کے ایک معزز خاندان سے ہیں۔ آپ کے والد ملا رمضان علی صاحب امیر حبیب اللہ خاں کے استاد تھے۔ آپ کے اشعار سلیس اور رواں ہوتے ہیں۔ استعارات اور تشبیہات سے آپ بہت کم کام لیتے ہیں۔ آپ کی چند رباعیات ناظرین جامعہ کی خدمت میں پیش ہیں۔

کردند بنے بلند عنوان ہنر
عالی تر از افلاک بود شان ہنر
مارا نتواں گفت بجز باد بدست
دستی نزدیم اگر بدامان ہنر

آب رخ ہر قوم ہنرمندانند
اقبال دہندۂ وطن مردانند
ننگ ملک اند و عار ملت بجہاں
آنانکہ سفیہ و دون وبے دردانند

نام وطن ار بلند سازی مردی
گر جامعہ ارجمند سازی مردی
باللہ غلط است اینکہ گویند عوام
شیر افگنی فیل بند سازی مردی

برخیز کہ بہر ملک کارے بکنیم
خیر وطن آنچہ ہست بارے بکنیم
چیزے کہ بود مفید اولاد وطن
آں پیشہ رویہ وشعارے بکنیم

مسعود کسے کہ نام نیکوئے برد | از اہلِ سعادت بجہاں گوئے برد
از گلشنِ اخلاق گلے دستہ نمود | از گلبنِ بے خارِ حیا بوئے برد

ہر گل بود اسیرِ ز گلستانِ وطن | صد شکر کنوں بلند شد شانِ وطن
ایں فردِ وطن پرست ایں نادرِ عصر | شد چشمِ وطن، روحِ وطن، جانِ وطن

بے شغلِ وطن گر آب و ناں بے طلبی | سود لیست کہ از جنسِ زیاں بے طلبی
جز کوریِ باطن نبود، ہیچ دلیل | از گوش اگر کار زباں بے طلبی

عالم ہمہ جسم آمد و جانِ است عمل | سود ہمہ کس در دو جہان است عمل
اے ترکِ عمل نمودہ از بد عملی | آخر کہ ترا گفت زیان است عمل

شرط است پئے اہلِ جہاں کوشیدن | خوب است ترا از دل و جاں کوشیدن
رفتن ز زمیں بآسماں نیست محال | سہل است بسے اگر تواں کوشیدن

برخیز دلا کہ وقت کار است کنوں | ہنگامِ گل و فصلِ بہار است کنوں
سیرِ چمن و رفتنِ گلگشت ضرور | بے کار تریں ننگ و عار است کنوں

کارے بکن اگر بخویش کارے داری | از خود بفشاں اگر غبارے داری
بے شغل بود حیات مشکل بجہاں | تا جاں بہ تن است کار و بارے داری

اقوام و ملل چو خویش و پیوند ہم | رونے دو دریں جہاں کہ باشند ہم
ناسازی و بیگانگی از سر بنہند | یارانہ برادرانہ سازند ہم

از اہل زمانہ مردم آزار بد است | آدم صورت بسیرت ماربد است
در گلشن کائنات تا خار گل است | خوبست بگل شبیہ چوں خاربد است

تارسم زیان و شیوۂ سودے ہست | از اہل زمانہ چشم بہبودے ہست
ہر وقت زیاں سراغ سودے دارد | امید ز آتش است تا دودے ہست

تا قید حیات کار می باید کرد | سعی و عمل اختیار می باید کرد
از تنبلی کہ مردنش باید گفت | گر عقل بود کنار می باید کرد

از علم علاج جہل باید کردن | دشوار زمانہ سہل باید کردن
در ترک کمال و کار نااہل مشو | خود را بکمال اہل باید کردن

باید بجوانی غم پیری خوردن | تا کے غم میری و تیری خوردن
باید خوردن رشک کمال و ہنرت | نے رشک امیری و فقیری خوردن

تنقید و تبصرہ

کتب

جنگ و جدل۔ اصنام خیالی۔ تجدید عمل۔ چھپتا بھائی۔ فلسفۂ ارکان اسلام۔ سرگزشت ادب ترکی۔ ہماری قومی ضروریات۔ سیر الصحابہؓ جلد ششم

جنگ و جدل | مترجمہ سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۴۰ صفحہ، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی بک ڈپو، علی گڑھ۔

یہ ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ ہے ملک کے مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب کے قلم سے۔ سید صاحب کا یہ احسان اردو ادب پر ہمیشہ رہے گا کہ آپ نے ترکی ادب کے بہترین نمونوں کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اس کی توسیع میں مدد دی اور اپنے ہم زبانوں کو ترکوں کی سیرت اور زندگی کے مطالعے کا موقع دیا مگر خدا جانے یہ ترکی قوم کی سنجیدہ، سپاہیانہ طبیعت کا عکس اس کے ادب میں نظر آتا ہے یا اس کے اہل قلم کے ذوق کی خصوصیت ہے یا سید صاحب کے ترجمے کا کرشمہ ہے بہر حال آپ کے جتنے ترجمے اردو میں شائع ہوئے ہیں قریب قریب سب کی زبان سخت اور کرخت اور اسلوب بیان بے رس، بے لوچ ہوتا ہے۔ نہ توروانی شگفتگی اور سلاست کا لطف ہوتا ہے نہ شوکت وقار اور متانت کا۔ قصے میں جن مسائل کا ذکر آجاتا ہے ان کے ڈھانچ پر جذبات، واقعات، سیرت اور کردار کا گوشت پوست چڑھانے کی کوشش ناکام رہتی ہے۔ ترجمے میں سید صاحب اصل ترکی زبان کا لطف پیدا کرنے کے لئے لفظوں اور ترکیبوں کی ندرت سے کام لیتے ہیں جو بعض اوقات عجب مضحک صورت اختیار کرتی ہیں۔ "جنگ و جدل" میں یہ سب خصوصیات پوری طرح نظر آتی ہیں۔ ہم نمونے کے طور پر ایک ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے ان باتوں کا خفیف سا اندازہ ہو جائے گا۔

> "مجدی۔ عورتوں کی تفریق اور ان کی قدر و قیمت کے متعلق میرا ایک اور معیار ہے۔ میں ان عورتوں کو شوپن کے والس سے تشبیہ دیتا ہوں......... ظاہرا ان میں فرق نہیں......

مگر تھوڑی سی تدقیق نظر سے تھوڑی سی معرفت سے، جس طرح شوپن کے رقص کی ممتازیت،
شوق و اصالت ادا بہ مقابلہ اور رقصوں کے ظاہر ہونے لگتی ہے اور جس طرح اس کی
روح اپنی نجابت اور صنعت سے انسان کو مسحور کردیتی ہے...... جو لوگ عورتوں پر غائر
نظر ڈالتے ہیں اور ان کی نفاست و محاسن پر غور کرتے ہیں ان کے لئے عورتوں میں بھی
ایسے ہی فرق نظر آتے ہیں...... ہم لوگ ایسی عورتوں کی معمولی عورتوں سے زیادہ
روحی وجد سے پرستش کرتے ہیں۔"
ذرا خط کشیدہ الفاظ کے استعمال پر غور کیجئے۔

بہرحال ترکی قوم دنیا کی بڑی قوموں میں سے ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کو اس سے ایک خاص محبت ہے اس کا ادب ہمارے لئے یقیناً دلکشی رکھتا ہے۔ سید صاحب کے سوا ہندوستان میں بظاہر اس کا ترجمان اور کوئی نہیں، اس لئے اس کتاب کا مطالعہ ہمیں ضرور کرنا چاہئے۔ یہ ایک ادبی فرض ہے جس سے ہمیں کسی طرح مفر نہیں۔

اصنام خیالی | از جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۰x۳۰/۱۶ حجم ۱۵۲ صفحہ، لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: "کتابستان" ۱۷ سٹی روڈ، الہ آباد۔

جلیل قدوائی کے نام سے شائقین ادب خوب واقف ہیں۔ آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنھیں خدا نے شاعری اور انشاپردازی کا سچا ذوق بھی دیا ہے اور اس ذوق کی تربیت کی توفیق بھی دی ہے۔ آپ کی ہمت ترقی کی سعی میں ہمیشہ مصروف رہتی ہے۔ آپ کی طبیعت مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے سے اپنی قوتوں کو بڑھاتی رہتی ہے۔ "اصنام خیالی" کے نام سے آپ کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں سے چھ طبعزاد ہیں، ایک ترگنیف کے "ایک موپاساں" کے افسانے کا اور چھ چیخوف کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ ترجمے کے لئے افسانوں کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ جلیل صاحب کے حسن ذوق نے لفظی ترجمے کی پابندی کے ساتھ ساتھ اردو روزمرہ کا بڑی حد تک خیال رکھا ہے مگر آپ کا اصلی کمال طبعزاد افسانوں

میں نظر آتا ہے۔ ان میں قصے کا جز محض برائے نام ہے مگر معاشرت اور زندگی کی سچی تصویر، خیالات اور جذبات کی نفسیاتی تحلیل کچھ عجب دلکشی رکھتی ہے خصوصاً "مارپیٹ" اور "بے لطف زندگی" میں شدت احساس کے ساتھ ساتھ صناعانہ ضبط نے آرٹ کا حقیقی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ کتاب کے ساتھ پروفیسر محمد مجیب صاحب کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں افسانہ نویسی کے فن پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے خصوصاً روسی افسانوں کی خصوصیات بڑی خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بھی جلیل صاحب کی اور کتابوں کی طرح بہت مقبول ہوگی۔

تجدید عمل | از مرزا عسکری علی خاں مجازی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۹۴ صفحہ، لکھائی چھپائی معمولی، کاغذ نفیس۔ قیمت ۸ر۔ ملنے کا پتہ: اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔

یہ کتاب لاہور کی اینٹی ریلیجس (مخالف مذہب) سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے جس کے مقاصد یہ ہیں:-

(۱) ذہن کو توہمات کی تاریکی سے نکال کر روشن دنیا میں لانا۔

(۲) مقلدوں کو محقق بنانا۔

(۳) سوشل زندگی میں ہمرنگی پیدا کرنا۔

مصنف کے نزدیک یہ کتاب "سوسائٹی کا ایک جدید نظام" اور "مذہب کا ایک جدید آئیڈیل" پیش کرتی ہے مگر ہمارے خیال میں یہ محض ان کا حسن ظن ہے۔ اصل میں اس میں مذہب کے متعلق وہ شبہات جو ثبوتیت کے دور میں مغرب میں عام طور پر پیدا ہوگئے تھے بیان کئے گئے ہیں۔ ثبوتی نقطۂ نظر جس میں ہر چیز کے لئے حواس اور مشاہدے کی شہادت ضروری سمجھی جاتی ہے مذہب کیا کل وجدانی چیزوں سے انکار کرتا ہے اور انھیں انسان کے دور جہالت کی یادگار سمجھتا ہے۔ مگر کتاب میں یہ نقطۂ نظر ترتیب اور تسلسل کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا بلکہ بعض منتشر خیالات مذہب کی نفسیاتی تحلیل اور ساخت گناہ اور ثواب، معجزات، ابطال تناسخ کے متعلق ظاہر کئے گئے ہیں جن میں کسی قسم کا ربط نہیں۔ مصنف نے عقیدے کی تعریف کی ہے

"وہ خیال جس میں استدلال کی شرکت نہیں ہوتی" اس کے لحاظ سے خود ان کے کل خیالات محض عقائد ہیں کیونکہ سوائے ابطال تناسخ کے اور کسی جگہ استدلال کا نام بھی نہیں۔ ایک مستقل باب بدھ مت کی تنقید کا ہے جس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ یہ مت بہت اچھا ہے اور مصنف کو بہت پسند ہے مگر اس کا مطلق ذکر نہیں کہ یہ ہے کیا۔ غرض کتاب میں محض مذہب کے موجودہ تخیل کے متعلق چند شکوک بہت سطحی اور بے ربط طریقے سے ظاہر کر دیے گئے ہیں۔ "مذہب کا جدید آئیڈیل" اور "سوسائٹی کا جدید نظام" ہمیں ان ۹۴ صفحوں میں بار بار تلاش کرنے سے بھی نہیں ملا۔ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت سنجیدگی اور متانت سے کیا ہے۔ دوسرے مخالفین مذہب کی طرح طنز اور تمسخر سے کام نہیں لیا مگر اسی کے ساتھ اس بات کی شکایت ہے کہ چند سطحی مضامین کے متعلق اس قدر بلند آہنگ دعوی کرنا اور "کیف الہامی" کے عنوان سے اس قسم کی خطیبانہ عبارت لکھنا جس کا آغاز "آہ! میرے زریں خیالات" سے ہوتا ہے بڑے اوچھے پن اور عامیانہ مذاق کی چیز ہے۔ یہ پنجاب کے بانیان مذاہب کے لئے جائز ہو مگر اس شخص کے لئے ہرگز روا نہیں جو "عقلیت" "انسانیت" اور "فلسفے" کا نام لے کر انجمن مخالفین مذہب کا علم بردار بنتا ہے۔ بہرحال کتاب میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو غور سے پڑھنے کی چیز ہے اور جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان میں مذہب کو کس قسم کے حملوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجازی صاحب تو خیر بڑے محقق اور نقاد ہیں مگر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے شکوک مذہب کے متعلق حقیقی غور و فکر پر مبنی ہیں اور جن سے حامیان مذاہب کو ایک نہ ایک دن سابقہ پڑے گا۔

چچیتا بھائی | از مرزا عظیم بیگ چغتائی، تقطیع خورد، حجم ۱۵۲ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، کاغذ متوسط، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: اردو بک اسٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور۔

مرزا صاحب نے اس کتاب میں اپنے اور اپنے بہن بھائیوں کے بچپن کے حالات نہایت ہی دلچسپ اور انوکھے انداز میں بیان کئے ہیں۔ زبان بالکل ٹھیٹھ اردو جو ہم روزمرہ اپنے گھروں میں بولتے چالتے ہیں۔ طرز بیان ایسا سیدھا سادا دلچسپ اور دل نشیں کہ کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے

چین نہ آئے بچپن کی بھولی بھالی شرارتیں، آپس کی لڑائیاں پھر صلح صفائی، ماں باپ کی محبت اور شفقت، بھائی بہنوں کی آپس کی محبت اور خلوص۔ ان سب چیزوں کا ایسا مطابق فطرت نقشہ کھینچا ہے کہ بچپن کی زندگی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ بعض بعض جگہ ایسے رقت انگیز مناظر ہیں کہ بے اختیار آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ البتہ مرزا صاحب بعض ایسے الفاظ یا محاورے استعمال کر گئے ہیں جو عام طور پر بولے نہیں جاتے مثلاً سربراہ (صفحہ ۵۴)، نبیئے (صفحہ ۲۴)، میں نے اک کی نہ دھک، لوہے لگ گئے (صفحہ ۶۰)، مگر ٹوٹی کی بوٹی نہیں (صفحہ ۹۴)، کچھ عجیب نیلا سا بھرا رہتا ہے (صفحہ ۱۱۰)، مکان تنور کی طرح ڈنڈک رہا تھا (صفحہ ۱۲۶)۔

کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ بھی ہے جس میں تمام مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کے لئے تو دلچسپ ثابت ہوگی بڑے اور بوڑھے بھی اسے مزے لے کر پڑھیں گے خصوصاً ان لوگوں کے لئے یہ کتاب نمونے کا کام دے گی جو بچوں کے لئے بچوں کی زبان میں کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

فلسفۂ ارکان اسلام | مصنفہ مولوی حافظ عبدالوکیل صاحب خطیب تقطیع $\frac{20\times30}{16}$، ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت، وطباعت معمولی قیمت ۲/۔ ملنے کا پتہ: کتب خانۂ وحدانیہ، نواب گنج، دہلی۔

اس کتاب میں مولانا حافظ عبدالوکیل صاحب نے ارکان اسلام روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ اور ان کے متعلقات کے فلسفے کی تشریح کی ہے۔ طرز بیان الجھا ہوا ہے اور عبارت قدیم طرز کی مولویانہ ہے۔

سرگزشت ادب ترکی | از سید ریاست علی صاحب ندوی۔ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$، ضخامت ۴۰ صفحات۔ کتابت عمدہ، کاغذ اور طباعت متوسط۔ قیمت ۳/

یہ اصل میں ایک عربی مضمون کا ترجمہ یا ملخص ہے جو معارف کے کسی پچھلے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے اور اب جناب ریاست علی صاحب ندوی نے حذف و اضافے کے بعد اسے رسالے کی شکل میں شائع کیا ہے۔

مضمون نگار نے ترکی ادبیات کی تاریخ اس خوبی و اختصار کے ساتھ بیان کی ہے کہ مختصری گنجائش میں عہد اول سے لے کر موجودہ دور تک کے حالات آ گئے ہیں۔ ریاست علی صاحب نے اس اہم مضمون کا ترجمہ کر کے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔

ہماری قومی ضروریات | از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)، تقطیع ۱۷×۲۷/۸، حجم ۲۰ صفحات
کتابت، طباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت اور پتہ درج نہیں۔

یہ ایک فاضلانہ تقریر ہے جو میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن)، مدیر ہمایوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس ۱۹۳۳ء میں پڑھی تھی۔

اپنی اس تقریر میں آپ نے بتایا ہے کہ ہندوستان ایک ترا ہا (دیاسہ راہا) ہے جہاں ہندوانی، اسلامی اور عیسائی تین بڑے تمدن آ کر ملتے ہیں۔ ان تینوں تہذیبوں کا اجتماع یہاں ایک مدت سے ہے اور ان میں اکثر تصادم بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتایا ہے کہ دنیا کی دوسری قومیں کیسے طوفانی دور سے گزر رہی ہیں۔ ان میں باہمی کشاکش گتھم گتھا اور اینچا تانی نے کس قدر خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان بھی اسی کشاکش حیات میں مبتلا ہیں اور اسی خطرناک دور سے گزر رہے ہیں۔ آج کل زندگی جد و جہد کا نام ہے اور وہی قوم زندہ رہنے کی مستحق ہو گی جو اس جد و جہد میں حصہ لے گی اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرے گی۔

اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کا نصب العین بتایا ہے اس سلسلے میں آپ فرماتے ہیں کہ :۔

ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام پر قائم رہ کر موجودہ زمانے میں اجتماعی اور انفرادی طور پر ایک کامیاب اور شاندار زندگی بسر کر سکیں۔ اس انتہائے کمال تک پہنچنے کے لئے ہمیں بعض رکاوٹوں کو دور کرنا ہے، بعض پر سے محض پھاند جانا ہے، اور بعض کو ایک حد تک اپنے حسب منشا بنا کر کچھ انھیں تبدیل کرنا اور کچھ خود تبدیل ہو جانا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اسلام کی کچھ اچھی باتوں، وحدت، اخوت، مساوات اور رواداری کی تشریح کی ہے اور بتایا ہے کہ دنیا آہستہ آہستہ انھیں زریں اصولوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ پھر

آپ نے زمانہ کی مقتضیات کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے اور کونسی شاہ راہ ان کے لئے مفید ہے۔ اس سلسلہ میں تعلیمی، معاشرتی، مذہبی غرض ہر قسم کے مسائل آ گئے ہیں اور مقرر نے نہایت اعتدال کے ساتھ اور سلجھے ہوئے انداز میں ان پر بحث کی ہے۔ غرض پوری تقریر اسی قسم کے اہم اور مفید مسائل سے لبریز ہے۔ رسالہ کی زبان صاف اور طرز ادا دل نشین ہے۔

سیر الصحابہ جلد ششم | از مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دار المصنفین۔ حجم ۳۰۶ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ کتابت، طباعت اور کاغذ بہترین، قیمت سے۔ ملنے کا پتہ: دار المصنفین اعظم گڈھ۔

شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے یہ جلد حضرت امام حسنؑ، حضرت امیر معاویہ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کے حالات میں لکھی ہے۔ تاریخ اسلام کا یہ عہد فتنہ و فساد کا عہد کہلاتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت سے اس فتنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس میں مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے۔ بنی امیہ اور بنو ہاشم کی سیاسی رقابتیں ابھر آتی ہیں اور ہزاروں لاکھوں مسلمان اس باہمی اختلاف و عداوت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ آخر حضرت امیر معاویہ اپنی سیاسی دانشمندی کی بدولت خلافت پر قابض ہو جاتے ہیں اور اسلام کی صحیح جمہوری حکومت کو قیصر و کسریٰ کی حکومت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بہت سی اہل اور لائق شخصیتوں کے ہوتے ہوئے اپنے صاحبزادہ یزید کو اپنا ولی عہد منتخب کرتے ہیں اور لوگوں سے زبردستی اس کی بیعت کا عہد لیتے ہیں۔ ان کی یہی خطرناک غلطی اس واقعۂ الم کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے جو عام طور پر واقعۂ کربلا کے نام سے مشہور ہے۔ یزید کے انتقال کے بعد بنو امیہ کی حکومت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ خلافت کے مدعی ہوتے ہیں لیکن بعض سیاسی فروگذاشتوں کی بدولت اپنی یقینی کامیابی کو ناکامی سے بدل دیتے ہیں اور اموی خلیفہ کے ایک جابر و ظالم حاکم کے ہاتھوں خاص مکہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

غرض یہ کہ مذہب نے مسلمانوں میں جو جوش و ولولہ، زور، ہمت و ارادہ کی جن قوتوں کو پیدا کر دیا تھا اور ترقی کی جو روح ان میں سرایت کر گئی تھی وہ اس وقت غلط راستے پر صرف ہو رہی تھی اور اگر

خدانخواستہ چندے یہی حالت رہتی تو یہ عظیم الشان طاقت آپس ہی میں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی۔

پھر غلط عقیدت، دشمنی، عداوت اور تعصب نے بے سر وپا واقعات اور غلط اتہامات کی ایسی تہیں جما دی ہیں کہ صحیح حالات کا استقصا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو گیا ہے۔ شاہ صاحب نے حقیقۃً یہ بڑا کام کیا ہے کہ پوری کاوش و تحقیق کے بعد اس تاریک زمانے کی تاریخ مرتب کی ہے اور مذکور الصدر بزرگوں کے حالات جمع کر دئے ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جادۂ اعتدال سے تجاوز نہیں کیا گیا ہے۔ مؤلف کو خود اس کا احساس ہے چنانچہ دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

"درحقیقت ان بزرگوں کے حالات کا لکھنا بہت اہم اور نازک فرض ہے کیونکہ انھیں بزرگوں کے نزاعی امور نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی اختلافات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخی حقائق اور جذبات دو جدا جدا چیزیں ہیں اس لئے ان کے حالات اس طرح لکھنا کہ تاریخی حقائق کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور کسی جماعت اور کسی عقیدے اور خیال کے مسلمان کے جذبات کو اس سے ٹھیس بھی نہ لگے، بہت مشکل امر اور پانی سے کھیلنا اور دامن کو تری سے بچانا ہے۔ تاہم میں نے دونوں باتوں کو نباہنے اور قلم کو جادۂ حق پر قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بیان میں، ان کے جذبات میں ذرا رقت یا "ترقیق" پیدا ہو گئی ہے اور طرز بیان میں خطابت کا رنگ جھلکنے لگا ہے جو ایک تاریخی کتاب کے لئے موزوں نہیں تاہم یہ فروگذاشت درگذر کے قابل ہے اس لئے کہ یہ موقع ہی ایسا جاں گداز ہے کہ انسان بہ مشکل اپنے جذبات و محسوسات قابو میں رکھ سکتا ہے۔

امیر معاویہ اور حضرت امام حسینؓ کے بیان میں جہاں انھوں نے یزید اور امیر معاویہ کی بہت سی غلطیوں کو تسلیم کیا ہے وہاں ان الزامات اور اتہامات کی تردید بھی کی ہے جو غالی اور متعصب لوگوں کی

طرف سے ازراہ عناد و تعصب ان پر لگاتے ہیں ۔ مثلاً امیر معاویہ پر یہ سنگین الزام لگایا کہ انھیں کی سازش سے حضرت امام حسنؑ کو زہر دیا گیا۔ جناب مؤلف نے تاریخی دلائل سے اس کی تردید کی ہے اسی طرح انھوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یزید بن معاویہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا براہ راست ذمہ دار نہ تھا بلکہ یہ سب کارستانی عبداللہ بن زیاد کی تھی ۔ یزید کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو سخت افسوس ہوا اور یہ افسوس اسے مرتے دم تک رہا۔ اسی قسم کے بعض اور الزامات کی انھوں نے اچھی طرح قلعی کھولی ہے ۔

مؤلف کا طرز بیان بھی بہت صاف وسلیس اور پاکیزہ ہے؛ البتہ کہیں کہیں عربی کے ثقیل الفاظ استعمال کر گئے ہیں جنھیں عام لوگ عربی لغت کی مدد کے بغیر بمشکل سمجھ سکتے ہیں مثلاً ترقیق (صفحہ ۲۰) مثالب (صفحہ ۹۱) سبط وغیرہ ۔ اسی طرح بعض اردو الفاظ کے متعلق ہمیں کچھ شبہ سا ہو گیا ہے مثلاً

تلواریں گٹھلی ہو گئیں (صفحہ ۵۲) (ہم اب تک صحیح لفظ گٹھل سمجھتے تھے ۔)

حلق سوکھ رہی تھی (صفحہ ۲۱۴) (ہم اب تک حلق کو مذکر سمجھتے تھے ۔)

لیکن ان معمولی فروگذاشتوں سے کتاب کے حسن میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا ۔

حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حالات میں اردو داں مسلمانوں کے لئے کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی، جناب مؤلف شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے ۔

رسائل

بچہ ماہوار

بچہ ماہوار | ایڈیٹر ایس عبداللہ قریشی محمود، تقطیع ۲۰x۳۰/۸، حجم ۴۴ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ متوسط، چندہ سالانہ عہ ۔ مقام اشاعت : پہاڑ گنج دہلی ۔

یہ باتصویر رسالہ "بی بی طبی آیورویدک اینڈ یونانی ایسوسی ایشن دہلی" کے زیر اہتمام اور حکیم الوپی پرشاد صاحب وید کی نگرانی میں نکلتا ہے ۔ مضامین زیادہ تر طبی ہوتے ہیں ۔ تنوع قائم رکھنے کے لئے دوسرے مضمون اور نظمیں بھی درج کی جاتی ہیں ۔ رسالہ کا اٹھان اچھا ہے ۔ امید ہے کہ ترقی کرے گا ۔

دنیا کی رفتار

ممالک غیر

چینی ترکستان کی شورش

انجبکی آمد اور اسلامی اخبارات کی چہ میگوئیاں

گذشتہ اپریل میں جب چینی ترکستان میں سلمانوں کی شورش کی خبریں مسلسل آنے لگیں تو اسلامی دنیا کی توجہ اس کی طرف ہوگئی۔ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے اسلامی اخباروں میں موٹی موٹی سرخیوں سے لمبے چوڑے مضامین لکھے گئے۔ اڈیٹر صاحبان نے اس 'تحریک آزادی' کے اسباب کے متعلق جو وسط ایشیا کے شمال مشرقی حصے میں اٹھی تھی بہت کچھ لکھ ڈالا۔ ان میں سے بعض نے اس کی تائید کی اور بعض نے مخالفت شروع کردی۔ بعض صاحبان چاہتے ہیں کہ چینی ترکستان میں ایک جدید اسلامی سلطنت قائم ہو جائے اس وجہ سے نہیں کہ یہ اسلامی دنیا کے لئے ایک نئی قوت ہوگی بلکہ اس وجہ سے کہ یہ برطانوی ہند اور سوئٹ روس کے درمیان روک کا کام دے گی۔ بعض نے کہا کہ یہ شورش چینی حکومت کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چینی حکومت نے مسلمانوں پر بہت ظلم کیا ہے اس بنا پر نہیں کہ وہ اس قدر قوی ہے کہ کسی قوم پر ظلم کرسکے بلکہ اس بنا پر کہ وہ خود ضعیف اور مظلوم ہے۔ بعض نے کہا کہ چینی ترکستان کے مسلمان تمام اہم شہروں پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں ایک جمہوری حکومت قائم کر رہے ہیں بعض صاحبان نے مسلمانوں کی 'آزادی' کا اعلان کیا حالانکہ چینی ترکستان کے مسلمانوں نے کبھی اسلامی دنیا سے یہ نہیں کہا کہ اب تک وہ کسی غیر ملک کے غلام رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض صاحبان نے یہ بات بیان کی کہ چینی ترکستان کے مسلمانوں میں عرصے سے ایک خفیہ جماعت قائم تھی جس کا مقصد چینی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے اتار کر پھینکنا تھا حالانکہ حکومت چین نے کبھی مسلمانوں کی گردن پر جُوا نہیں رکھا' نہ چین خاص کے مسلمانوں کو اس کی شکایت تھی نہ چینی ترکستان کے مسلمانوں کو۔ چینی حکومت (پہلے حکومت پکن' اب حکومت نانکینگ) نے بار بار یہ اعلان کیا کہ جمہوریت چین پانچ قوموں کی مشترکہ حکومت ہے مسلمان بھی ان میں شامل ہیں قانون

کی رو سے چینی مسلمانوں کو پوری مساوات اور حقوق دیے گئے ہیں اور وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ، دستور اساسی کی بنیاد پر، ایک ہی صف میں کھڑے ہیں نہ ان کے ہاتھ میں ہتکڑیاں ہیں نہ ان کے پاؤں میں زنجیر۔ وہ ہر عہدہ نہایت آسانی سے پا سکتے ہیں بہ شرطیکہ اس کے حاصل کرنے کی لیاقت اور انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہوں۔ وہ چین میں جمہوریت کے قائم ہونے کے وقت یعنی سنہ ۱۹۱۱ء سے آزاد ہیں۔ ان کو دوبارہ آزادی کے لئے جد و جہد کرنے کی ضرورت نہیں چینی مسلمانوں کی ذہنیت یہ نہیں ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی علیحدہ سلطنت چین کے اندر قائم کریں جبکہ ان کے برادران وطن بیرونی حملے کے خوفناک خطرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ کہنا ناانصافی ہے کہ چینی حکومت مسلمانوں کے ساتھ ظالمانہ طور سے پیش آتی ہے۔ چینی حکومت نے ہر مذہب والوں کو آزادی دے رکھی ہے، وہ جو عقیدہ چاہیں رکھیں اور جس طرح جی چاہے عبادت کریں، چینی حکومت ہرگز مداخلت نہیں کرتی۔

اب رہی چینی ترکستان کی شورش یہ مقامی معاملہ ہے۔ یہ حکومت چین کے خلاف برپا نہیں کی گئی بلکہ صرف ایک حاکم کے خلاف۔ یہ معاشی وجوہ سے نہیں ہے جیسا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے بیان کیا ہے نہ مذہبی جنون کی وجہ سے جیسا کہ اخبار مدینہ کا خیال ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شورش برطانوی ہند میں روس کے خلاف مفید ثابت ہو جائے لیکن برطانیہ کا اس میں بلاواسطہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ چینی ترکستان میں سازش کرنیوالی کوئی خفیہ جماعت نہ تھی جیسا سرحد، پشاور کے ایک مضمون نگار نے کابل سے ایک مراسلے کے دوران میں کہا ہے اور نہ یہ کوئی وطنی تحریک ہے جیسا منصور جہاں گیر خاں نے الجہاد (قاہرہ) میں لکھا ہے۔ چینی ترکستان چین کا ایک مسلم صوبہ ہے، نہ کہ وسط ایشیا کی ایک مسلم ریاست۔ اس بیان سے جو ایک گمنام عینی شاہد نے کاشغر سے بھیجا تھا اور کلکتہ کے اسٹار آف انڈیا میں شائع ہوا تھا یہ مراد نہیں لی جا سکتی کہ چینی ترکستان میں ایک جدید مسلم ریاست پیدا ہو گئی بلکہ اس میں صرف اس شورش کے واقعات دکھائے گئے ہیں۔

۲۔ اسلام اور چین | اس خیال سے کہ چین کے اندر ایک علیحدہ اسلامی ریاست قائم کی جائے ممکن ہے باہر کے مسلمانوں کو کچھ روحانی مسرت حاصل ہو جائے لیکن یہ اس سرزمین میں اشاعت اسلام میں مدد نہیں دے گا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فوجی قوت سے فتوحات حاصل کی جا سکتی ہیں لیکن اشاعت اسلام نہیں ہو سکتی۔ چینی

مسلمانوں کی قوت اور حیثیت علیحدہ سلطنت کے قائم کرنے سے مستحکم نہیں ہو سکتی، بلکہ چینی حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے ۔ اسی غرض کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے کندھوں پر بھاری فرائض ہیں جو انھیں پورے کرنا ہیں، وہ فرائض کیا ہیں؟ چینی قوم کو پستی سے نکالنا اور وطن کی خاطر جد و جہد کرنا۔ ان کی شان اور عظمت اپنے مکان کے گرانے میں نہیں ہے بلکہ اسی میں ہے کہ چینی قومیت کی عمارت تعمیر کریں۔ یہ عمارت ان کا مقدس معبد ہے جس میں ان کو نذر چڑھانا اور قربانی کرنا ہے۔ غرضیکہ چینی قوم کے عروج سے ان کا عروج ہے اور اس کے زوال سے ان کا زوال ۔

چین کی موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے چینی مسلمانوں کے کندھوں پر دو اہم فرائض ہیں ایک تو غیر مذہب والوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑے ہو کر چین کی خاطر لڑنا اور دوسرے صحیح اسلامی تعلیم کو نہ صرف اپنے اندر پھیلانا بلکہ اپنے اور ہم وطنوں کے سامنے بھی پیش کرنا ۔ جہاں تک چینی مسلمانوں کی سیاست کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ کیا قدم اٹھانا چاہیے اور کس طرح اپنے مفاد کی حفاظت کرنا چاہیے ۔ اس معاملے میں غیر ملکی مشورے کی ضرورت نہیں ہے ۔ جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ چینی ترکستان میں ایک مضبوط اور طاقتور مسلم ریاست قائم کی جائے تاکہ خطرے کے وقت چینی مسلمان وہاں جا کر پناہ گزیں ہو سکیں وہ یقیناً ہمارے شکریے کے مستحق ہیں لیکن وہ غالباً اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ اندرون چین میں کم و بیش تین کروڑ مسلمان پھیلے ہوئے ہیں ۔ ان کی تعداد دیگر مذاہب کے مقابلے میں بہت تھوڑی ہے یعنی کل آبادی کی صرف پانچ فیصدی ہے ۔ فرض کیجیے کہ چین میں مذہبی تعصب اور ظلم کا دور شروع ہو جائے تو یہ لوگ کہاں بھاگ کر جائیں؟ چینی ترکستان جانا چاہیں تو وہ بہت دور ہے اور راستہ دشوار گذار ۔ باہر کے مسلمان ان کے بچانے کے لئے وقت پر نہیں پہنچ سکتے ۔ روسی ترکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے ۔ جب وہاں کی مساجد، ناچ گھر اور قمار خانہ بنائی گئیں اور مسلمان اپنے گھروں سے نکال دیے گئے تاکہ وہ عزیز وطن کو چھوڑ دیں یا اپنا مذہب بدل دیں تو اس وقت کسی مسلمان نے ان کی مدد کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا ۔ پھر کیوں کر یہ توقع کی جاتی ہے کہ چین میں جب مذہبی ظلم شروع ہو گا تو اسلامی دنیا کی مدد فوراً جا پہنچے گی ۔ چینی مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ یہی واقعات چین میں رونما ہوں ۔ غرض اس وقت جو قدم وہ اٹھا سکتے ہیں

صرف اتحاد چین کی طرف اٹھا سکتے ہیں نہ کہ انتشار کی طرف۔ ان کی ساری جد وجہد جمہوریت چین کی حمایت میں ہوگی تاکہ حکومت میں اور ان میں تعاون اور اعتماد قائم ہو جائے۔

بیرونی مسلمانوں کی اعانت اس وقت مفید ہو سکتی ہے جب ان کی کوشش کا رخ اسلام اور چینی قومیت میں ذہنی مصالحت پیدا کرنے کی طرف ہو۔ چینی مسلمانوں کو چینی حکومت سے علیحدہ ہو جانے کی ترغیب دینا نہ صرف چینی مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے بلکہ خود اسلام کے لئے بھی مہلک ہے۔ یہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی تعلقات کو بگاڑنا ہے جس کا نتیجہ ہرگز اچھا نہیں ہو سکتا۔ موجودہ چین مسلمانوں کی فوج کشی کا میدان نہیں ہے بلکہ اسلامی تمدن کی نشو ونما کے لئے ایک زرخیز خطہ ہے۔ چینیوں کے ذہن میں اسلام کے زندگی بخش اصولوں کو جو نوع انسانی کی بقا اور تقویت کے ضامن ہیں جاگزیں اور راسخ کرنے میں بیرونی مسلمان بہت کچھ مدد پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طرح کیا جا سکتا ہے مثلاً مسلم علما چین کی سیاحت کریں اور چینی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اسلام پر تقریریں کریں۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ چینی مسلمانوں کے ہاتھ سے وہاں کے ہر بڑے شہر میں اسلامی تمدنی ادارات قائم کرائیں تاکہ اسلام کے متعلق بعض غلط فہمیاں جو تعلیم یافتہ حلقوں میں پھیل گئی ہیں، دور کی جائیں اور اس وثنی سرزمین میں اسلامی معاشرت پھیلنے کی صورت پیدا ہو۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اسلامی علوم کی کتابیں چین کے تعلیمی مرکزوں اور اداروں میں بھیجیں۔ مزید برآں وہ چینی حکومت سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ چینی مسلمانوں کو سفیر یا قنصل کے طور پر اسلامی ممالک میں بھیجے تاکہ چین اور اسلامی ممالک کے درمیان تجارتی رشتہ اور مذہبی ربط پیدا ہو سکے۔

اگر ان چند باتوں پر عمل کیا جائے تو بیرونی مسلمان چین میں اشاعت اسلام کے کام کو بہت کچھ مدد اور قوت پہنچا سکتے ہیں اور چین میں مسلمانوں کی حیثیت اور زیادہ نمایاں اور مضبوط ہو سکتی ہے اور اس کے تعلقات دوسری قوموں کے ساتھ اور استحکام پا سکتے ہیں۔ چینی ترکستان کے معاملے میں خواہ اسلامی دنیا چین کے موافق ہو خواہ مخالف وہ نہ تو حکومت چین کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ضرر، البتہ چینی مسلمانوں کی حیثیت میں ضرور فرق آتا ہے۔ اگر اسلامی دنیا چینی حکومت کے مخالف ہے تو اس صورت میں یقیناً یہ اندیشہ ہے کہ حکومت چین اپنے ملک کے مسلمانوں پر شک کرے گی اور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ شک اور نفرت یہ دونوں

چیزیں سیاسی بے چینی کی جڑ ہیں۔ چینی مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ حکومت چین ان پر شک کرے اور انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ وہ ان باتوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور بیرونی بھائیوں سے بھی یہ التماس ہے کہ ان خیالات کے دور کرنے میں چینی مسلمانوں کی مدد کریں۔ اس غلط بیانی سے کیا فائدہ کہ چینی ترکستان کے مسلمانوں نے حکومت چین کے خلاف بغاوت کی ہے۔ نہ چینی ترکستان کے مسلمان حکومت کے خلاف ہیں اور نہ انھوں نے بغاوت کی ہے۔ یہ تھوڑی سی شورش ہے جو صرف ایک ذمہ دار شخص کے خلاف برپا کی گئی اور یہ مقامی معاملہ ہے۔

۲۔ شورش کی جڑ | میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ حکومت چین کے خلاف بغاوت نہ تھی بلکہ صرف ایک فرد کے خلاف شورش تھی۔ یہ شورش نہ مذہبی جنون کی وجہ سے ہوئی، نہ کسی تعصب سے اور نہ سیاسی اغراض سے، نہ معاشی بے چینی سے، بلکہ شخصی مظالم کے خلاف نفرت اور بے زاری سے۔ اس کی تشریح میں آپ عجیب عجیب داستانیں سنیں گے جو الف لیلہ سے زیادہ دلچسپ ہیں مگر جو کچھ میں یہاں بیان کروں گا وہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں ہے بلکہ واقعات ہیں جو چینی مسلمانوں کے ذریعے سے فراہم کئے گئے ہیں۔ اس سے آپ کو یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ اس ڈراما کی اصلیت کیا ہے۔

سن کیانگ یا چینی ترکستان کی موجودہ شورش گورنر چن شوزن (Chin Shoozin) کی نا اہلی اور ظلم کی وجہ سے برپا ہوئی۔ چن سن کیانگ کی گورنری پر ۱۹۲۸ء سے قابض رہا۔ وہاں کے مسلمان اس سے اس لئے بیزار ہیں کہ اس نے ان کے مفاد کو پامال کیا اور انھیں انتہائی نقصان پہنچایا۔ گورنر اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری کا بیج اس وقت بویا گیا جبکہ اول الذکر یانگ چن شن (۱۹۲۰ سے ۱۹۲۸ تک چینی ترکستان کا گورنر رہا) کا سکریٹری تھا۔ گورنر یانگ کے ماتحت ' مافوشین ' نامی ایک مسلمان بھی تھا جس پر یانگ کو بہت اعتماد تھا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس پر زیادہ اعتماد کیا جاتا ہے وہ یا تو اپنے افسر کی خاطر قربانی کرتا ہے یا اس کے عتاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مافوشین بھی گورنر کے شک و شبہ سے نہیں بچ سکا۔ وہ دل ہی دل میں یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر میں نے مافوشین کو اپنی راہ سے نہ ہٹایا تو میری خیریت نہیں ہے۔ خاندان مافوشین کی کثرت تعداد نے اور اس محبت نے جو کہ سن کیانگ کے مسلمان مافوشین سے

رکھتے تھے یانگ چن شن کے دل میں اور بھی خطرہ پیدا کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ما فوشین اپنے ہم مذہبوں کی مدد سے کسی نہ کسی دن اس کے عہدہ کو غصب کرے گا چنانچہ اس نے چن شوزن (موجودہ گورنر) کے ساتھ مل کر ما فوشین کی راہ میں جال بچھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ما فوشین معہ اپنے فرزند کے گرفتار ہوا اور بغیر قانونی سماعت کے قتل کر دیا گیا۔

اس کی موت نہایت دردناک تھی۔ شمال مغربی چین کے مسلمانوں نے اس وقت یانگ چن شن کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا اور ایک وفد حکومت پکن کے پاس بھی روانہ کیا تھا لیکن حکومت نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی اور اس مقدمہ کا فیصلہ اب تک نہیں ہوا۔

بہر حال یانگ چن شن کو اپنے کرتوت کی سزا مل گئی۔ ۱۹۲۰ میں وہ ایک روسی اسکول میں انعام تقسیم کر رہا تھا کہ دفعتہً کسی مخفیہ جگہ سے اس پر پستول چلایا گیا اور وہ زمین پر گر کر پھر اٹھ نہیں سکا۔ اس کے مقتول ہونے کے بعد اس کا سکریٹری چن شوزن گورنر بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کے دل میں غصے کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں مگر ان کے بھڑکنے کے لئے کسی فوری اشتعال کی ضرورت تھی۔

۴۔ فوری سبب اس شورش کا فوری سبب یہ ہوا کہ چن شوزن نے حامی کے (Hami) مسلمانوں کی جائداد کے ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ حامی مشرقی سن کیانگ کا ایک اہم شہر ہے۔ مانچو کے زمانے میں سن کیانگ کا نظم و نسق بالکل جاگیرداری نظام سے مشابہ تھا۔ وہاں کے مسلمان اپنے 'وانگ' (سردار) رکھتے تھے۔ کل صوبے میں مسلمانوں کے آٹھ وانگ تھے جو اپنے اپنے مقام کے حکمراں تھے لیکن ان آٹھ مسلم وانگوں کا ایک بڑا رئیس ہوتا تھا جو شہر حامی میں رہا کرتا تھا اور وہی مسلمانوں کے امور کا نگراں تھا۔ غیر مسلموں کی معمولی سی مداخلت سے خطرناک نتائج پیدا ہونے کا امکان تھا۔ موجودہ گورنر نے مداخلت کی جرأت کی جس کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنی گورنری کھو بیٹھا بلکہ اس کی جان بھی محفوظ نہیں ہے۔

۱۹۱۱ میں انقلاب چین کے بعد یہ جاگیرداری نظام سن کیانگ میں برقرار رہا۔ مسلم 'وانگ' اپنی حکومت کے معاملات میں بالکل خود مختار تھے۔ رعایا کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد قدرتی طور پر نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کا اثر زیادہ وسیع ہو جاتا تھا اور حیثیت اور بڑھتی جاتی تھی۔ وانگ کا عہدہ ارثی ہوا کرتا تھا

اس زمانے میں یہ منصب شاہ مقصود کو ملا مگر وہ اپنے اسلاف جیسا نہ تھا اور سنگ دلی اس کی خاص صفت تھی جس کی وجہ سے لوگ اس سے بہت ناراض تھے اور بد دعائیں دیا کرتے تھے۔ آخر خدا خدا کرکے گزشتہ سال فصل ربیع میں اس کا انتقال ہوا۔ جانشینی کا سوال پیش آیا۔ قاعدے کے مطابق اس کے لڑکے شاکر کو ' وانگ ' کا عہدہ ملنا چاہیے تھا لیکن اس کی شخصیت اور اخلاق بھی اپنے باپ سے بہتر نہ تھا اور مسلمان اس کو اپنا وانگ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایک وفد گورنر سن کیانگ کے پاس جو ارومچی میں مقیم تھا روانہ کیا اور اس سے یہ درخواست کی کہ وانگ کے جانشین کا انتخاب نہ کریں۔ انھوں نے گورنر سے یہ وعدہ کیا کہ حکومت چین وانگ سے جو خراج لیا کرتی تھی اسے جمہور مسلمین خود ادا کریں گے۔ گورنر نے وفد کی درخواست منظور کر لی اور فیصلہ کر دیا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی وانگ منتخب نہ کرے گا لیکن اس کے دل میں اور ہی کچھ تھا۔ دفعتہً اس نے ان جاگیروں کو جو حامی مسلمانوں کی ملکیت تھیں ضبط کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ مسلمانوں پر ایسی چوٹ پڑی جسے وہ چپ چاپ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ٹڈی دل کی طرح اٹھے اور حامی کے فوجی صدر مقام پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں سارے چینی سپاہیوں کے ہتیار چھین کر شہر پر قابض ہو گئے۔

چن شوزن صوبہ کان سُو ضلع ٹی ٹو کا باشندہ ہے اور اس کی فوج بھی زیادہ تر وہیں سے بھرتی ہوئی تھی۔ نام کے لئے فوج کے پانچ ڈویژن تھے لیکن ان کی تعداد پوری نہیں تھی۔ ان کے جسم کمزور، اخلاق خراب اور فوجی نظام اور تربیت بالکل مفقود تھی۔ جب کبھی اس صوبے میں اس قسم کی شورش رونما ہوتی تو وہ مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔ مسلم والنٹیروں نے جو جدید آلات سے مسلح، رفتار میں تیز، حرکت میں تند، عمل میں چست تھے حامی پر قبضہ کرنے کے بعد مغرب کی طرف رخ کیا اور ایک حملے میں پھر شہر ' چھی لوین ' کو فتح کر لیا۔ حامی کے اردگرد جنگ کی خبر تیز ہوا کی طرح ارومچی ' کاشغر اور آکسو میں پھیل گئی اور وہاں کے مسلمان بھی جہاد میں شریک ہو گئے۔ اس اثنا میں ماچونگ این نے جو کانسو میں مقیم تھا اور جس کی داستان ڈاکٹر اقبال نے اخبار کے نمائندوں کو سنائی ہے اپنی فوج کو سرحد عبور کرکے حامی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ صوبہ کانسن کانگ کی سرکاری فوج جو کمزور اور مقدار میں کم تھی ان مسلم والنٹیروں

کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی جو تین طرف سے ان پر آن پڑے۔ امدادی فوج کا اندرونی چین سے پہنچنا مشکل تھا، یہی
وجہ تھی کہ مسلم والنیٹر جہاں کہیں پہنچتے تھے اس جگہ پر فوراً قابض ہو جاتے تھے۔ انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی
سوائے اس کے کہ ختن میں تھوڑی دیر مقابلہ ہوا۔ والنٹیروں کی تعداد ان کی فتوحات کے ساتھ بڑھتی جاتی
تھی اور ان کی قوت میں مجمع کی کثرت سے اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ یہ لوگ ایک قبیلے یا نسل سے نہیں ہیں بلکہ
مختلف قبیلوں اور نسلوں سے، جن میں سے ٹنگان (چینی) کرغذ (منگولی) اور تمز (ترک) کا ذکر شملے کے
سرکاری بیان میں کیا گیا ہے۔

۵۔ قبضہ کرنے کی غرض | پورے صوبے پر قابض ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے کوئی علیحدہ مسلم ریاست
قائم نہیں کی اور نہ چینی حکومت کے خلاف کچھ کیا۔ سن کیانگ کے مسلمان حکومت نانکینگ سے خفا نہیں ہیں
اور نہ ان کو عام چینیوں سے نفرت ہے۔ انھوں نے فی الحال صوبے کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس
لئے کہ چینی افسر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ سن کیانگ مسلمانوں کے زیر نگرانی چینی حکومت کے لئے زیادہ
مفید ثابت ہوگا۔ اس صوبے میں روسی اور برطانوی اثر بہت کافی ہے مگر یہ ایک چینی صوبہ ہے جس کی
حفاظت نہایت ضروری ہے تاکہ بیرونی ممالک اس کو میدان جنگ نہ بنائیں۔ منچوریہ کے واقعات بتاتے
ہیں کہ چینی افسر اس قابل نہیں کہ وہ سرحد کی مدافعت کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ سن کیانگ کے مسلمان اس صوبے
کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے چینی افسروں کو وہاں سے نکال دیا ہے مگر اس کا
یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی ہے۔

۶۔ حکومت نانکینگ اور سن کیانگ | میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ چینی حکومت کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ
ظالمانہ نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب یہ خبر آئی کہ چن شوزن کی بدسلوکی اور غیر منصفانہ پالیسی سے
سن کیانگ کے مسلمانوں نے اس سے برہم ہو کر صوبجاتی فوجوں کے ہتھیار چھین لئے ہیں تو حکومت نانکینگ
نے ان کو سزا دینے کا مطلق خیال نہیں کیا بلکہ یہ فیصلہ کیا کہ (۱) فوراً ایک کمشنر حامی روانہ کیا جائے تاکہ
وہاں جا کر مسلمانوں کو سمجھائے، ان کی شکایتیں سن کر ان کا سد باب کرے اور انھیں یہ بتا دے کہ حکومت
کو ان پر اعتماد ہے اور وہ ان کی بھلائی چاہتی ہے (۲) سوین وین اور ماجان شان کی فوج کو

حکم دیا جائے کہ وہ روس سے سن کیانگ میں داخل ہو جائے اور مسلمانوں کو امن قائم کرنے میں مدد دے
اور (۳) سفید روسی جن کو جن شوزن نے سن کیانگ کی فوج میں داخل کیا تھا اور اس سے مسلمانوں
میں ناراضی پھیل گئی تھی نکال دئے جائیں اور ان کی جگہ دیسی باشندے رکھے جائیں اور جن شوزن کو
جو اس شورش کا بڑا اور اصلی ذمہ دار ہے وہاں کی گورنری سے ہٹا دیا جائے۔

ان فیصلوں کے مطابق حکومت نانکنگ نے نائب وزیر خارجہ، وانگ موسونگ، کو کمشنر حامی
مقرر کر کے روانہ کیا ہے۔ روانہ ہوتے وقت محکمۂ امور تبت و منگولیا کے صدر نے ان کو ایک یادداشت
دی ہے جن میں وانگ موسونگ کو امور ذیل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

(۱) کمشنر حامی کو چاہئے کہ ذاتی طور پر ہر مسلم شہر اور قصبے میں جائے۔ وہاں کے حالات کی تحقیق کرے
لوگوں سے دریافت کرے کہ ان کو کیا شکایت ہے، ان کو سمجھائے بجھائے، ان کا اعتماد اور ہمدردی
حاصل کرے اور حکومت نانکنگ کی طرف سے ہمدردی کا پیغام ان کو پہنچا دے۔

(۲) یہ کہ کانسو اور سن کیانگ کے درمیان آمد و رفت کے لئے حتی الامکان سہولتیں پیدا کرنے کی
کوشش کرے اور "تعلیم عمومی"[1] کی مخالف پالیسی کو جو عرصے سے وہاں کے گورنر نے اختیار کر رکھی تھی
منسوخ کر دے۔

(۳) مقامی حکومت کے نظم و نسق کو درست کرنے کی کوشش کی جائے اور بھاری اور ناقابل
برداشت محصول اور لگان منسوخ کر دیا جائے۔

(۴) حامی، تاچن، ارومچی اور کاشغر میں خبر رسانی کی آسانی کے لئے لاسلکی قائم کیا جائے۔

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لـه یہ والنٹیروں کے دو کمانڈر ہیں۔ مؤخر الذکر مسلمان ہے جو منچوریا کی جنگ میں جاپان سے شکست
کھا کر روس میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اخباروں میں یہ افواہ کہ چینی حکومت نے روس سے فوجی مدد طلب کی کہ ترکستان
کی شورش کو دبائے قطعاً غلط ہے۔ اس کی حقیقت اصل میں یہ ہے۔

[1] اس کی تشریح آگے آئے گی۔

(۵) سفید روسی فوج سے نکال دیے جائیں اور ان کی جگہ دیسی باشندے داخل کئے جائیں۔

(۶) مسلمانوں سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے نمایندے نانکینگ میں بھیجیں اور وہاں "دفتر امور مسلمانان سن کیانگ" قائم کرکے مرکزی حکومت کے ساتھ مسلم مسائل میں مشورہ کریں۔

(۷) سن کیانگ کی صوبجاتی حکومت سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلم طلبہ کو مالی آسانیاں بہم پہنچائی جائیں تاکہ وہ اندرون چین کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے شریک ہوسکیں۔

(۸) یونیورسٹی کے طلبہ کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ سن کیانگ میں جاکر خدمت کریں۔

ان ہدایات سے یہ بالکل واضح ہے کہ حکومت نانکینگ نے اس معاملے میں دانشمندانہ حکمت عملی سے کام لیا ہے۔ یہ سب باتیں مسلم قایدوں کے نزدیک قابل قبول ہیں۔ گورنر کو ہٹا دینا اور سفید روسیوں کو فوج سے نکال دینا اس معاملے کے طے ہونے کے بنیادی شرائط ہیں۔ فوجی خدمات کے حق کو صرف دیسی باشندوں کے لئے محفوظ رکھنا مسلمانوں کے لئے ایک امتیاز ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرسکتے ہیں اور غیر متوقع خطرے کی مدافعت بھی کرسکتے ہیں۔ "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" کو منسوخ کردینے سے مسلمانوں کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ وہ جدید ذہنی ترقی کی آزاد اور تازہ ہوا سے فائدہ اٹھائیں چینی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا اور چین کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنا کہ وہ سن کیانگ میں جاکر خدمت کریں باہمی تعاون اور اعتماد قائم کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔

۷۔ تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی | یہاں تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی کے متعلق چند سطریں لکھ دینا ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سن کیانگ میں مسلمان آباد ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے یہ چین کا ایک حصہ ہے اور یہاں کے انتظامات چینی گورنر کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ بہت کم ہیں کچھ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت جدید علوم کی طرف مائل نہیں ہے یعنی وہ قدامت پسند ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ گورنر نے ایک "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" نافذ کررکھی ہے جس سے عوام کو ناقابل اور جاہل رکھنا مقصود ہے۔

۱۹۱۲ میں جبکہ مالین ای (Ma Lin Yee) جو صوبہ ہونان (Hunan) کا ایک مسلمان ہے صوبہ کانسو کا وزیر تعلیم مقرر ہوا تو اس نے حتی الامکان اس کی کوشش کی کہ وہاں کے تعلیمی

حالات کو درست کرے۔ چنانچہ اس نے ماآن لانگ کو جو کانسو کا ایک عالی خاندان مسلمان تھا اپنے محکمہ میں بلایا تاکہ تعلیمی اصلاح میں اس کی مدد کرے۔ ماآن لانگ اس کے ماتحت ایک مذہبی تعلیمی کشنر کی حیثیت سے رہا۔ اس نے مختلف مقامات میں نئے مدارس کھلوائے اور جدید تعلیم اور دینی تعلیم ایک ساتھ جاری کی۔ تھوڑی ہی مدت میں کثرت سے روشن خیال مسلم نوجوان مدرسے سے نکلے اور عام مسلمان تعلیم کی دولت سے مالامال ہو گئے۔ مالین ای نے کانسو میں تعلیمی پالیسی کے ذریعے سے ان نفرت انگیز اور برے جذبات کو ایک حد تک دور کیا جو اس زمانے کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں موجود تھے اور جس کی بنیاد جنرل تسو چونگ تانگ نے ڈالی تھی جب وہ ۱۸۷۳ء میں یعقوب بیگ کی بغاوت کے استیصال کے لئے اپنا لشکر لے کر کانسو سے گزرے تھے۔ مالین ای کی خدمات کی یاد اب تک کانسو کے مسلمانوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ کانسو کے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں جو ہم آہنگی اور باہمی خوشگوار تعلقات پائے جاتے ہیں وہ اس تعلیمی پالیسی کا ثمرہ ہے۔

اس کے بالکل برعکس چن شوزن نے اس روز سے جس روز اس نے سن کیانگ کی صوبجاتی حکومت کی باگ ہاتھ میں لی، "تعلیم عمومی کی مخالف پالیسی" جاری کی۔ اس پالیسی کا مقصد وہاں کے باشندوں کو جہالت اور ناخواندگی کی حالت میں رکھنا تھا تاکہ کوئی شخص امور سیاست میں حصہ نہ لے اور وہ برابر وہاں گورنری کرتا رہے۔ اس نے اس غرض کے لئے ہر ممکن ذریعہ استعمال کیا۔ سن کیانگ میں اخباروں کا داخلہ اور بچوں کا اسکول جانا بند تھا۔ نہ صرف جدید تعلیمی ادارات کا کھولنا روک دیا گیا بلکہ پرانے مدرسے بھی بند کر دینے پڑے۔ چینی اسکول اور دینی مدارس دونوں کا ایک ہی حشر ہوا۔ ان کے دروازوں میں قفل پڑ گئے اور استاد اور طالب علم منتشر کر دئے گئے۔ حکومت نانکینگ ان باتوں سے ناواقف نہ تھی لیکن ادھر دو سال سے متواتر جاپان کے ساتھ جنگ میں مشغول ہونے کی وجہ سے اس کو ایک لمحے کی فرصت بھی نہ ملی کہ سن کیانگ کے امور انتظامی کی طرف متوجہ ہو۔ یہ صوبہ دوری کی وجہ سے بالکل چن شوزن کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا تھا جس نے مسلمانوں کے مفاد کو اس طرح پامال کیا۔

مسلمانوں کے دلوں میں نفرت اور بیزاری کی چنگاریاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان کے مشتعل

ہونے کے لئے صرف ہوا کا انتظار تھا۔ قدرت نے اس کا سامان کر دیا۔ سلم وانگ کی جانشینی کے مسئلے نے سن کیانگ میں آگ لگادی۔ چن شوزن کے ظلم سے مسلمانوں کا غصہ بھڑک اٹھا اور انھوں نے استبداد کے خرمن کو جلاکر خاک کر دیا۔

یہ ہے چینی ترکستان کی شورش کی حقیقت۔ آپ کو اختیار ہے اسے مسلمانوں کی بغاوت سمجھئے یا اسلامی ریاست کا پیش خیمہ۔ مگر میرے خیال میں ان دونوں باتوں کی کوئی بنیاد نہیں۔

ممالک اسلامی

ترکی | ترکی میں آج کل قدیم اور جدید کا جو تقابل نظر آتا ہے اس کی مثال مشکل سے کسی دوسرے ملک میں ملے گی۔ قسطنطنیہ میں ایک طرف توفٹ بال کی میچیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف اونٹوں کی وحشیانہ لڑائی۔ مصطفےٰ کمال پاشا جب ملک کا دورہ کرنے اس غرض سے نکلتے ہیں کہ نئے کارخانوں کا معائنہ کریں اور ان کی ترقی کی راہیں نکالیں تو راستے میں صدہا دیہاتی قدیم قبائلی ناچ دکھا کر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو یوں للکارتے ہیں "بھائیو! آج نہیں ناچے تو پھر کب ناچوگے"۔ ایک طرف بروصہ، سمرنا اور قسطنطنیہ میں حسن کے مقابلے ہوتے ہیں تو دوسری طرف اناطولیہ کی عورتیں چارشف اور پارچہ میں لپٹی نظر آتی ہیں۔

اس گنگا جمنی کیفیت کو دور کرنے اور تمام ملک کو ایک رنگ میں رنگنے کی غرض سے انگورہ کے ارباب حل وعقد نے ایک 'تمدنی لائحۂ عمل' تیار کیا ہے۔ اس لائحۂ عمل کے تین پہلو ہیں، سیاسی، فنی اور ورزشی میدان سیاست میں صدر جمہوریہ کی رائے کے مطابق ترکی قوم کے دو دشمن ہیں، ایک مذہبی قدامت پرستی او دوسری اشتراکیت۔ اس جہاد کے لئے ڈیڑھ ہزار ذہنی رضاکار تیار کئے جارہے ہیں۔ فن تقریر میں مہارت حاصل کرنے کے بعد یہ لوگ ملک کے ہر حصے میں بھیجے جائیں گے کہ جہالت کے خلاف جنگ شروع کر دیں ارباب فکر کا خیال ہے کہ اب مذہبیت کا زور ختم ہو رہا ہے۔ خانقاہوں اور دوسری مذہبی جماعتوں کی تنظیم باقی نہیں رہی ہے اور پیشوایان مذہب اور طریق عبادت پر حکومت کی خاص نظر ہے۔ بخلاف اس کے

اشتراکیت آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی ہے اور اس کے خلاف پوری قوت سے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ چالیس اشتراکیوں پر خفیہ طور پر مقدمہ چلایا جا چکا ہے اور انھیں سخت سزائیں بھی مل چکی ہیں۔ ان میں بعض ترک عورتیں بھی شامل تھیں اگرچہ زیادہ تعداد بلغاری جلاوطنوں کی تھی۔

ترکی قوم کی توجہ مذہب سے جو کبھی ان کا واحد سرمایہ تھا اور سیاست سے جس پر کچھ دنوں سے زیادہ زور دیا جا رہا تھا ہٹا کر اب فنون لطیفہ کی طرف مبذول کرائی جا رہی ہے۔ ناطق فلموں کی پہلی کارگاہ قائم ہو گئی ہے۔ اس میں تفریحی فلموں کے علاوہ ایسی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں جن کا موضوع ترکی کی جنگ آزادی، مصطفےٰ کمال پاشا کی جرأت اور خدمات، کسانوں کا ایثار اور قربانی کا جذبہ وغیرہ ہوتے ہیں۔ یہ کارگاہ بہرصورت مکمل ہے اور اس میں ترکی لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد ملازم بھی ہے۔ ان طبعزاد فلموں کے علاوہ غیر ملکی ناطق فلموں کو ترکی کا جامہ بھی پہنایا جاتا ہے۔ فنون لطیفہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے اناطولیہ میں ۴۳ مجلسیں قائم ہو چکی ہیں اور عنقریب ان کی تعداد ۵۵ ہونے والی ہے۔ ان مجلسوں کے ماتحت ناٹکوں کی ترویج بھی ہو رہی ہے۔ مشہور شعرا نے "قومی" ناٹک لکھے ہیں جو ان مجالس میں دکھائے جاتے ہیں۔

تیسری مدیعنی ورزش کی طرف حکومت ہی نہیں بلکہ میونسپلٹیاں بھی توجہ کر رہی ہیں۔ وزیر تعلیمات نے ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں شکار اور ورزشی کھیلوں کا شوق دلایا گیا ہے اور ایک غیر ملکی ماہر خصوصی کے تقرر کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ہر پہلو سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ترکی قوم مغربی عادات و اطوار اختیار کرے، اس کی دنیاوی دلچسپیاں زیادہ اور وسیع تر ہو جائیں اور قدیم محدود زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

... ...

ترکی زبان کی ترتیب اور ترقی کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں ان کا ذکر کسی پچھلے پرچے میں آ چکا ہے۔ اسی سلسلے میں گذشتہ سال صدر جمہوریہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ نماز میں بھی قرآن کا ترکی ترجمہ رائج کیا جائے لیکن کوئی سرکاری حکم نہیں صادر ہوا تھا اور اسی وجہ سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اب اس سال ۵ فروری کو بروصہ کی جامع مسجد میں پہلی دفعہ ترکی زبان میں اذان دی گئی۔ بعض راسخ العقیدہ لوگوں کو یہ بات ناپسند ہوئی اور انھوں نے مؤذن پر حملہ کر دیا۔ چند سرکاری ملازموں

نے اسے بچانے کی کوشش کی تو لوگوں نے ان کی بھی خوب خبر لی۔ بالآخر پولیس نے اس ہنگامے کو فرو کیا اور ۶۰ آدمیوں کو جن میں ۳۰ علما تھے گرفتار کرلیا۔ ان ملزموں کے مقدمے کی سماعت غالباً ایک فوجی عدالت کرے گی۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ۱۹۳۱ء میں ۲۰ آدمیوں کو اس جرم میں پھانسی دی جاچکی ہے کہ انھوں نے ترکی ٹوپی کے امتناعی حکم کے خلاف علم بغاوت اُٹھایا تھا۔ اس موقع پر مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت پاشا تحقیقات کے لیے فوراً بروصہ پہنچے۔ وہاں سے واپس آکر ۲ فروری کو صدر جمہوریہ نے یہ حکم صادر کیا کہ اس تاریخ سے استامبول کی مساجد میں قرآن کا صرف ترکی ترجمہ پڑھا جائے گا اور اصل قرآن کا پڑھنا ممنوع قرار پائے گا۔ خیال ہے کہ یہ حکم جلد ہی ملک کے دوسرے حصوں میں بھی نافذ ہوگا اور اس طرح ترکی سے عربی زبان کا آخری اثر بھی دور ہونے لگے گا۔

... ...

ترکی کی معاشی حالت آج کل دنیا کے بیشتر ممالک سے اچھی ہے۔ کچھ عرصے پہلے یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ آمدنی کی کمی کی وجہ سے حکومت کو رفاہ عامہ کے بعض کام ملتوی کرنے پڑیں گے لیکن حکومت نے بجائے اس کے ایک عام اندرونی قرضے کے ذریعے ان کاموں کو جاری رکھا اور ہمت نہ ہاری۔ اس قرضے کا بیشتر حصہ ریلوں کی توسیع اور تانبے کی کانوں کے کھودنے میں صرف ہوگا۔ ان دونوں کاموں سے ترکی حکومت کو بہت نفع حاصل ہونے کی امید ہے۔ ترکی کی عام مرفہ الحالی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جہاں ۱۹۲۵ء میں تمام بنکوں میں پچاس لاکھ ترکی پاؤنڈ جمع تھے وہاں اس سال کے شروع میں چار کروڑ پاؤنڈ موجود تھے۔ مالی حالت کے بہتر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قدیم عثمانی قرضوں کی ادائیگی سے متعلق جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس میں ترکی حکومت کو کامیابی ہوئی اور اب قرضے کی مقدار بہت کم ہوگئی ہے۔ اگرچہ معاہدوں کی تصدیق ابھی نہیں ہوئی ہے لیکن یہ طے ہوگیا ہے کہ قرضہ بجائے ۱۰ کروڑ ۷ لاکھ ترکی پاؤنڈ طلائی کے اب صرف اسی لاکھ پاؤنڈ قرار پائے گا اور ۵۱ لاکھ کی جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی تھی اور جس میں ہر سال اضافہ ہوتا جاتا تھا اب بالمقطع ۷ لاکھ ۰۰ ہزار سالانہ رہ جائے گی۔ اس معاہدے کی وجہ سے معاشی ترقی کی راہ بالکل صاف ہوگئی اور اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

ایران | عرصے کی کشمکش کے بعد حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے درمیان بالآخر سمجھوتا ہو ہی گیا۔ آخر وقت میں جب بالکل نا امیدی ہو گئی تھی شاہ ایران نے خود اس معاملے میں مداخلت کی اور معاملے کو سلجھا دیا۔ اس معاہدے کی رو سے حکومت ایران کو فی ٹن چار شلنگ اور منافع کا ۲۰ فی صدی ملے گا۔ یہ رقم کسی صورت میں ۷½ لاکھ پاؤنڈ سالانہ سے کم نہ ہوگی۔ محاصل سے بالکل استثنا کے عوض کمپنی پہلے ۱۵ سال تک ۲½ لاکھ پاؤنڈ سالانہ اور دوسرے پندرہ سال تک ۳ لاکھ پاؤنڈ سالانہ ادا کرے گی۔ اس کے بعد کی ادائگی کے لئے پھر معاہدہ ہوگا۔ پچھلے مطالبوں کی بے باقی کے لئے کمپنی فوراً دس لاکھ پاؤنڈ ادا کرے گی۔ یہ معاہدہ ساٹھ سال تک کے لئے کیا گیا ہے اور پہلا معاہدہ جو ۱۹۶۱ء میں ختم ہوتا منسوخ ہو گیا۔ اس جدید معاہدے کی رو سے کمپنی کو چاہئے کہ ۱۹۳۸ء تک اس تمام علاقے میں سے جو اس وقت اس کے پاس ہے ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ اپنے لئے منتخب کرلے۔ اس کے بعد صرف اتنی ہی زمین سے اسے تیل نکالنے کی اجازت ہوگی۔

اس معاہدے کی وجہ سے امید ہے کہ ایرانی حکومت کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگا اور آئے دن کے جھگڑوں سے بھی نجات مل جائے گی۔

شذرات

قارئین جامعہ یہ خبر سن کر خوش ہوں گے کہ جامعہ ملیہ کے وفد نے جو صوبہ متحدہ کے دورے کے لئے نکلا ہے اب تک اچھی خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ دیرہ دون، سہارنپور، بجنور کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں ضلعوں کے صدر مقامات میں اور بعض مضافات میں حلقۂ ہمدردان جامعہ قائم ہوگیا ہے اور مجموعی طور پر تقریباً ایک ہزار سالانہ چندے کے وعدے ہوگئے ہیں۔ اب وفد بریلی اور آس پاس کے اضلاع میں گیا ہوا ہے اور امید ہے کہ آخر جولائی تک اپنے پروگرام کے مطابق سارے صوبے کا دورہ ختم کرے گا۔ جامعہ ملیہ کے سالانہ مصارف کے لئے جس رقم کی اپیل جناب شیخ الجامعہ نے کی ہے اس کا قریب قریب ایک ربع شہر دہلی اور قریب کے مقامات سے جمع ہونے لگا ہے اور اہل دہلی کی فیاضی اور علم دوستی سے قوی امید ہے کہ جو تھوڑی سی کمی اس میں ہے وہ بہت جلد پوری ہو جائے گی۔ ہمیں امید ہے ایک ربع صوبہ متحدہ سے، ایک ربع پنجاب سے، اور اسی قدر بقیہ ہندوستان سے وصول ہونے لگے گا۔ معمولی مصارف کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی عمارت کے لئے چندہ شروع کر دیا جائے گا اور اس کا بار اپنے غریب بھائیوں پر نہیں بلکہ صاحبان ثروت پر ڈالا جائے گا۔ جیسی توجہ ملت اسلامی نے اپنی اس تعلیم گاہ کی طرف گذشتہ سال سے شروع کی ہے اگر یہ قائم رہی تو کچھ عجب نہیں کہ اس سال اکتوبر سے تعمیر کی طیاری ہونے لگے اور سنہ ۳۴ء کے وسط سے تعمیر شروع ہو جائے۔ زندہ قوموں کی ایک علامت یہ سمجھی جاتی ہے کہ سختی کے زمانے میں وہ اپنے بچوں کی تعلیم سے غافل ہونے کے بجائے اس میں پہلے سے زیادہ اہتمام کرنے لگتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اس قیامت کی کساد بازاری اور معاشی پستی کے دور میں جامعہ ملیہ کی مدد کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں وہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے فضل سے ہم میں ابھی تھوڑی بہت زندگی باقی ہے اور زمانہ موافق ہو تو ہم ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

... ...

جناب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ابتدائے جون میں بھوپال ہوتے ہوئے حیدر آباد تشریف لے گئے تاکہ ان مقامات پر حلقۂ ہمدردان جامعہ کی توسیع اور استحکام کا انتظام فرمائیں۔ جامعہ کو ان دونوں ریاستوں سے جو مقررہ امداد ملتی ہے اس کے متعلق بھی بعض معاملات تصفیہ طلب ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب کی درخواست پر ہمارے قدیم سرپرست جناب خواجہ عبدالمجید صاحب جن کے ہاتھوں سے اس تعلیم گاہ کی بنیاد مضبوط ہوئی اور جنھوں نے ہر نازک موقع پر اس کی دستگیری کی ہے ان کے ہمراہ تشریف لے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی توجہ سے جامعہ کے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگی۔

آج کل عالم اسلامی میں چینی ترکستان کی شورش یا انقلاب کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے اور تمام مسلمانوں کو اس سے بے حد دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ عام خیال یہی ہے کہ اس خطّے کے مسلمانوں نے چین سے قطع تعلق کرکے اپنی علیٰحدہ ریاست قائم کرلی ہے۔ علامہ اقبال اسے اپنی پیش گوئی کا پورا ہونا سمجھتے ہیں جو انھوں نے برسوں پہلے کی تھی "از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد + آشوب ہلاکوئے ہنگامہ چنگیزے"۔

ہم اس پرچے میں "دنیا کی رفتار" کے حصے میں بدرالدین چینی کا جو کئی سال جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اب لکھنؤ میں اسلامیات کی تکمیل کر رہے ہیں، ایک مضمون اس مسئلے کے متعلق شائع کر رہے ہیں۔ یہ چین کے رسالوں سے ماخوذ ہے اور اس میں بدرالدین صاحب کی ذاتی معلومات بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ جو واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں وہ ہر طرح سے قابل اعتبار ہیں۔ البتہ رائے کے اظہار میں ممکن ہے کہ لکھنے والے کے قوم پرستانہ نقطۂ نظر کا اثر پڑا ہو۔ بہر حال جو خبریں یورپ کے ذریعے سے آتی ہیں اور جو رائے ہم لوگ اس کی بنا پر قائم کرتے ہیں اس کا قابل وثوق ہونا اور بھی مشتبہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بدرالدین صاحب اس مسئلے کے متعلق مزید معلومات حاصل کرکے ایک اور مدلل مضمون لکھیں گے جس سے عالم اسلامی کے اس معرکۃ الآرا واقعے پر پوری روشنی پڑے۔

خوش خط نستعلیق ٹائپ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء

اُردو زبان اور اُردو کی خوشنما و خوبصورت تحریر سے جو لوگ محبت رکھتے ہیں اور اس کے دل دادہ ہیں وہ اس خیال سے رنجیدہ اور غمگین تھے کہ اردو کی کتابیں چھاپنے کے لئے **نستعلیق ٹائپ** موجود نہیں ہے۔
اُردو خواں پبلک کے شکریہ کے لئے مسٹر ایس ایچ قریشی مستحق ہیں، کیونکہ انھوں نے ایک نستعلیق ٹائپ ایجاد کیا ہے اور اس ٹائپ کے کثرت سے استعمال میں لانے کے لئے ایک قابل عمل صورت بھی ترتیب دے دی ہے، کاش کوئی باہمت تاجر اس ایجاد کے لائق اور قابل موجد کی امداد کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اس ٹائپ کو فروختگی کے لئے مہیا کرنا ممکن کر دے تو یہ اردو زبان کیلئے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔

دستخط

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (شیخ الجامعہ)

دہرادون، بمبئی

۱۹ جون ۱۹۳۳ء

میں نے مجی قریشی صاحب کے ایجاد کردہ نستعلیق ٹائپ کے مختلف ابتدائی نمونوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے میرے خیال میں اگر یہ ایجاد مکمل ہو جائے تو اردو صحافت و طباعت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیگی اور اردو زبان کو مغربی زبانوں کے دوش بدوش ترقی کا موقع دیگی، اسلئے تمام محبان اور خادمان زبان اُردو کا فرض ہے کہ قریشی صاحب کو اپنی ایجاد کی تکمیل میں ہر ممکن عنایت دیں اور زبان اردو کی اہم خدمت انجام دیں، میں ہندوستانی مسلمانوں سے بالخصوص اور دیگر ہموطنوں سے بالعموم بزور اپیل کرتا ہوں کہ قریشی صاحب کا ہاتھ بٹاکر اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں ممد و معاون ہوں۔

دستخط (مولوی) محمد علی (قصوری) ایم اے کینٹب)

پراسپکٹس مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیے:۔

خوشخط نستعلیق ٹائپ فاؤنڈری لمیٹڈ دہلی